خواتین ڈائجسٹ

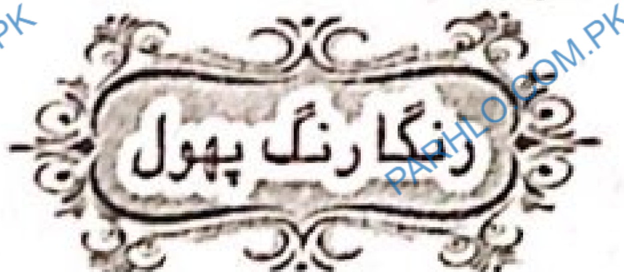
ستمبر 2022

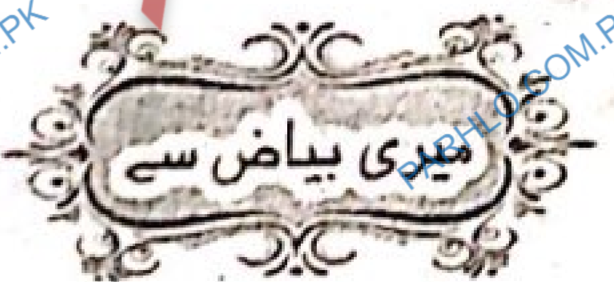

مرحبا
It's All Natural
مرحبا مربہ جات
قدرت کی سوغات
مربہ ہرڑ
مربہ آملہ
گلقند















واٹس اپ
03172266944

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91 بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وطن عزیز میں ایک بہت بڑا انسانی المیہ جنم لے رہا ہے۔ طوفانی بارشوں اور سیلاب نے ملک کے ایک بڑے حصے میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔

پہاڑوں میں بارشوں سے جو سیلابی ریلے نکلے ہیں، ان کے راستے پر آبادیاں ہیں، کچے پکے گھر ہیں۔ ہوٹل اور پل ہیں۔ انسان نے قدرت کے تخلیق کردہ نظام میں مداخلت کی، جس کے نتائج بھگت رہے ہیں، بارش جو زندگی ہے، قدرت کی عطاکردہ سب سے بڑی نعمت ہے، رحمت ہے۔ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں نے اسے زحمت بنا دیا ہے۔

سیلاب سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے۔ لاکھوں لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ لوگ مر رہے ہیں۔ ان کے گھر سیلاب بہا کر لے گیا ہے۔ ان کی تیار فصلیں پانی میں ڈوب گئی ہیں۔ ان کی ساری جمع پونجی اور سال بھر کے لیے ذخیرہ کیے دانے پانی میں بہہ گئے ہیں۔

وہ بے گھر لوگ جن کے قدموں تلے بھی پانی ہے اور سر پر بھی پانی برس رہا ہے۔ ان کے پیٹ بھی خالی ہیں اور ہاتھوں میں بھی کچھ نہیں ہے۔ وہ منتظر ہیں کہ آزمائش کی اس گھڑی میں کوئی ان کی مدد کو آئے۔

یہ آزمائش جو ان پر آئی ہے، یہ ہم سب کی بھی آزمائش ہے۔ آپ سب سے درخواست ہے جس نوعیت کی بھی ممکن ہو سکے، ان بے خانماں، بے گھر لوگوں کی مدد کریں جو اپنے پیاروں کو کھونے کے غم میں گھرے — زخموں سے چور ہیں۔

ان کی اولین ضرورت چھت اور خوراک ہے، انہیں خیمے، ترپال، بھنے ہوئے چنے، کھجوریں، چاول اور چینی دے سکتے ہیں۔ جو بھی آپ کر سکیں۔ چھوٹی سی مدد کو بھی حقیر نہ جانیں۔ ممکن ہے آپ کی چھوٹی سی مدد کسی کی زندگی بن جائے۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول — دانہ پانی،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول — مالا،
- نعیمہ ناز کا مکمل ناول — منزل مراد،
- شازیہ جمال ناز کا ناول — ابھی کچھ پھول کھلتے ہیں،
- بشریٰ احمد کا ناولٹ — متاعِ زیست کچھ خواب،
- سنبل عمیر، ندرتا سکندر، شازیہ الطاف ہاشمی، صائمہ نور، آسیہ رئیس خان، حمیرا عروش اور عزالہ عزیز کے افسانے
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ نایاب جیلانی سے ملاقات،
- باتیں شگفتہ یاسمین سے،
- کرن کرن روشنی — احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور ... [illegible]

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

پانچ چیزیں

حضرت ابوبرزہ نضلہ بن عبید اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”قیامت والے دن کسی بندے کے قدم نہیں ہٹیں گے۔ (یعنی بارگاہ الٰہی سے جانے کی اجازت نہیں ہوگی) یہاں تک کہ اس سے (پانچ چیزوں کی بابت) پوچھ نہ لیا جائے۔

اس کی عمر کے متعلق کہ اس نے اسے کن کاموں میں ختم کیا۔

اس کے علم کے متعلق کہ اسے اس نے کن چیزوں میں خرچ کیا۔

اس کے مال کے بارے میں کہ اس نے اسے کہاں سے کمایا۔

اور کہاں خرچ کیا۔

اور اس کے جسم کے بارے میں کہ کن چیزوں میں اسے بوسیدہ کیا (کھپایا)۔“

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں سب سے پہلے حیات مستعار کی قدروقیمت اور اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔ اسے اللہ کی نافرمانی میں صرف نہ کیا جائے کیونکہ اس کا حساب دینا ہوگا۔

2۔ علم کے متعلق یہ سوال ہوگا کہ جو کچھ تم جانتے تھے، کیا اس پر عمل کیا؟ اس سے اس امر کی ترغیب ملتی ہے کہ انسان دین و شریعت کا علم حاصل کرے کہ وہی اس کے لیے نافع ہے اور پھر اس کے مطابق عمل کرے۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو اسے اس کا جواب سوچ لینا چاہیے کہ وہ روز قیامت بارگاہ الٰہی میں کس طرح سرخ رو ہوگا۔ مال کے بارے میں سوال سے واضح ہے کہ انسان صرف حلال اور جائز طریقے ہی سے دولت کمائے اور

جائز جگہوں ہی پر اسے صرف بھی کرے۔ اگر اس نے دولت کمانے کے لیے ناجائز طریقہ اختیار کیا یا اللہ کی نافرمانی میں اسے خرچ کیا تو ان دونوں صورتوں میں وہ عنداللہ مجرم ہوگا اور اس کی اس کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ اپنے جسم کو محرمات سے بچائے اور اسے اللہ کے حکموں کا پابند کرے، اس میں کوتاہی کرنے کی صورت میں جب اس سے باز پرس ہوگی تو پھر مواخذہ الٰہی سے بچنا مشکل ہوگا۔ غرض اس میں عنداللہ مسئولیت کا احساس دلایا گیا ہے تاکہ انسان دنیا میں اس کا خیال رکھے اور قیامت کی شرمندگی سے وہ بچ جائے۔ کاش انسان اس باز پُرس کے تصور کو ہر وقت اپنے سامنے رکھے۔

خوش

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں کس طرح ہنسی خوشی رہ سکتا ہوں جب کہ صور (پھونکنے) والا صور کو منہ میں لیے ہوئے ہے اور اللہ کی اجازت پر کان لگائے ہوئے ہے کہ کب اسے (صور) پھونکنے کا حکم دیا جائے اور وہ صور پھونکے۔"

تو یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر گویا گراں گزری، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا۔

"(گھبراؤ نہیں بلکہ) کہو حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔"

"ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد ومسائل:۔

1۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خوف الٰہی اور فکر آخرت کا بیان ہے جس میں ہمارے لیے سخت عبرت وتنبیہ ہے کہ وہ پاک، محفوظ یا مغفور ہونے کے باوجود کس طرح اللہ سے اور میدان محشر کی ہولنا کیوں کے تصور سے لرزاں ــــ رہتے تھے اور آج ہم لوگ ہیں کہ سر سے پاؤں تک گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، رات دن اللہ کی نافرمانی کرتے اور احکام وفرائض الٰہی سے غفلت اور اعراض ہمارا شعار ہے، اس کے باوجود ہمارے دلوں میں اللہ کا خوف ہے نہ آخرت کی فکر۔

2۔ خوف اور فکر کے وقت اللہ سے مدد طلب کی جائے اور حسنا اللہ ونعم الوکیل کا ورد کیا جائے یہ بڑا اچھا اور پرتاثیر ورد ہے۔ یہ کسی پریشانی اور صدمے کے وقت بھی پڑھ سکتے ہیں۔

3۔ عمل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا چاہیے۔

قیامت کا دن

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"قیامت والے دن لوگ، ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون (بغیر ختنے کے) اکٹھے کیے جائیں گے۔"

(حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! (وہاں تو) مرد اور عورتیں اکٹھے ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "عائشہ! معاملہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگا۔" (یعنی حساب کی ہولنا کی اور شدت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دے گی۔)

دوسری روایت میں ہے "معاملہ اس سے کہیں زیادہ اہم ہوگا کہ ان کا بعض بعض کو دیکھے۔" (بخاری ومسلم)

فائدہ:۔

1۔ اس میں بھی میدان محشر کی ہولنا کیوں کا بیان ہے۔ ایک مومن کو آخرت کی تیاری اور روز محشر بارگاہ الٰہی میں پیش ہو کر جواب دہی کے احساس و تصور سے غافل نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس دن کی ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے ایمان وتقویٰ کی زندگی گزارنی چاہیے۔ جو لوگ ایسا نہیں کریں گے اور آخرت کی فکر اور اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو کر زندگی گزاریں گے، انہیں اللہ کی نافرمانی کرنے اور حدود الٰہی کو توڑنے میں کوئی باک نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا نتیجہ آخرت کا عذاب اور ذلت ورسوائی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے امید ورجا کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے پیغمبر! فرمادیں۔ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی (اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کر کے) اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا، وہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔" (الزمر۔53)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ہم ناشکرے اور نافرمان ہی کو بدلہ (سزا) دیتے ہیں۔" (سبا۔17)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بے شک وحی کی گئی ہماری طرف کہ عذاب کے مستحق وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔" (طٰہٰ۔48)

اور فرمایا۔ "اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔"

فائدہ آیات:

1۔ ان آیات میں اللہ کے نافرمانوں کو ڈرایا بھی گیا ہے اور انہیں امید کی کرن بھی دکھائی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ساری زندگی نافرمانی میں ہی گزار دی اور آخر وقت تک انہیں ایمان اور توبہ کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تو ان کے لیے تو جہنم کا ابدی عذاب ہے، تاہم جن لوگوں میں توبہ اور ندامت کا احساس پیدا ہو جائے، چاہے وہ کتنے ہی گناہ گار ہوں، انہیں ایمان وتوبہ کا راستہ اختیار کر کے کفر و شرک اور معاصی سے باز آجانا چاہیے۔ ایسے لوگ یہ نہ سوچیں کہ عمر تو عشق بتاں میں گزر گئی، اب آخر میں مسلمان ہونے کا کیا فائدہ! نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان اور غفور ہے، وہ تمام گناہ بخشنے پر قادر ہے۔ آخری وقت میں بھی سچے دل سے مسلمان یا تائب ہو جائیں گے اور ایمان وعمل کے تقاضوں کو بروئے کار لائیں گے تو اللہ کی رحمت سے ناامید ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

گویا یہ آیت ان کے لیے امید کی کرن ہے جن کی ساری زندگی کفر وشرک یا معصیت کے اندھیروں میں گزر گئی۔ اب اگر وہ مسلمان یا گناہوں سے تائب ہونا چاہیں تو شیطان ان کے دلوں میں وسوسہ ڈال دے کہ تمہارے تو گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ اب وہ معاف ہی نہیں ہو سکتے، اس لیے مسلمان ہونے کا یا توبہ کرنے کا کیا فائدہ؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے، تم اللہ کے در پر آؤ تو سہی اس کی رحمت کا دروازہ تمہیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے ہر وقت کھلا ہے۔"

اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے جو عام لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ ورسول کے ماننے کے دعوؤں کے ساتھ اس کی حدوں اور ضابطوں کو پامال کرتے رہو اور دیدہ دلیری کے ساتھ اس کی نافرمانی کا ارتکاب کرتے رہو اور وعظ ونصیحت کرنے اور خوف الٰہی یاد دلانے پر پوری ڈھٹائی سے کہہ دو، کوئی فکر والی بات نہیں، اللہ تو بہت مہربان اور بڑا بخشنے والا ہے۔ اللہ کے خوف اور اس کے عذاب سے یہ بے نیازی نہایت خطرناک ہے، ایسے خوش گمانوں کے لیے اس کا عذاب بھی دردناک ہے۔

اللہ کی رحمت کی امید رکھنا بلاشبہ ضروری اور ایمان کا حصہ ہے۔ رحمت الٰہی سے مایوسی یقیناً کفر و ضلالت ہے لیکن امید کے لیے کوئی بنیاد بھی تو ہونی چاہیے۔

یتیم اور عورت کا خیال

حضرت ابوشریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! میں لوگوں کو دو ضعیفوں کے حق سے بہت ڈراتا ہوں (کہ ان میں کوتاہی مت کرنا) ایک یتیم اور دوسرے عورت۔" (یہ حدیث حسن ہے، اسے امام نسائی نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ:

1۔ انسانی معاشرے میں کمزور طبقات کے ساتھ عام طور پر ظلم روا رکھا جاتا ہے، بالخصوص عورتیں اور یتیم اس کا خاص نشانہ بنتے ہیں۔ ان کو جائیدادوں میں ان کے شرعی حق سے محروم رکھا جاتا ہے، بلکہ ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیا جاتا ہے اور ان سے ہر طرح کی بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لیے سخت وعید بیان فرما کر مسلمانوں کو ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمان اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور مسلمان معاشروں میں بھی یہ مذکورہ کمزور طبقات ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اس بارے میں اسلام سے مختلف ہے۔ مسلمانوں کا طرز عمل، اسلام کی تعلیمات تو واضح ہیں۔ اس کا الزام، ان کے مذہب پر عائد نہیں کیا جاسکتا۔ کاش! مسلمان اس بات کو سمجھیں کہ ان کے غلط طرز عمل کی وجہ سے اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے اور یوں وہ دُگنے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایک حق تلفی اور ظلم اور دوسرا دنیا کی نظروں میں اسلام کی تذلیل اور اس کا استخفاف۔ گویا وہ اسلام کی تبلیغ کے بجائے اسلام کی طرف لوگوں کے آنے میں رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔

کمزور کی وجہ سے کامیابی

حضرت مصعب بن سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد) حضرت سعد کو یہ خیال ہوا کہ انہیں اپنے سے کم تر لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ تو ان ہی کمزوروں کی وجہ سے مدد کیے اور رزق دیے جاتے ہو۔ (پھر ان سے برتر ہونے کے زعم کا کیا جواز ہے)" (صحیح بخاری)

فائدہ: اس میں بہرہ ور طبقات کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اپنے سے کم تر اور بے وسیلہ لوگوں کو حقیر اور اپنے کو ان سے بدتر نہ سمجھیں بلکہ ان کا احترام اور ان سے تعاون کریں۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ ان ہی کی وجہ سے تمہیں بھی روزی اور دشمن پر غلبہ عطا فرما رہا ہو۔

اللہ کی تلاش

حضرت ابودرداء عویمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"مجھے تم کمزوروں میں تلاش کرو۔ یقیناً تمہاری، اپنے ان ضعیف لوگوں کی وجہ ہی سے مدد کی جاتی اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔" (اسے ابوداؤد نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کمزوروں اور غریبوں کے دل زخارف دنیا (دنیا کی خوب صورتی اور جاذبیت) سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں اخلاص اور انابت الی اللہ کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دعائیں بھی بارہ الٰہی میں مقبول ہوتی ہیں۔

اس کو سنن نسائی کی ایک دوسری حدیث میں زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد فرماتا ہے اس امت کے کمزور لوگوں کی دعا، نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔"

عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت

کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور تم ان عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے گزر بسر کرو۔" (النساء۔19)

اور فرمایا: "اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان برابری کا معاملہ نہیں کرسکو گے اگرچہ تم اس کی خواہش بھی رکھو، لہٰذا تم کسی ایک کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو لٹکتی چھوڑ دو اور اگر اصلاح کا رویہ اختیار کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔" (النساء۔129)

فائدہ آیات: مطلب یہ ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والا تمام بیویوں کے درمیان، خواہش کے باوجود من کل الوجوہ (ہر پہلو سے) برابری کا اہتمام کرنے پر قادر نہیں ہے، اس لیے کہ اگر ظاہری طور پر وہ باری باری ہر بیوی کے ساتھ ایک ایک رات گزارے، تب بھی وہ پیار و محبت کے معاملے میں یکسانیت برقرار نہیں رکھ سکتا کیونکہ اس کا تعلق دل سے ہے۔ جس پر انسان کا اختیار ہی نہیں۔ یقیناً کسی ایک کے ساتھ اسے دلی محبت کم اور دوسری کے ساتھ زیادہ ہوگی، لیکن اس دلی محبت کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جن معاملات میں تم یکسانیت اور انصاف کر سکتے ہو، ان میں بھی اس کا اہتمام نہ کرو اور بعض بیویوں کو درمیان میں چھوڑ دو۔ ان کی ضروریات زندگی کا خیال رکھو، نہ ان کی خواہشات کی تسکین کا۔ وہ شادی شدہ معلوم ہوں اور نہ مطلقہ۔ بلکہ اگر تم خلوص نیت سے اصلاح احوال میں کوشش اور اپنے اختیار کی حد تک تمام ظاہری معاملات میں برابری کا اہتمام کرتے رہو گے تو دلی میلان میں کمی بیشی کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تم اس میں بے بس ہو۔

عورتوں سے اچھا سلوک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو، اس لیے کہ عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ اس کا اوپر کا حصہ ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو اسے توڑ بیٹھے گا۔ اور اگر اسے چھوڑ دے گا تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، چنانچہ تم عورتوں کا خیال رکھا کرو۔" (بخاری و مسلم)

اور صحیحین ہی کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے:

"عورت پسلی کی طرح ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرے گا تو توڑ دے گا۔ اور اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو اس کی کجی کی حالت ہی میں فائدہ اٹھا۔"

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

"عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ یہ کسی طریقے سے بھی تیرے لیے سیدھی نہیں ہوگی۔ چنانچہ اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو اسی کجی کی حالت میں فائدہ اٹھا، اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو اسے توڑ ڈالے گا اور اس کا توڑ دینا اسے طلاق دینا ہے۔"

ہر دو صورتوں میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید ہے، اس لیے کہ عورت فطری طور پر مرد سے کمزور بھی ہے اور کج فطرت اور کم عقل بھی۔ بنا بریں زیادہ عقل اور زیادہ صبر و قوت رکھنے والے مرد کو تحمل اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے اس کے ساتھ حسن سلوک ہی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس وصیت اور تاکید میں خوش گوار گھریلو زندگی کا راز مضمر ہے۔

2۔ جو لوگ اس کے برعکس عورت کے ساتھ بے رحمانہ اور متشددانہ رویہ اختیار کرتے اور سوچتے ہیں کہ اس طرح وہ اسے سیدھا کرلیں گے، وہ خام خیالی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا گھر جہنم کدہ بنا رہتا ہے یا پھر (طلاق کی وجہ سے) اجڑ جاتا ہے، اور اگر بچے بھی ہوں تو ان کی زندگیاں الگ برباد ہو جاتی ہیں۔

☆☆

یتیم اور عورت کا خیال

حضرت ابوشریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! میں لوگوں کو دو ضعیفوں کے حق سے بہت ڈراتا ہوں (کہ ان میں کوتاہی مت کرنا) ایک یتیم اور دوسرے عورت۔" (یہ حدیث حسن ہے، اسے امام نسائی نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ:

1۔ انسانی معاشرے میں کمزور طبقات کے ساتھ عام طور پر ظلم روا رکھا جاتا ہے، بالخصوص عورتیں اور یتیم اس کا خاص نشانہ بنتے ہیں۔ ان کو جائیدادوں میں ان کے شرعی حق سے محروم رکھا جاتا ہے، بلکہ ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیا جاتا ہے اور ان سے ہر طرح کی بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لیے سخت وعید بیان فرما کر مسلمانوں کو ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمان اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور مسلمان معاشروں میں بھی یہ مذکورہ کمزور طبقات ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اس بارے میں اسلام سے مختلف ہے۔ مسلمانوں کا طرز عمل، اسلام کی تعلیمات تو واضح ہیں۔ اس کا الزام، ان کے مذہب پر عائد نہیں کیا جاسکتا۔ کاش! مسلمان اس بات کو سمجھیں کہ ان کے غلط طرز عمل کی وجہ سے اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے اور یوں وہ دگنے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایک حق تلفی اور ظلم اور دوسرا دنیا کی نظروں میں اسلام کی تذلیل اور اس کا استخفاف۔ گویا وہ اسلام کی تبلیغ کے بجائے اسلام کی طرف لوگوں کے آنے میں رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔

کمزور کی وجہ سے کامیابی

حضرت مصعب بن سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد) حضرت سعد کو یہ خیال ہوا کہ انہیں اپنے سے کم تر لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ تو ان ہی کمزوروں کی وجہ سے مدد کیے اور رزق دیے جاتے ہو۔ (پھر ان سے برتر ہونے کے زعم کا کیا جواز ہے)" (صحیح بخاری)

فائدہ: اس میں بہرہ ور طبقات کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اپنے سے کم تر اور بے وسیلہ لوگوں کو حقیر اور اپنے کو ان سے بدتر نہ سمجھیں بلکہ ان کا احترام اور ان سے تعاون کریں۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ ان ہی کی وجہ سے تمہیں بھی روزی اور دشمن پر غلبہ عطا فرما رہا ہو۔

اللہ کی تلاش

حضرت ابو درداء عویمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"مجھے تم کمزوروں میں تلاش کرو۔ یقیناً تمہاری، اپنے ان ضعیف لوگوں کی وجہ ہی سے مدد کی جاتی اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔" (اسے ابوداؤد نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کمزور اور غریبوں کے دل زخارف دنیا (دنیا کی خوب صورتی اور جاذبیت) سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں اخلاص اور انابت الی اللہ کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دعائیں بھی بارہ الٰہی میں مقبول ہوتی ہیں۔

اس کو سنن نسائی کی ایک دوسری حدیث میں زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد فرماتا ہے اس امت کے کمزور لوگوں کی دعا، نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔"

عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت

کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور تم ان عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے گزر بسر کرو۔" (النساء۔19)

اور فرمایا: "اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان برابری کا معاملہ نہیں کر سکو گے اگرچہ تم اس کی خواہش بھی رکھو، لہٰذا تم کسی ایک کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو لٹکتی چھوڑ دو اور اگر اصلاح کا رویہ اختیار کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔" (النساء۔129)

فائدہ آیات: مطلب یہ ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والا تمام بیویوں کے درمیان، خواہش کے باوجود من کل الوجوہ (ہر پہلو سے) برابری کا اہتمام کرنے پر قادر ہی نہیں ہے، اس لیے کہ اگر ظاہری طور پر وہ باری باری ہر بیوی کے ساتھ ایک ایک رات گزارے، تب بھی وہ پیار و محبت کے معاملے میں یکسانیت برقرار نہیں رکھ سکتا کیونکہ اس کا تعلق دل سے ہے جس پر انسان کا اختیار ہی نہیں۔ یقیناً کسی ایک کے ساتھ اسے دلی محبت کم اور دوسری کے ساتھ زیادہ ہوگی، لیکن اس دلی محبت کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جن معاملات میں تم یکسانیت اور انصاف کر سکتے ہو ان میں بھی اس کا اہتمام نہ کرو اور بعض بیویوں کو درمیان میں چھوڑ دو۔ ان کی ضروریات زندگی کا خیال رکھو نہ ان کی خواہشات کی تسکین کا۔ وہ شادی شدہ معلوم ہوں اور نہ مطلقہ۔ بلکہ اگر تم خلوص نیت سے اصلاح احوال میں کوشش اور اپنے اختیار کی حد تک تمام ظاہری معاملات میں برابری کا اہتمام کرتے رہو گے تو دلی میلان میں کمی بیشی کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تم اس میں بے بس ہو۔

عورتوں سے اچھا سلوک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو، اس لیے کہ عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ اس کا اوپر کا حصہ ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو اسے توڑ بیٹھے گا۔ اور اگر اسے چھوڑے گا تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، چنانچہ تم عورتوں کا خیال رکھا کرو۔" (بخاری و مسلم)

اور صحیحین ہی کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے:

"عورت پسلی کی طرح ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرے گا تو توڑ دے گا۔ اور اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو اس کی کجی کی حالت ہی میں فائدہ اٹھا۔"

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

"عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ یہ کسی طریقے سے بھی تیرے لیے سیدھی نہیں ہوگی۔ چنانچہ اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو اسی کجی کی حالت میں فائدہ اٹھا، اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو اسے توڑ ڈالے گا اور اس کا توڑ دینا اسے طلاق دینا ہے۔"

ہر دو صورتوں میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید ہے، اس لیے کہ عورت فطری طور پر مرد سے کمزور بھی ہے اور کج فطرت اور کم عقل بھی۔ بنابریں زیادہ عقل اور زیادہ صبر و قوت رکھنے والے مرد کو تحمل اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے اس کے ساتھ حسن سلوک ہی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس وصیت اور تاکید میں خوش گوار گھریلو زندگی کا راز مضمر ہے۔

2۔ جو لوگ اس کے برعکس عورت کے ساتھ بے رحمانہ اور متشددانہ رویہ اختیار کرتے اور سوچتے ہیں کہ اس طرح وہ اسے سیدھا کرلیں گے، وہ خام خیالی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا گھر جہنم کدہ بنا رہتا ہے یا پھر (طلاق کی وجہ سے) اجڑ جاتا ہے، اور اگر بچے بھی ہوں تو ان کی زندگیاں الگ برباد ہو جاتی ہیں۔

☆☆

ایک سوال نامہ کا جواب

انشا جی

آج ہمیں ایک بڑا سا جہازی سائز کا کارڈ ڈاک میں ملا ہے۔ جس کے ایک طرف تو ہمارا پتا لکھا ہے مکرمی معظمی وغیرہ القابات کے ساتھ دوسری طرف کارڈ چھاپنے اور بھیجنے والے کا نام ہے۔

خدمت عوام پارٹی۔ (غیر سیاسی)

اس کے نیچے چند سوالات درج ہیں۔

۱۔ کیا آپ ادارے یا محکمے کا سامان اسٹیشنری وغیرہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے گھر تو نہیں لے جاتے؟

۲۔ کیا آپ اپنے دفتری اوقات کو خوش گپیوں یا دوستوں کی خاطر تواضع میں تو ضائع نہیں کرتے؟

۳۔ کیا آپ دفتر کا کام ختم ہو جانے سے پہلے کھسک تو نہیں جاتے؟

۴۔ کیا آپ اپنے دفتر کا کام جان بوجھ کر تاخیر سے تو نہیں کرتے؟

۵۔ کیا آپ کسی عزیز یا محترمہ کو اپنے سرکاری ٹیلی فون سے مفت کال کرنے کی اجازت تو نہیں دیتے؟

۶۔ کیا آپ اپنے دفتر میں کام کرنے والی خواتین کو اس نگاہ احترام سے دیکھتے ہیں جیسے اپنی خواتین کو؟

۷۔ کیا تنخواہ لیتے وقت آپ کا ضمیر تو کبھی ملامت نہیں کرتا؟

بعض لوگ منفی ذہنیت کے ہوتے ہیں ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ چنانچہ پہلے پانچ سوالات کی حد تک ہمارا جواب اثبات میں ہے۔ بے شک اپنے ادارے کی اسٹیشنری لے جاتے ہیں لیکن اس پر ذاتی استعمال کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ ایک تو اس لیے کہ زیادہ تر بچوں کے کام آتی ہے۔ یا اس پر دھوبی کا حساب لکھتے ہیں۔ سو دھوبی کی ذات اور ہماری اپنی ذات میں فرق ہے۔ اگر اس اسٹیشنری سے خطوط لکھتے بھی ہیں تو ہر چند کہ خود لکھتے ہیں لیکن وہ جاتے تو دوسروں کے نام ہیں۔ دوسرے لوگ ہماری ذات کی تعریف میں کیسے آ سکتے ہیں۔

دوسرے سوال میں لفظ ضائع کے استعمال پر ہمیں اعتراض ہے۔ بلکہ ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ خوش گپیوں اور دوستوں، کے لطف صحبت سے دماغ تازہ ہوتا ہے اور اگلے روز کام کرنے کے لیے آدمی تازہ دم اور مستعد آتا ہے۔ اگر اگلے روز بھی وہ احباب آ جاتے ہیں تو اس سے اگلے روز سہی

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

تیسرے سوال کا جواب تو اثبات ہی میں ہے۔ لیکن کھسکنے کا لفظ یہاں بے محل ہے ایک سینما میں کوئی صاحب فلم دیکھ رہے تھے، وہ بھی کوئی تعمیری قسم کی۔ چنانچہ خراٹے لینے لگے۔ پاس والے نے خفا ہو کر ان کو جگایا اور ملامت کی کہ بھلے مانس خراٹے لے کر دوسروں کی نیند میں کیوں خلل ڈالتا ہے۔ چپکے سے نکل جانے میں بھی کچھ اسی قسم کی مصلحت ہے۔ کوئی دیکھ لے اور پوچھ لے اور باز پرس کرنے لگے تو خود ہی سوچیے اس میں کتنا وقت ضائع ہوگا اور وہ سرکاری وقت ہی ہوگا۔

چوتھے سوال کا جواب بھی ہاں ہے اور حکمت اس میں یہ ہے کہ اگر جھٹ پٹ کام کر دیا جائے تو پھر دفتر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاخیر میں کئی فائدے ہیں ایک آدمی کا کام کرنے کے لیے پانچ آدمی رکھے جاتے ہیں۔ ملک میں بے روزگاری کم ہوتی ہے۔ تاخیر کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کمیشن بیٹھتا ہے۔ اس میں نیا عملہ و ملہ بھرتی ہوتا ہے، اس سے بے روزگاری مزید ختم ہو جاتی ہے۔ پانچویں سوال کے جواب میں ہم نہیں گے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب کسی محترمہ کو ہم خود مفت کال کرتے ہیں، اگر وہ خود آ کر مفت کال کر لے تو کیا مضائقہ ہے۔

اب رہا سوال نمبر ۶۔ دفتر میں کام کرنے والی عورتیں اگر معمولی صورت کی یا حسین ہیں تو اخلاق کے تقاضے سامنے آ جاتے ہیں کہ ان کو ماں بہنیں بیٹیاں سمجھا جائے ویسے آج کل گھر گھاٹ یعنی گھر اور دفتر میں چنداں فرق نہیں رہا۔

مغرب میں تو عام بات ہے کہ اگر کوئی سیکریٹری خوب صورت ہے تو مستقبل قریب میں اپنے افسر کی گھر والی بن جاتی ہے اور گھر اور دفتر کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ ساتویں سوال کا جواب ہے کہ جی نہیں۔ ملامت نہیں کرتا۔ کیا مجال ہے کہ کرے۔ البتہ تنخواہ نہ لیں تو ضرور ملامت کرتا ہے۔

یہ سوالات تو ضمنی ہیں کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز خدمت عوام پارٹی ہے۔ بلکہ اس کا غیر سیاسی ہونا ہے۔

ویسے ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

ہم نے بہت سی پارٹیوں اور جماعتوں اور تحریکوں کو غیر سیاسی سے شروع ہو کر سیاست، کا پونچا پکڑتے دیکھا ہے۔ خود اس سوال نامے میں سیاست کے جراثیم بہت ہیں۔ کل انہی لوگوں کے پاؤں جم گئے تو جھنڈے لے کر نکل آئیں گے کہ دفتروں میں کاہلی اور بے ایمانی اور عدم کارکردگی دور کرنے کے لیے ہمیں اپنی صفوں کو منظم کرنا چاہیے اور عوام کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اگلے الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے۔ الیکشن کی بات آئے گی تو دائیں بازو اور بائیں بازو اور اسلام اور سوشلزم کا قضیہ ضرور اٹھے گا۔ ہم نے تو اس سوال نامے کے بے سوچے سمجھے جواب دے دیے۔

قارئین کو احتیاط چاہیے کیونکہ بات سے بات نکلتی ہے، اور غیر سیاسی سے سیاسی بنتی ہے۔ سرچشمہ باید گرفتن بہ میل...... ایک بزرگ بازار میں جا رہے تھے۔ ایک نوجوان نے انہیں سلام کیا۔ وہ چپ رہے اور جواب نہ دیا۔ بزرگ کے ساتھیوں نے کہا۔ ”بھلا آپ نے یہ غیر شرعی حرکت کیوں کی۔ سلام کا جواب دینا چاہیے تھا۔“ بولے تم نہیں سمجھے۔ میں سلام کا جواب دیتا تو وہ اپنا تعارف کراتا اور کہتا حاجی صاحب آئیے چائے خانے میں چل کر چائے پیجیے اس کی چائے پی کر اسے چائے پلانا میرا فرض ہو جاتا۔ اس کی میرے گھر میں آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ میری ایک جوان بیٹی ہے۔ میں ایسے اوباش نوجوان کو اپنی بیٹی کا رشتہ ہرگز نہیں دے سکتا۔“

☆☆

ساری کہانی خوبصورت ہے

امت الصبور

تسلسل خوب صورت ہے، روانی خوب صورت ہے
بدلتے وقت کی ساری کہانی خوب صورت ہے
نظام زندگی کے باب میں ہم کچھ نہیں کہتے
بس اتنا جانتے ہیں زندگانی خوب صورت ہے

کہتے ہیں مصنف انسانی سوچ کا مصور ہوتا ہے، ادیب کا کام زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرنا ہے۔
ایک تخلیق کار لفظوں کا جہاں آباد کر کے اپنے پڑھنے والوں کو دنیا برتنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔
ہر سانس لیتا وجود ایک کہانی کا کردار ہے بلکہ اپنی ذات میں بجائے خود ایک کہانی ہے۔
دنیا ایک عجوبہ ہے۔ ایک طلسم کدہ جسے ہر شخص اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے انداز سے زندگی کو برتتا ہے۔ اور اسی تضاد سے مختلف کہانیاں جنم لیتی ہیں۔
ایک لکھاری کا زاویہ نگاہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ عام انسان ایک زندگی گزارتا ہے لیکن ایک ادیب بیک وقت دو زندگیاں جیتا ہے۔ ایک اس کی سوچ و فکر کی دنیا ہوتی ہے جہاں وہ اپنے کرداروں کے ساتھ جیتا ہے۔
انہیں اپنی سوچ و فکر کے مطابق زندگی کی راہ دکھاتا ہے دکھوں سے جھوجھنا اور ان سے مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ حالات کو بدلنے کا درس دیتا ہے۔ اور مایوسی کے لمحوں میں امید کی کرنیں روشن کرتا ہے۔
ایک کہانی کے ذریعے جو سبق دیا جاتا ہے وہ براہ راست تبلیغ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ مقصد کے بغیر لکھی گئی کہانی دلچسپ ہو سکتی ہے لیکن کہانی مکمل اسی وقت ہو گی جب یہ با مقصد ہو اور معاشرے کے لیے سنوار کا باعث ہو۔
زندگی مختلف ادوار سے گزرتی ہے۔ بچپن کی معصومیت اور بے فکری، جوانی کی شوریدہ سری خود کو منوانے کا جنون اور امنگیں۔ پھر عملی زندگی کی ذمہ داریاں۔ وقت کے ساتھ زندگی بدلتی ہے، زندگی کے ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ڈھلنا ہی کامیابی ہے۔
اللہ کی مہربانی ہے خواتین ڈائجسٹ کے 50 سال کامیابی کے ساتھ مکمل ہو چکے ہیں۔ ہماری مصنفین ہمیشہ ہمارے ہم قدم رہی ہیں۔ یہ کامیابی درحقیقت ان کی کامیابی ہے۔ اس موقع پر ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اس طویل ساتھ میں ان کی اپنی ذاتی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ لکھنے کا آغاز کیا تو آپ کی زندگی کا کیا رنگ تھا، کیا معمولات تھے، ارد گرد کون سے رشتے تھے، آنکھوں میں کون سے خواب تھے۔ اب زندگی کا انداز کیا ہے؟
2۔ کچھ نئے رشتے، نئے لوگ جو آپ کی زندگی میں شامل ہوئے، تو اب زندگی کس انداز سے گزر رہی ہے؟
3۔ طویل قلمی سفر کے دوران کن مراحل سے گزریں، تعلیم، شادی، بچے ان ذمہ داریوں کے دوران تخلیقی سفر کس طرح جاری رہا، جبکہ تخلیق کا عمل یکسوئی چاہتا ہے؟

ثمینہ عظمت علی

(1) لکھنے کا عمل تو بچپن، یعنی اسکول کے زمانے سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن جہاں تک خواتین ڈائجسٹ میں لکھنے کی بات ہے تو اس کا آغاز، شادی کے بعد ہوا۔ خواتین اور شعاع کم عمری سے ہی پڑھ رہی تھی۔ لکھنے کا دل چاہتا تھا لیکن کبھی سنجیدگی سے اس طرف توجہ نہیں دی۔ بلکہ سچ پوچھیں تو سنجیدگی سے تو کبھی بھی نہیں لکھا۔

پہلا افسانہ یوں ہی مذاق مذاق میں لکھ لیا۔ علی یعنی میاں اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ کچھ لکھو، کیونکہ میں اکثر انہیں بتایا کرتی تھی کہ میں لکھتی رہی ہوں اور پڑھنے کا شوق تو ان کے سامنے تھا ہی کہ شادی کے بعد، زندگی شروع ہوئی تو نئے گھر میں سب سے پہلے میکے والی کتابوں کی الماری آئی۔

وہ جب بھی لکھنے کا کہتے تو میں کہتی کہ آپ کو بہت شوق ہے، اب میں آپ پر ہی لکھوں گی سو پہلا افسانہ ان ہی پر لکھا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ بس مذاق کی بات مذاق میں ختم ہو جائے گی لیکن ایک افسانہ شائع ہوتے ہی دماغ میں آئیڈیاز کی بھرمار اور احسن کی فون کال اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ایک وقت تھا کہ میں نے متواتر لکھا جو الحمدللہ بہت پسند بھی کیا گیا۔

(2) اس وقت بڑی فراغت تھی۔ میں جاب بھی نہیں کرتی تھی اور اللہ کی مرضی تھی کہ شادی کے بعد کئی سال اولاد کی ذمہ داری نہ تھی تو کافی لکھا۔ لکھنے کے لیے وقت بھی بہت ہوتا تھا اور آس پاس کی ستائش بھی۔

(3) بچے کی تمنا ہر عورت کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ لہٰذا جب بے اولادی کا دورانیہ طویل ہوا تو ڈپریشن ہونا بھی لازمی تھا۔ پھر ہمارا معاشرہ بھی کچھ ایسا ہے کہ اچھے خاصے متوکل انسان کے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سسرال والوں نے کبھی دکھ نہیں دیا اور میاں نے ہر وقت یہ احساس دلایا کہ ان کے لیے سب سے اہم میں ہوں۔ میں نے ایم اے کیا اور کمیشن کا فارم فل کیا۔ اب یہ خدا کی قدرت کہ علینہ اور لیکچرر شپ آگے پیچھے میری جھولی میں آن گریں اور میں جو سوچتی تھی کہ دن کیسے گزارا جائے اس قدر مصروف ہو گئی کہ سچ مچ سر کھجانے کی فرصت نہ رہی۔

اب بھی یہ ہی دو چیزیں ہیں، جس کی وجہ سے لکھنے کا عمل تعطل کا شکار رہتا ہے۔ اب یہ بھی اللہ کی منشاء کہ علینہ اکلوتی ہی رہی۔ میں ان عورتوں کو سلام پیش کرتی ہوں جو تین چار پانچ بچے بھی بخوبی پال لیتی ہیں لیکن یہ بھی ہے کہ اکلوتا بچہ زیادہ وقت اور توجہ مانگتا ہے۔ ایک سے زائد بہن بھائی آپس میں تو کھیل لیتے ہیں۔ بہرحال میرے پیارے قارئین میری پوری کوشش ہے کہ لکھنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کروں۔ میں ان سب قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے اب تک مجھے یاد رکھا ہوا ہے اور مجھے اکثر میسجز کرتے رہتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان کی خواہش ضرور پوری کروں گی۔

نیئر فہیم خان

خواتین ڈائجسٹ سے تعارف کب ہوا مجھے خود بھی نہیں معلوم......بس اتنا یاد ہے کہ جب ہوش سنبھالا تو اردگرد کتابیں دیکھیں۔ گھر میں امی پھپھو کے رسالے اور روزانہ اخبار آتا تھا اس اخبار کی ایک ایک سطر چاٹ لیتی...... بچوں کا صفحہ میری تشنگی نہ بجھا پاتا تھا۔ میری فطرت میں کھوج ہے۔ نئے موسم نئے نظارے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں اگر میں لڑکی نہ ہوتی تو ضرور ایک سیاح ہوتی۔ میں نے مستنصر حسین تارڑ۔ اور علی سفیان آفاقی کے سارے ہی سفر نامے پڑھ رکھے تھے۔ بہت کم عمری میں ہی۔ میری ذہنی عمر بلند تھی۔ اشتیاق احمد کے تمام ناول پڑھ لیے تھے۔ دنیا کے قیدی۔ یوگنڈا پر حملہ...... سارے ہی کئی بار پڑھے۔ شاید ہی کوئی ایسا ناول ہو جو میری دسترس سے دور رہا ہو۔ کتابوں سے محبت کو دیوانگی کا شرف بخشنے میں دو شخصیات کا عمل دخل ہے۔ میری امی اور میرے ماموں۔ حسن غزالی۔ جو علم دوست، کتابوں سے محبت کرنے والے اور مخلص انسان ہیں۔

بچپن ہی میں نیم والی گلی کے کونے پر بنے پیلی موٹی دیواروں والے گھر کے صحن پر بچھے تخت پر کتابیں

پڑھنے کا الگ ہی مزہ تھا۔ گلی میں لگا سایہ دار درخت صحن میں بھی اپنا سایہ اور ٹھنڈک فراہم کرتا تھا۔ اس گھر کے مکینوں نے ہمیشہ محبت اور شفقت فراہم کی۔ نانا جان کو دیوتا۔ ناول سے عشق تھا اور ہم فرہاد علی تیمور کے سارے قصے نانا کو ازبر کرا دیتے مگر پھر شروع سے اسی لگن سے سنتے کہ جیسے آج ہی کچھ نیا آیا ہو۔ گھر کے قریب جگنو لائبریری تھی۔ جہاں ہمارے میرپورخاص جاتے ہی کھاتہ کھل جایا کرتا تھا۔ میں اور بلقیس اشتیاق احمد کے ناول پڑھتے اور ہما اور شائستہ۔ چھن چھنگلو۔ انگلو بانگلو۔ گلابی پری کالا جن۔ پڑھتی تھیں مجھے تصوراتی دنیا کبھی پسند نہیں آئی۔ مجھے محمود فاروق فرزانہ پسند تھے جو زندگی کے مسائل عقل سے کام لے کر حل کرتے تھے، تب میری عمر دس سال تھی تقریباً...... ماموں سب کتابیں منگوا کر دیتے مگر ڈائجسٹ پر سخت پابندی تھی۔ اور یہ بات ہمیں سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وجہ ہماری عمر تھی۔ اب ماموں کو کیا پتا کہ ہم دس سال کی عمر میں بیس سال کی سوچ رکھتے ہیں۔ اب دل کو تجسس ہوا کہ آخر ان رسالوں میں ہے کیا...... ماموں کا کہنا تھا کہ لڑکیاں خیالی دنیا کے تصورات میں کھو جاتی ہیں اور زندگی کے حقائق کا سامنا نہیں کر پاتیں۔ تو پہلے سوچ کو مضبوط کریں پھر پڑھ لیں۔ اب ہمارے پاس اتنا صبر کہاں تھا۔

میرپورخاص میں امی کے بہت سے رشتے دار رہتے ہیں۔ ہم نے اپنی رشتے کی خالہ کے پاس رسالہ دیکھا جھٹ مانگ لیا۔ ان کو کیا اعتراض تھا...... وہاں پہلی کہانی پڑھی۔ کہانی تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ جو رشتہ خواتین سے 'جڑا' آج بھی قائم ہے تیس سال سے ہم ایک ساتھ ہیں۔

اور جب خواتین ڈائجسٹ میں اپنی تحریر دیکھی تو یوں لگا تھا کہ آسکر ایوارڈ جیت لیا یا نوبل پرائز ہاتھ آ گیا ہو۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں تینوں رسالے پڑھتی ہوں کرن، شعاع اور خواتین۔ رائٹر تو یاد رہ جاتی ہیں مگر کون سی کہانی کس رسالے میں پڑھی بھول جاتی ہوں...... یہ میرا عشق ہے میرا جنون ہے ہر وقت میں رسالے ہی پڑھتی ہوں اور ابھی سے سوچ لیا ہے کہ بیٹی جب میٹرک کر لے گی تو اس کو یہ تحریر ضرور پڑھاؤں گی۔ افسوس میری بیٹی کو انگلش اسٹوریز پسند ہیں آج کل مینڈیلڈا کی بک پڑھ رہی ہے میں منع نہیں کرتی۔ جو دل چاہے پڑھے مگر جب اردو کی لت لگے گی تو کچھ اچھا نہیں لگے گا۔ آخر میری بیٹی ہے۔ خواتین کا نشہ بھلا کہیں اور جانے دے گا...... عنیزہ سید کا ناولٹ تھا۔ آؤ سچ بولیں...... میں نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کی اسٹوری اتنی نازک اور گھمبیر تھی کہ سمجھ میں نہ آئے کیا کریں۔ مگر مجھے زندگی کا ایک بہت خوب صورت پہلو سمجھا گئی۔ کہ محبت ہونا آپ کے اختیار میں نہیں مگر محبت چھپا کر عزت سے جینا تو آپ کے اختیار میں ہے۔

میں میٹرک میں تھی۔ میری دوست کو کسی نے خط لکھا یہ 1992 کی بات ہے۔ اس دور میں فون میسج کا زمانہ نہیں تھا۔ گلی کے لڑکے نے خط بچے کے ہاتھ دیا...... وہ ڈر گئی مجھے اسکول میں بتایا۔ میں نے پڑھا وہی عامیانہ پن کی جھلک۔ وہی بے ربط اشعار۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ تم ڈرو مت اور اپنی بہن کو بتاؤ، وہ تمہاری امی سے بات کر لے گی کوئی حل نکلے گا۔ کسی اور سے پتا چلا تو برا ہوگا۔ اور جو لڑکے کسی لڑکی عزت کرتے ہیں تو راہ چلتے خط نہیں پکڑاتے۔ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے وہی کیا، نتیجہ کچھ دن اس کی والدہ خود اس کے ساتھ اسکول آنے جانے لگیں۔ لڑکے کو سمجھ میں آ گیا کہ ان تلوں میں تیل ـــــ نہیں۔ سو وہ پلٹ گیا......

یہ سوچ مجھے ڈائجسٹ سے ملی کہ ماں سے بہتر دوست کوئی نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی مسئلہ آیا پہلے امی کو بتایا۔ باہر کے لوگ کبھی بھی آپ کو آپ کے گھر والوں سے زیادہ نہیں چاہ سکتے چاہے کتنے دعوے کریں۔ آج یہ سوچ میری بیٹی کی ہے ماشاءاللہ بہت سمجھ دار بچی ہے۔ ہر بات مجھے بتاتی ہے۔ خواتین سالہا سال اپنے علم اور صاف ستھرے ادب کی رونق بکھیرتا رہے۔ آمین

باتیں شگفتہ یاسمین سے

شاہین رشید



1۔ ''اصلی نام؟''
''شگفتہ یاسمین۔''

2۔ ''پیار کا نام؟''
''عینی۔''

3۔ ''تاریخ پیدائش/سال؟''
''16 ستمبر 1987۔''

4۔ ''قد/ستارہ؟''
''5 فٹ 2 انچ/(سنبلہ)۔''

5۔ ''مادری زبان؟''
''اردو۔''

6۔ ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''3 بہن بھائی ہیں، ایک بہن، ایک بھائی اور میں، یعنی تیسرا نمبر ہے میرا۔''

7۔ ''شادی/بچے؟''
''جی شادی ہو چکی ہے/بچے نہیں ہیں۔''

8۔ ''تعلیم؟''
''ایم اے فیشن ڈیزائننگ، ایم بی اے مارکیٹنگ۔''

9۔ ''شوبز فیلڈ میں آمد/گھر والوں کا ری ایکشن؟''
''2003 میں میری ایک اسٹوڈنٹ انڈس ٹی وی میں کام کرتی تھی۔ اس نے مجھے فون کیا کہ ہمیں ایک فیشن کنسلٹنٹ چاہیے تاکہ وہ فیشن کے حوالے سے بات کر سکے۔ میں وہاں گئی اور شو میں بہ حیثیت مہمان شرکت کی۔ تو مجھے ہوسٹنگ کی آفر ہوئی۔

گھر والوں میں والدین نے تو کچھ نہیں کہا خصوصاً والد صاحب نے، البتہ بھائی اور امی نے اعتراض کیا مگر میں نے انہیں کنوینس کر لیا۔ یوں میں شوبز میں آ گئی۔ البتہ امی کی بات میں نے گرہ میں باندھ لی کہ ''عزت ہمیشہ برسوں سے بنتی ہے اور مٹنے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔'' بس اس کے بعد آگے سے آگے بڑھتی گئی۔''

10۔ ''بچپن میں کس سے ڈر لگتا تھا؟''
''اندھیرے سے۔''

11۔ ''پہلی کمائی کتنی تھی/کس کے ہاتھ میں رکھی؟''
''پہلی کمائی تین ہزار تھی۔ میٹرک کی چھٹیوں میں ایک اسکول میں ٹیچر لگ گئی۔ پہلی کمائی امی کے ہاتھ میں رکھی۔ امی میرے پیسے جمع کر کے اس کا میرے لیے گولڈ لے لیتی تھیں۔''

12۔ ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''بچپن میں پیار نہیں اٹریکشن ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے اس لیے ایسی غلطی کی ہی نہیں۔''

13۔ ''گھر کو جنت بنانے کے لیے کوئی سخت فیصلہ جو آپ نے کیا ہو؟''
''ویسے میں بہت کمپرومائزنگ ہوں۔ ہمیشہ قربانی دیتی ہوں۔ بہت سے سخت فیصلے کیے تاکہ گھر کا ماحول اچھا رہے۔ میری وجہ سے خراب نہ ہو۔''
14۔ ''کیا آپ مارننگ پرسن ہیں / صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''
''جی بالکل / چائے بہت ضروری ہے ورنہ صبح صبح نہیں لگتی۔''
15۔ ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''بھوک تو بچپن سے ہی شدید نہیں لگتی۔ بس جینے کے لیے کھاتی ہوں۔ البتہ غصے کی بہت تیز تھی۔ مگر وقت نے بہت کچھ سکھا دیا۔ اب غصہ کنٹرول کر لیتی ہوں۔''
16۔ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟''
''پاکستان کا کیا بنے گا اور اس کے ساتھ ہمارا کیا بنے گا۔ بس اللہ ہمارے ملک کی حفاظت کرے (آمین)''
17۔ ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''کسی بھی ملک کی نہیں۔''
18۔ ''آپ کی آج کل کی مصروفیات؟''
''آج کل فری لانس پروجیکٹ کر رہی ہوں ایف ایم اور کچھ Wele چینلز کے لیے پھر میرا اپنا یوٹیوب چینل چین لیس ٹی وی کے نام سے اس پر بہت محنت کر رہی ہوں۔''
19۔ ''میڈیا میں کیا اچھا اور کیا برا ہے؟''
''جس طرح ہر جگہ اچھے برے لوگ ہوتے ہیں اس طرح میڈیا میں بھی ہیں۔''
20۔ ''اسپورٹس سے لگاؤ/ پسندیدہ کھیل؟''
''لگاؤ ہے / فٹ بال پسند ہے۔''
21۔ ''کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟''
22۔ ''آواز تو اونچی نہیں ہوتی کیونکہ آواز ہے ہی چھوٹی ہاہاہا...... اونچا اس وقت بولتی ہوں جب کسی کی سمجھ میں بات نہ آ رہی ہو۔''
23۔ ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''
''اسپورٹس بائیک، اسپورٹس کار، اور فارم ہاؤس۔''
24۔ ''کس کی خاطر فیلڈ چھوڑ سکتی ہیں؟''
''شوہر اور گھر کی خاطر۔''
25۔ ''کون سا کام ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا اب کرنے لگی ہیں؟''
''جانوروں سے محبت۔''
26۔ ''تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟''
''بے کار بیٹھوں تو تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔''
27۔ ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گی؟''
''اچھا وقت۔''
28۔ ''گھر میں کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کرنے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟''
''میاں صاحب کی (شوہر)''
29۔ ''گھر میں آپ کے فیصلے پر مداخلت کون کرتا ہے؟''
''گھر میں زیادہ افراد نہیں ہیں اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کر کے فیصلہ لیتے ہیں۔''
30۔ ''بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟''
''نہیں۔ میں کیئرلیس ہوں۔''
31۔ ''فیملی میں کون فراخ دل ہے؟''
''ہم دونوں۔''
32۔ ''ادب سے آپ کا لگاؤ، کس کو زیادہ پڑھا؟''
''ادب تو زیادہ نہیں پڑھا۔ پوری کتاب تو کسی کی بھی نہیں پڑھی۔ بس احمد فراز کو پڑھا ہے۔''
33۔ ''کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟''



''لوگوں پر بھروسا کرنے کا۔''
34۔ ''کچن سے لگاؤ...... کبھی شیف بننے کا سوچا؟''
''کچن سے تو بچپن سے لگاؤ ہے اور میں ہوم شیف ہوں۔''
35۔ ''کبھی سوچا کہ اگر سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟''
''سوشل میڈیا نہ ہوتا تو قریب بیٹھے انسان سے بات ہوتی رہتی۔''
36۔ ''کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتیں؟''
''شوہر پر۔''
37۔ ''شکل بدلنے کا موقع ملے تو کس طرح نظر آنا چاہیں گی؟''
''اس بارے میں کچھ سوچا نہیں۔''
38۔ ''ایک نصیحت جو سب کو کرتی ہیں؟''
''کسی کو بھی کمزور مت سمجھو اور عزت دو گے تو عزت ملے گی۔''
39۔ ''ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے حکمران یا عوام؟''
''سو فیصد حکمران۔''
40۔ ''کبھی غربت میں وقت گزارا؟''
''نہیں...... اللہ کا شکر ہے ایسا نہیں ہوا۔''
41۔ ''طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون سے نفرت تھی؟''
''اکنامکس سے۔''
42۔ ''ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر یقین ہے؟''
''منحصر ہے، اگر تو ڈاکٹر کی فوری ضرورت ہے تو ڈاکٹر ورنہ ہومیو پیتھک۔''
43۔ ''کیا دل سے اترا ہوا شخص دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟''
''نہیں...... کیونکہ دل سے ہی نہیں وہ شخص نظروں سے بھی گر جاتا ہے۔''
44۔ ''اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتی ہیں؟''
''پہلے امی سے لیتی تھی۔ اب شوہر سے مشورہ لیتی ہوں۔''
45۔ ''موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟''
''نہیں۔''
46۔ ''گھر کا کون سا کام کرنا پسند ہے؟''
''گھر کو صاف رکھنا۔ خاص طور پر کچن کو۔''
47۔ ''غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے؟''
''میں غصے میں چپ ہو جاتی ہوں۔ بات ہی

"نہیں کرتی۔"

48۔ "آپ کا راز دار کون ہے؟"
"میں خود...... کوئی راز کی بات ہو تو کسی کو بتاتی ہی نہیں لیکن دوسری باتیں اپنے شوہر سے ضرور شیئر کرتی ہوں۔"

49۔ "فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟"
"میں سب سے فرینڈلی ہوں۔"

50۔ "کون سی تاریخیں یاد رکھتی ہیں؟"
"سالگرہ اور شادی کی سالگرہ۔"

51۔ "ایک کھانا جو ہر وقت کھا سکتی ہیں؟"
"دال چاول، دہی۔"

52۔ "کیا اپنے پروگرام بار بار دیکھتی ہیں؟"
"نہیں...... صرف ایک بار دیکھتی ہوں۔"

53۔ "ایک غلطی جس پر کبھی معافی نہیں مانگتی؟"
"اگر میں سچی ہوتی ہوں تو کبھی معافی نہیں مانگتی۔"

54۔ "پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟"
"یاد نہیں۔"

55۔ "بچپن میں کس وجہ سے مار پڑتی تھی؟"
"مجھے مار تو نہیں پڑی۔"

56۔ "تقریب میں جانے کے لیے کس کی مرضی سے تیار ہوتی ہیں؟"
"اپنی مرضی سے اور سیکنڈ آپشن اپنے میاں صاحب سے لیتی ہوں۔"

57۔ "کون سا گانا اکثر گنگناتی ہیں؟"
"عجیب داستان ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم۔"

58۔ "ایک پروگرام کی تیاری میں کتنا ٹائم یا دن لگتے ہیں؟"
"ایک دن بہت ہے۔"

59۔ "آپ کے کون سے پروگرام کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے؟"
"مارننگ شو کو۔"

60۔ "کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتی ہیں؟" "ہر نئے پروجیکٹ کو کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔"

61۔ "کن چیزوں پہ پیسا اڑا دیتی ہیں؟"
"موبائل پر۔"

62۔ "کس کی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی ہیں؟"
"کسی کی بھی نہیں۔"

63۔ "کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"
"نہیں جب تک دل نہ مانے مت کریں شادی۔"

64۔ "اپنا کل سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟" "جی گزرا وقت یاد آتا ہے کبھی خوشی کے ساتھ تو کبھی اداسی کے ساتھ۔"

65۔ "سگنل پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتی ہیں؟"
"لوگوں کی بے صبری کا۔"

66۔ "بچپن میں فلم ٹی وی کے کون سے فنکار پسند تھے؟"
"بابرہ شریف، شکیل صاحب، معین اختر صاحب اور بشریٰ انصاری صاحبہ۔"

67۔ "خواتین رائٹر میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟" "پڑھا ہے مگر اس حوالے سے نہیں کہ یہ بہت اچھی ہیں ان کو ضرور پڑھنا ہے۔"

68۔ "بچپن میں کون کون سے کھیل کھیلے؟"
"سائیکلنگ ریس، برف پانی، چھپن چھپائی، گھوڑا جمال کا اور کھو کھو۔"

69۔ "شاپنگ کے وقت سب سے پہلے کس کا خیال آتا ہے؟"
"امی کا۔"

70۔ "کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی ہیں؟"
"جب کوئی خواہش پوری ہو جائے تب۔"

71۔ "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنی؟" "نہیں نہیں کبھی ایسا دل بھی نہیں چاہا۔"

72۔ "اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتی ہیں؟"
"گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اور فوڈ پر۔"

73۔ "کس طرح کے کام کرنا مشکل لگتے ہیں؟" "جن میں دل نہ لگے۔"

74۔ "پسندیدہ یوٹیوب چینل؟"
"اسٹوری چینل۔"

75۔ "کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟"
"نہیں...... بالکل بھی نہیں۔"

76۔ "آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ میں ہے؟ اور کون آنا چاہتا ہے؟" "کوئی بھی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی آنا چاہتا ہے۔"

77۔ "بچت کس شکل میں کرتی ہیں؟"
"گولڈ کی شکل میں۔"

78۔ "کون سا کھانا زہر مار کر کے کھاتی ہیں؟"
"کوئی بھی نہیں لیکن پھر بھی کھچڑی پسند نہیں۔"

79۔ "شادی میں کون سی رسموں کے خلاف ہیں؟" "کسی بھی رسم کے خلاف نہیں، سب خوشی کی رسمیں ہیں اور خوشی ہی دیتی ہیں۔"

80۔ "آپ کے موبائل پر صبح سب سے پہلا میسج کس کا آتا ہے؟"
"شوہر کا۔"

81۔ "صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں پر آتی ہے؟" "دس منٹ اور سو لیتی ہوں۔"

82۔ "فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟"
"بھائی۔"

83۔ "آپ کی کس بات سے آپ کے والدین ناراض ہو جاتے ہیں؟"
"میں کبھی موقع ہی نہیں دیتی ناراضگی کا، یا ناراض ہونے کا۔"

84۔ "بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟"
"ورلڈ ٹور کا۔"

85۔ "پسندیدہ تہوار؟"
"عید کا۔"

86۔ "جانوروں میں پسندیدہ جانور؟"
"بلی۔"

87۔ "کن باتوں سے موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"
"جب کوئی جھوٹ بولے اور مجھے پتا چل رہا ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تو بس۔"

88۔ "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"
"آئس کریم۔"

89۔ "مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتی ہیں؟" "دو بار۔"

90۔ "بجلی کی بچت کس طرح کرنی چاہیے؟"
"چھ بجے سے لے کر رات ساڑھے دس بجے تک، ڈیپ فریزر، استری، ایکسٹرا لائٹ، پنکھے ضرورت کے چھوڑ کے سب کو بند رکھیں۔ اچھی خاصی بچت ہو جائے گی۔"

91۔ "کھانا کہاں پسند ہے؟" بیڈ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"ڈائننگ ٹیبل۔"

92۔ "گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتی ہیں؟"
"شوہر کے لیے۔"

93۔ "اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کس کو بتاتی ہیں؟"
"میرے پاس تو صرف میرے شوہر ہی ہیں جن کو مجھے بتانا نہیں پڑتا وہ میری شکل دیکھ کر ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اچھی نیوز ہے میرے پاس یا بری۔"

94۔ "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"ہر عروج کو زوال ہے یہی سچ ہے، میں ہر حال میں خوش رہنے والی بندی ہوں۔"

☆☆

آپ کی پسندیدہ مصنفہ

نایاب جیلانی سے ملاقات

شاہین رشید

نایاب جیلانی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کا شمار مقبول ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔ وہ قارئین کی پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن پرچوں میں متعدد ناول، ناولٹ اور افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ نایاب جیلانی ایک منفرد اسلوب کی مالک ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ایک فضا تخلیق کرتی ہیں اور قاری ان کی تحریر کے سحر میں مبتلا ہو کر خود کو بھی اسی ماحول کی کہانی کا حصہ محسوس کرتا ہے۔

آج ہم نے انٹرویو کے لیے نایاب جیلانی کا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری قارئین کو ان کا انٹرویو پسند آئے گا۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمد للہ"

"عموماً ایسے یونیک نام کا کوئی بیک گراؤنڈ ضرور ہوتا ہے۔ آپ کے نام کا بھی کوئی بیک گراؤنڈ ہے؟"

"جی بالکل ہے۔ میرا اصل نام "سیدہ نایاب زہرہ" ہے۔ نایاب جیلانی میرا قلمی نام ہے۔ ہم لوگ گیلانی سید ہیں میرے نام کے ساتھ زہرہ ہے۔ زہرہ پھول کو کہتے ہیں اور نایاب کا مطلب ہے قیمتی، نہ ملنے والا یا بہت ہی کم ملنے والا۔

میری امی نے میرا یہ نام رکھا تھا اور بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ میری بڑی بہن جو کہ "پہلوٹی کی" تھیں ان کا نام سائرہ تھا۔ چھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ امی بتاتی ہیں کہ وہ بہت ذہین تھیں۔ بہت لائق اور چھوٹی سی عمر میں بھی حاضر جواب تھیں۔

ان کے انتقال کے بعد میرا بھائی پیدا ہوا اور پھر میں...... میری پیدائش امی کے لیے بہت خوشی کا باعث تھی۔ تو امی نے میرا یہ نام رکھا کہ یہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ امی کا کہنا ہے کہ نام کا اثر شخصیت پر بہت ہوتا ہے۔ زہرا نام میرے چاچو رکھنا چاہتے تھے حضرت فاطمہ الزہرا کی نسبت سے تو پھر دونوں ناموں کو اکٹھا کر کے رکھا گیا۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"کچھ سال تو میں لکھنے سے بالکل غائب رہی۔ میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا لکھنے کا...... مگر ایسا نہیں کہ میں نے کچھ لکھا ہی نہ ہو، لکھ کر بس رکھ دیا۔ اب دل چاہتا ہے کہ تسلسل کے ساتھ لکھوں...... آج کل ایک نیا ناول لکھ رہی ہوں۔ ان شاء اللہ وہ بہت جلد شائع ہوگا۔ اور نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے کچھ تنظیمیں جوائن کر لی تھیں جن کے ساتھ میں بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ کچھ میرے پرائیویٹ پروجیکٹ تھے ان پر کام کیا اور اخبارات میں کالم بھی لکھے۔ اور ان شاء اللہ بہت جلد میری دو کتابیں بھی مارکیٹ میں آ جائیں گی۔"

"بچپن کیسا گزرا؟"

"بچپن کے بارے میں کیا بتاؤں۔ میں تو بہت ہی شرمیلی بچی تھی۔ گھر میں کوئی مہمان آ جاتا تھا تو میں دروازوں کے پیچھے چھپ جایا کرتی تھی۔ کبھی کسی کے سامنے آ کر سلام نہیں کیا تھا۔ تو آنے والے یقیناً سوچتے ہوں گے... کیسی بدتمیز بچی ہے۔ میری شادی بھی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی...... اتنی چھوٹی تھی کہ شاید سمجھ بھی نہیں ہو گی کہ میرا "نکاح" ہو گیا تھا میری پھوپھو کے بیٹے کے ساتھ۔ وہ "ساؤتھ کوریا" میں رہتے تھے۔

اتنی جلدی شادی کی وجہ سے، میری شخصیت میں جو ...

تھی۔ تعلیم بھی انسان کو بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ لیکن جب میں اکیلی ہوتی تھی تو میں سائیکلنگ بھی کرتی تھی لڑکوں والے کپڑے پہن کر، ہیٹ لگا کر اور جوتے پہن کر بہت شوق سے سائیکلنگ کرتی تھی۔ شرارتی نہیں تھی اور سگھڑ بھی نہیں تھی...... اور ابھی بھی نہیں ہوں۔ کھانا پکانے سے اتنی الرجی ہے کہ کچن میں جانے کو دل ہی نہیں کرتا...... ہاں میں صفائی پسند ہوں...... صفائی کرنے والی چلی بھی جائے تب بھی میں کچھ نہ کچھ صاف کرتی رہتی ہوں خاص طور پر کچن اور واش روم کی صفائی کا تو کریز ہے مجھے۔ میرا بیڈروم بھی صاف ستھرا رہتا ہے چیزوں کو بکھرنے نہیں دیتی۔

بچپن میں گڑیوں سے بہت کھیلی ہوں۔ گڑیوں کی شادیاں بھی کی ہیں، بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ گڑیوں کی شادیوں میں شرکت کرتے تھے۔ آپ کو بتاتی ہوں کہ میں کس طرح کی بچی تھی۔ گڑیوں کی شادی کے لیے جہیز بنانا، کپڑے، برتن، کچن کا سامان، فرنیچر سب کچھ تیار کرتی تھی۔ میری دوست کا گڈا ہوتا تھا اور میری گڑیا۔ بارات کا کھانا بنانا، شربت بنانا، یوں سمجھیں کہ جیسے سچ مچ کی شادی ہو۔ اور پھر گڑیا کو رخصت کر کے بہت روتی تھی کہ گڑیا بھی گئی اور سامان بھی گیا۔

تب میری امی نے کہا کہ اب تم گڈا لینا اور گڑیا بیاہ کر لانا۔ یہ بات جب میں نے اپنی دوست سے کی تو اس نے کہا کہ میں تو ایسا نہیں کروں گی۔ تو پھر میں نے گڑیوں کی شادی والا گیم ہی ختم کر دیا اور کرکٹ کھیلنے لگی۔ مجھے سارے بڑے بڑے اور یونیک کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ بہت ہی [illegible] ٹائپ لڑکی تھی۔ نہ جھگڑا، نہ فساد، نہ شرارت بہت معصوم سی تھی۔

میری امی محکمہ تعلیم میں "اے او" تھیں۔ بہت پڑھی لکھی اور ادبی ٹائپ کی شخصیت تھیں۔ بہت کتابیں اور ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھیں۔ امی ہی کو دیکھ کر مجھے بھی ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکا لگا۔ کلاس تھری یا فورتھ سے میں نے ڈائجسٹ پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ ہماری جو تحصیل تھی۔ اس کے اسکول امی کے انڈر تھے تو ان کے ...

لیے...... تو بڑی خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتی رہتی تھی۔

ایک دن چھٹی کلاس کی ایک لڑکی نے مجھے مارا اور میرے منہ پر جوتا مارا...... کوئی منہ پر مارے تو غصہ بہت آتا ہے مجھے تو خیر گھر میں کسی نے منہ پر نہیں مارا۔ مگر میں اتنی نازک مزاج تھی کہ اگر ساتھ سوتے ہوئے بھائی کا پاؤں بھی میرے منہ سے ٹچ کر جائے تو مجھے غصہ آ جاتا تھا اور اس لڑکی نے میرے منہ پر جوتا مارا، مگر میں خاموش رہی کہ ان سے ہمارے فیملی ٹرمز تھے تو کہیں میری وجہ سے خراب نہ ہو جائیں تو بس سب کچھ پی گئی۔ اس لیے مجھے آج تک اس کا جوتا مارنا یاد ہے۔"

"لکھنے کا عمل کب شروع ہوا؟"

"لکھنے کا عمل اس وقت شروع ہوا جب میں تقریباً پندرہ یا سولہ سال کی تھی۔ ڈائجسٹ کا بہت اثر تھا۔ کیونکہ بچپن سے پڑھ رہی تھی...... اور لکھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ جب میں پڑھتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ رائٹر نے کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ اور اس کردار کا یہ انجام ہونا چاہیے تھا۔ یہاں پر کہانی کا کلائمکس ٹھیک نہیں...... یہاں پر رائٹر نے یہ نقطہ تو اٹھایا ہی نہیں...... تو پھر میں نے سوچا کہ میں خود کیوں نہ لکھوں۔ تاکہ میں مطمئن ہو جاؤں اپنی کہانی پڑھ کر...... تب میں نے ایک افسانہ لکھا جو کہ کرن میں شائع ہوا۔ اس کی پورے خاندان میں خوشی منائی گئی تھی۔ ادارے کی طرف سے مجھے پانچ سو روپے اعزازیہ ملا تھا۔ وہ میرے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ اس رقم سے میں نے کھانے پینے والی چیزوں کی شاپنگ کی تھی۔ خوب انجوائے کیا تھا۔

آپ نے پوچھا کہ ڈائجسٹ تک رسائی کیسے ہوئی؟ تو میں نے بتایا تھا کہ بچپن سے ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ سب کے ایڈریس بھی لکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ عید کے موقع پر ایک افسانہ "آنگن کا چاند" لکھا اور کرن میں بھیج دیا۔ بھیجنے سے پہلے میں نے اپنی امی کو پڑھایا پروف ریڈنگ کی وجہ سے...... تو امی کو بہت اچھا لگا۔ انہوں نے کہا تو مجھے کوئی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رمضان میں بھیجا اور عید نمبر میں لگ بھی گیا۔ میرے لیے اور میرے والدین کے لیے بہت ہی خوشی کا مقام ...

تھا کہ میری بہت حوصلہ افزائی کی گئی۔

کرن کے پلیٹ فارم سے، عزت بھی ملی، شہرت بھی ملی اور بہت پیار بھی ملا۔ ریحانہ مدیرہ تھیں انہوں نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا اور ان ہی کی حوصلہ افزائی کی بدولت میں نے پھر دوسرا اور تیسرا افسانہ بھی بھیجا۔ اس کے بعد میں نے ایک مکمل ناول لکھا "نہیں آسان یہ سفر" اور آپ یقین کریں کہ میرے اس ناول کو بھی ویٹنگ پہ نہیں رہنا پڑا بلکہ فوراً ہی لگ گیا۔

میرے پاس ریحانہ سے رابطہ کرنے کے لیے کوئی نمبر نہیں تھا تو ایک دن میں نے اپنے گھر کے پی ٹی سی ایل سے کرن میں فون کیا تو ریحانہ نے کال ریسیو کی تو میں نے ان کو بتایا کہ میں نایاب بات کر رہی ہوں تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کون سی نایاب بات کر رہی ہیں تو میں نے کہا "نایاب جیلانی" میرا نام سنتے ہی انہوں نے بڑی ہی خوب صورت قسم کی چیخ ماری اور کہا۔

نایاب جیلانی؟ جناب ہم تو آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

انہوں نے بڑی اکیسائٹمنٹ کے ساتھ کہا۔ ہم تو آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپ کا فون نمبر ڈھونڈ رہے تھے۔ آپ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہو اور کیا ایج ہے آپ کی؟

"تو جب میں نے پہلا ناول لکھا تو میری عمر سترہ یا ساڑھے سترہ سال تھی تو ریحانہ نے کہا تم تو بہت بچی لگتی ہو۔ میں تو سمجھی کہ تم ففٹی پلس تو ضرور ہی ہو گی۔"

میری آواز بھی تھوڑی بچوں والی ہے تو بس۔

میرا بھی لکھنے کا سفر شروع ہو گیا اور میں نے خواتین اور شعاع میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ دیگر ڈائجسٹوں میں بھی لکھا۔ سب نے حوصلہ افزائی کی اور الحمدللہ اس وقت مارکیٹ میں میری اٹھارہ کتابیں ہیں۔

اپنی کامیابی کا سارا کریڈٹ میں ماہنامہ کرن کو دوں گی کیونکہ ان ہی کے تعاون کی وجہ سے میں آگے بڑھی مجھے مسلسل چھاپا یعنی مسلسل میری تحریریں شائع کیں۔ پھر شعاع اور خواتین ڈائجسٹ میں "..." آ گئی...

میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ مجھے ریڈنگ ... اور پورا پورا سال میری تحریریں شائع ... والوں نے مجھے نام دیا۔ عزت دی۔ ... مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے مسلسل شائع کیا ... والدین نے اور پورے خاندان نے بہت سپورٹ کیا۔

اب بھی میں کسی محفل میں یا شادی میں جاتی ہوں اور انہیں پتا چل جائے کہ میں آنی ... کے نام ... بہت حیران ہو جاتے ہیں کہ اچھا آپ نایاب جیلانی ہیں؟ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ کوئی بڑی عمر کی خاتون ہوں گی مگر آپ تو چھوٹی سی ہیں آپ تو شادی شدہ اور بچوں کی ماں نہیں لگتیں تو ایسے کمنٹس مجھے اندر سے بہت خوشی دیتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی غرور نہیں کیا البتہ میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔

میرے پہلے افسانے پر میرے ابو اتنے خوش ہوئے کہ سب سمجھے کہ شاید پرائز بانڈ نکل آیا ہے۔ بس پھر زندگی میں ایسے کرائسس آ گئے کہ لکھنا چھوڑ دیا۔ میرے بھائی کہتے کہ زندگی کی طرف لوٹ آؤ اور دوبارہ سے پہلے کی طرح لکھنا شروع کر دو۔ اب ان شاءاللہ ایسا ہی ہو گا۔"

"کیا لکھنے میں ایزی فیل کرتی ہو... سنجیدہ، رومینٹک یا کامیڈی؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ لفظ میرے اوپر اترتے ہیں۔ میں کبھی بھی زبردستی نہیں لکھ سکتی۔ میں صرف شوق سے لکھتی ہوں۔ اور جب میرے اندر لکھنے کا جنون سوار ہونے لگتا ہے تب میں لکھتی ہوں اور مجھے سب سے زیادہ مزا گاؤں کی تحریریں لکھنے میں آتا ہے۔ گاؤں کی منظر کشی کرنا مجھے بہت پسند ہے۔ دیہات کے ماحول کو لفظوں میں ڈھالنا بہت پسند ہے۔ مجھے سنجیدہ کہانیاں لکھنا پسند ہیں، کامیڈی لکھنا پسند نہیں ہے۔ کچھ مشاہدات اور تجربات بھی ہوتے ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ جب الفاظ میرے اوپر اتر رہے ہوتے ہیں تو ماحول اور تخیل اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ پھر انہیں لفظوں میں ڈھال دیتی ہوں۔

اصل میں، میں نے مطالعہ بھی بہت کیا ہے اور ... والدین ...

... پڑھتی تھی۔ مطالعہ وسیع ہو تو تحریر لکھتے ہوئے مشکل پیش نہیں آتی۔ کوئی بھی ناول کوئی بھی افسانہ، کوئی بھی تحریر لکھنی ہو ... اس کا اختتام نہیں سوچتی نہ آغاز۔ بس میں نے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ میں نے لکھنا ..... اور جب فیصلہ کر لیتی ہوں تو پھر قلم ہاتھ میں ہوتا ہے اور میں لکھتی چلی جاتی ہوں۔

ہاں بس یہ میرا دل ضرور چاہتا ہے کہ کرداروں کے نام یونیک ہوں ...... اور میرے لکھنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ جب دل کرتا ہے لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ جب جنون کی کیفیت سوار ہوتی ہے تو میں نہ کنگھا کرتی ہوں، نہ برش کرتی ہوں، نہ منہ دھوتی ہوں۔ نہ ناشتہ، کھانا بس لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ درمیان میں کسی سے ملتی نہیں ہوں۔ کوئی آ جائے تو کھا لیتی ہوں۔ مگر لکھنے کے دوران کسی سے ملنا مجھے نہیں بھاتا ہو، کوئی آ جائے۔ میں کبھی نہیں جاتی ہوں سارا فوکس میرا اپنے لکھنے پر ہوتا ہے اور پھر میں سارا سوار ہو ... میرا دل چاہتا ہے کہ جو لکھ رہی ہوں اسے مکمل کر کے ہی اٹھوں۔

میں نے آج تک کسی کا بتایا ہوا کیریکٹر نہیں لکھا، کبھی کسی کی بتائی ہوئی اسٹوری لائن نہیں لی ...... کہ میں ایسا لکھ ہی نہیں سکتی۔ میری اپنی مرضی کے کردار ہوتے ہیں اور میری اپنی مرضی کی اسٹوری ہوتی ہے۔

میں نے ایک ناول "باب عشق" لکھا۔ میں نے اسے محبت کے قلم سے لکھا، محبت کو اوڑھ کر لکھا وہ کتابی شکل میں آیا اور کسی ڈائجسٹ میں نہیں لکھوایا۔ یوں سمجھیں کہ وہ میرے کسی بہت ہی پیارے کی اسٹوری تھی۔ بڑی اچھی تحریر ہے، بہت سادہ الفاظ ہیں۔ مجھے اپنی یہ تحریر بہت پسند ہے اور اس ناول کو بہت پسند کیا گیا۔ یوں سمجھیں کہ میری اپنی کہانی ہے اور اس کو لکھ کر مجھے یوں لگا کہ بس اب مجھے کچھ اور لکھنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ کتاب میں نے کسی کے کہنے پر لکھی۔ ورنہ میں کسی کے کہنے پر لکھتی نہیں ہوں۔ بہت محبت سے کسی نے لکھوائی تھی۔

"اب تک کتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور آپ کو کون سی رائیٹر پسند ہیں؟"

"میری اٹھارہ کتابیں آ چکی ہیں۔ اور جو مجھے پسند ہیں وہ باب عشق، شہر خطا جو شعاع میں لگا تھا اور ترک وفا اور کچھ تحریریں ایسی بھی ہیں جو کتابی شکل میں نہیں آ سکیں ہیں۔

آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب یہ ہے کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو میں جن رائیٹرز سے بہت متاثر تھی ان میں "فائزہ افتخار" بہت پسند تھیں وہ بہت ہی سادہ اور عام لوگوں کی کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ رخسانہ نگار مجھے بہت پسند تھیں۔ عمیرا احمد بہت پسند تھیں۔

"امر بیل" میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے۔ "کس جہاں کا زر لیا" یہ میں نے بہت چھوٹی عمر میں پڑھیں۔

فائزہ افتخار کو پڑھ کر بندہ فریش ہو جاتا ہے۔ فرحت اشتیاق آپی مجھے بہت پسند ہیں، کچھ رومینٹک اور ہلکا پھلکا پڑھنے کا دل کرتا تھا تو ان کا کوئی ناول نکال کر پڑھ لیتی تھی۔ نمرہ احمد بہت پسند ہیں ان کا "نمل" بہت پسند ہے۔ "جنت کے پتے" بہت پسند ہے۔ عنیزہ سید آپی، نفیسہ سعید بہت پسند ہیں ان کی کہانیاں پڑھ کر کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ضرور مل جاتا ہے۔ "راحت جبیں" کے ناول گرمیوں کی دوپہروں میں پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ راشدہ رفعت اور شبانہ شوکت بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

"ٹی وی کی سائیڈ پہ کیوں نہیں آتیں۔ خواتین رائیٹرز تو ڈراما لکھ کر بہت کما رہی ہیں؟"

"ٹی وی میرا سبجیکٹ ہی نہیں ہے۔ ہمیشہ سے ہی میرا اس طرف رجحان اور دلچسپی نہیں ہے...... اور یہ کام مجھے اپنے مزاج سے ہٹ کر لگا۔ اس طرح کہ ایک دو بار کوشش کی ...... پھر چھوڑ دیا کہ میں ٹی وی کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ میری کافی ساری دوستیں بڑا اچھا لکھ رہی ہیں اور ویسے بھی میں نے پیسہ کمانے کے لیے تو کبھی لکھا ہی نہیں۔ اپنے شوق کی خاطر اور اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے لکھتی ہوں۔ اب پیسہ انسان کی مجبوری بن گیا ہے مگر اس مجبوری میں وہ کام نہ کرے انسان جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔ پیسہ کمانے

کے لیے انسان وہ کام بھی کر سکتا ہے جس میں اس کا شوق و جذبہ ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں اگر شوق و جذبہ نہ ہوا تو میں اچھا نہیں لکھ سکوں گی۔

2014ء میں اے آر وائی ڈیجیٹل کی پوری ٹیم میرے پاس آئی تھی اور انہوں نے میری منت کروا کے گئے تھے میرا ایک ناول جو کہ شعاع میں شائع ہوا تھا "کوئی چاند رکھ میری شام پر" اس پر انہوں نے ڈرامہ بنایا۔ چھ اقساط مجھ سے لکھوائیں۔ اسی دوران میری بچی اور میرے امی ابو کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تو میرا یہ کام پینڈنگ میں چلا گیا۔ اور چونکہ انہوں نے مجھے بے منت کی ہوئی تھی تو میں نے انہیں اپنی مجبوری بتائی اور کہا کہ آپ اسے کسی اور رائٹر سے لکھوالیں۔ تب ماہا ملک نے اسے مکمل کیا۔ اور ماہا نے بہت اچھا لکھا اور یہ ڈرامہ سپرہٹ گیا۔

اس کے بعد بھی کافی لوگوں نے ون لائنر لینے کے لیے مجھ سے رابطہ کیا۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ میں اس کام کے لیے بنی ہی نہیں ہوں ہو سکتا ہے کہ فیوچر میں خیالات بدل جائیں لیکن فی الحال تو نہیں لکھوں گی ٹی وی کے لیے...... ہاں کوئی آمدنی کا ذریعہ نہ ہو تو یہ اور بات ہے۔ خیر مجھے تو شعاع اور خواتین و کرن سے بہت اچھا اعزازیہ ملتا ہے...... میں نے تو بہت سی چیزیں خریدی ہیں۔ اچھی اچھی شاپنگ کی ہے اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات کو پورا کرتی ہوں۔ اگر میں ان تین ڈائجسٹوں میں لکھوں تو مجھے اور کہیں لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"نایاب...... اب آپ اپنے بارے میں اپنے بچوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"جی...... میری تاریخ پیدائش 10 اپریل ہے۔ میرے والدین کا تعلق "سرگودھا" سے ہے بلکہ سرگودھا کے ایک گاؤں سے ہے۔ اور ہمارے خاندان میں دور دور تک کسی کو لکھنے کا شوق نہیں ہے بس میں ہی لکھتی ہوں۔ میرے دو بھائی ہیں۔ ایک مجھ سے بڑا ہے اور ایک مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں نے اردو ادب میں ماسٹرز کیا۔ شادی بھی آپ کو بتایا جلدی ہی ہو گئی تھی۔ دو بچے ہیں......

ایک بیٹا...... اور شادی زیادہ عرصہ چلی بھی نہیں۔ میرا بیٹا اپنی عمر سے تھوڑا پیچھے ہے جب کہ بالکل نارمل ہے اور بارہ سال کی ہے۔ اس نے قرآن پاک حفظ کیا ہے ایک ماہ قبل...... یہ ہمارے خاندان کی پہلی بچی ہے جو ابھی پورے بارہ کی بھی نہیں ہوئی مگر عبایا اور حجاب کرنا شروع کر دیا ہے۔ بہت ذہین ہے۔ امی ابو حیات نہیں ہیں اور انہوں نے میری پرورش اس توجہ اور محبت کے ساتھ کی کہ مجھے پتا نہیں تھا کہ غم، پریشانی اور ڈپریشن کیا ہوتا ہے۔

چونکہ میرے والدین نے میری شادی بہت کم عمری میں کر دی تھی تو اس بات کا انہیں افسوس ہے۔ کہ بچی کو پڑھنے نہیں دیا۔ میری ساس میری پھوپھو تھیں جنہوں نے بہت مسائل پیدا کیے۔ میری شادی بہت کرائسس میں گزری۔ تو ان باتوں کو لے کر میرے والد اندر ہی اندر گھلتے رہتے تھے پھر بعد میں انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور گھر میں میرے لیے ایک علیحدہ پورشن بنایا کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ رہوں۔ اطمینان کے ساتھ اپنی تعلیم کو مکمل کروں انہوں نے ہی مجھے مشورہ دیا کہ چونکہ تمہارا لکھنے سے تعلق ہے تم ڈگری بھی اسی میں لو...... میں سارا سارا دن لکھتی تھی تین دن میں ناول مکمل کر لیتی تھی وہ مجھے کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ایک ناول "شہر آشوب" میں نے تین دن میں مکمل کیا تھا اور شعاع میں شائع ہوا تھا ون شاٹ میں تھا دن رات لکھنے کی وجہ سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے ابو بہت پریشان ہو گئے تھے۔ انہیں مجھ پر بہت فخر تھا اور اس کا اندازہ مجھے ان کی وفات کے بعد ہوا، جب ملنے والے اور تعزیت کرنے والے بتاتے تھے کہ تمہارے ابو کو تم پر بہت فخر ہے۔ میں اگر اپنے ابو پر کتاب لکھوں تو ایک کتاب میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔

پورا گاؤں، پورا محلہ، ایک ایک بندہ اس بات کا گواہ ہے کہ میں نے اگر دن کے وقت کہا ہے کہ ابو ابھی تو رات...... ہے دو تین بجے بھی میں نے کوئی فرمائش

انہوں نے میری فرمائش پوری کی ہے۔ مجھے ہر طرح کی آزادی تھی۔ میری شادی کے کرائسس شروع ہوئے تو ابو نے کہا کہ تم نے ٹینشن نہیں لینی اپنی ساری پریشانیاں مجھے دے دو اور تم خوش رہا کرو اور لکھنے پر توجہ دو......

میرے ابو نے مجھے دبئی بھیجا، مجھے عمرہ کرایا۔ پورے پاکستان کا ٹور کرایا۔ جب بھی کوئی ادبی سیمینار کا دعوت نامہ آتا تھا تو ابو مجھے خود لے جاتے تھے۔ میرے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی طرح پالا...... امی سے بھی زیادہ ابو نے پیار کیا۔ اور اتنا پیار کرنے والی شخصیت کو دنیا سے جاتے وقت بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ جانے سے پہلے پندرہ منٹ پہلے بیڈ پر لیٹے تھوڑی سی طبیعت خراب ہوئی اور پھر کلمہ پڑھا اور رخصت ہو گئے۔ اللہ میرے ابو پر کروڑوں رحمتیں نازل کرے آمین۔

میرا گھر ٹوٹا مجھے دکھ نہیں ہوا۔ میری زندگی برباد ہوئی مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی لیکن جب سے اس دنیا سے گئے ہیں مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی ختم ہو گئی ہے۔ میرے بڑے بھائی کو وصیت کی کہ میری بیٹی کو میری جائیداد سے یہ حصہ دینا کہ اسے کبھی مالی پریشانی نہ ہو۔"

"شادی کیوں ناکام ہوئی / پھر دوسری شادی کی؟"

"میرے شوہر مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ تو میری ان سے انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو پائی۔ مجھے ان کی اچھی بات بھی بری لگتی تھی۔ وہ میری کتابیں اپنے آفس لے جا کر اپنے دوستوں کو دکھانا چاہتے تھے اور سب کو فخر سے بتاتے تھے کہ میری بیوی لکھتی ہے مگر پتا نہیں کیوں۔ مجھے ان کی ان باتوں سے بڑی چڑ تھی اور میں کہتی کہ بھلا یہ کوئی بات بتانے کی ہے جو آپ سب کو بتاتے ہیں۔ ان کی ہر بات سے اختلاف کرنا۔ اب سوچتی ہوں تو اپنے آپ سے کہتی ہوں کہ میں ایسا کیوں کرتی تھی......

اوپر ان کی امی اور بہن کا پریشر نہ ہوتا تو وہ تو بہت ہی اچھے اور کو آپریٹو انسان تھے۔ وہ ملک سے باہر رہ کر آئے تھے...... تو کچن میں کام کرنا ان کے لیے مسئلہ ہی نہیں تھا وہ کھانا بہت اچھا بنا لیتے تھے......

میرے امی ابو نے مجھے بہت ہی لاڈوں میں پالا تھا۔ امی جاب کرتی تھیں تو ہمارے گھر میں تین چار نوکر ہوتے تھے۔ جو ہمارا ہر کام کرتے تھے...... اور پھر جب امی ریٹائر ہوئیں تو بھی کھانا وغیرہ خود ہی پکاتی تھیں...... میری چونکہ چھوٹی عمر میں شادی ہوئی تھی تو مجھے تو کھانا وغیرہ پکانا کچھ بھی نہیں آتا تھا...... میری پھوپھو جانتی بھی تھیں کہ مجھے کچھ نہیں آتا، اس کے باوجود وہ ہر بات کو ایشو بنا لیتی تھیں۔

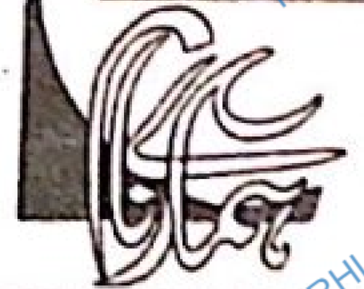
سسرال میں نوکر کا رواج نہیں تھا۔ ان کے گھر میں کوئی کام والی گھس بھی نہیں سکتی تھی۔ میری پھوپھو اتنی صفائی پسند تھیں کہ گھر میں کوئی پانی بھی گرنے نہیں دیتی تھیں۔ میری پھوپھو اور ان کی بیٹی کو کام والیوں سے تو چڑ آتی تھی کہ یہ واش روم یوز کریں گی اور ہر کمرے میں جائیں گی۔ ہماری پرائیویسی خراب ہو گی۔

مجھے تو عادت ہی نہیں تھی کام کرنے کی، تو جب میرے شوہر کی امی اور بہن گھر پر نہیں ہوتی تھیں تو وہ جلدی سے گھر صاف کر دیتے تھے۔ کھانا بنا دیتے تھے۔ کہ ابھی امی آ جائیں گی تو مجھے ڈانٹیں گی کہ تم نے کام نہیں کیا۔ بہت اچھے انسان تھے۔ میری پڑھائی لکھائی پر تو پھوپھو لوگ بالکل بھی فخر نہیں کرتی تھیں۔ میں پھوپھو کے ساتھ کسی شادی کے فنکشن میں جاتی تھی اور وہاں کسی کو پتا چل جاتا تھا کہ یہ نایاب جیلانی ہیں تو وہ مجھ سے ملنے آ جاتی تھیں تو پھوپھو کو بہت برا لگتا تھا کہ۔

"لو جی ایک تو ہمیں اس بات کی تنگی آتی ہوئی ہے کہ یہ لکھتی ہے۔ ہمارے سر سے یہی احسان نہیں اترتا کہ میں رائٹر ہوں جبکہ میرے شوہر مجھ پر بہت فخر کرتے تھے۔"

(جاری ہے)





خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

زرینہ خانم افاری...... مظفر گڑھ

شرمائی شرمائی سی آنکھیں جھکائی ہوئی دلہن دل کو بھائی، واقعی دلہن شرمائی ہوئی ہی پیاری لگتی ہے، آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کو ساری عمر پڑی ہے۔ راحت جبیں نے زندگی تجھ کو گزاریں گے کا اینڈ کر دیا۔ ہم سب سے پہلے اسی کہانی کی طرف لپکتے تھے۔ مراد کا کردار سب سے بہترین تھا۔ سلجھا ہوا، معاف کر دینے والا لڑکا۔ یہ کردار بھی سکندر سالار وغیرہ کی طرح مدتوں یاد رہے گا۔

دانہ پانی کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ تجسس سے بھرپور ناول ہے موتیا اور مراد کا ملنا ناممکن نظر آ رہا ہے۔ مشک بام اور مالا بھی بہت پسند آئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے میرا تعلق بھلے نہیں رنگ، نسل سے ہے۔ ایک بات تو ہمیں بھی جاننی چاہیے سب انسان برابر ہیں کسی کو کسی پر برتری نہیں، صرف تقویٰ کی وجہ سے برتری ہے۔

اگر آپ حلال کمائی کر رہی ہیں تو سب سے بہتر ہیں۔ آپ کے سر کا سائیں ہے، تین بچے ہیں آپ خوش قسمت ہیں، صبر شکر سے زندگی گزاریں۔ آپ نے زمین کی محنت سے بھی کچھ سبق حاصل نہیں کیا۔ عدنان بھائی کو اللہ لمبی زندگی دے، بہنوں کی مشکلات کا حل بتاتے ہیں بہنیں بلا جھجک اپنا مسئلہ پیش کر دیتی ہیں جو عدنان بھائی کے مشورے سے سلجھ بھی جاتا ہے۔

ج: عزیز بہن زرینہ! آپ کا خط لیٹ موصول ہوا تب تک اگست کا پرچا پریس جا چکا تھا۔ اس لیے ہم آپ کا خط اس ماہ شامل کر رہے ہیں۔

تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

مہک فاطمہ...... ڈنگہ

آپ کے ساتھ ہمارا دلی تعلق 2015ء سے ہے۔ لیکن باقاعدہ رسالے منگوانے کا سلسلہ 2018ء سے شروع ہوا۔

کہانیوں میں سب سے پہلے بات ہو جائے ''الا'' کی۔ ٹاپ آف دی لسٹ کہانی ہے۔ بیربل اور شبنم کی شرارتیں بور نہیں ہونے دیتیں۔ پلیز شاہین آپی نمرہ احمد آپی کا انٹرویو ضرور لیجیے گا۔ اب بات ہو جائے ''دانہ پانی'' کی۔ مجھے اور میری بہن کو تو پچھلی قسط پڑھ کر لگا تھا کہ مراد اور موتیا کے بیچ کی دوریاں ختم ہو چکی ہیں۔ مگر اس قسط میں تو عمیرہ آپی نے بہت بڑا سسپنس ڈال دیا ہے۔ ''مشک بام'' بھی سمیرا حمید کا باکمال شاہکار ہے۔

اس دفعہ خواتین کا ٹائٹل بہت ہی زبردست تھا۔

''فرزانہ کھرل، نازیہ رزاق، فشا محسن، عنبرین اقبال، عنیزہ سید، سائرہ رضا، نعیمہ ناز'' اور ''فرخ بخاری'' کو میری طرف سے بہت سارا اسلام اور نیک تمنائیں۔

اب بات ہو جائے تعارف کی تو میں ایک بائیس سالہ دوشیزہ ہوں۔ میٹرک کے بعد عالمہ کا کورس کیا ہے۔ ایک اسلامی بہن ہونے کے ناتے میری یہ رائے ہے خواتین اور شعاع پڑھنے سے کوئی بھی انسان خراب نہیں ہوتا بلکہ ان سے ہمیں زندگی کے معاملات کی راہنمائی ملتی ہے۔ حالانکہ میرے اپنے ابو بھی اس چیز کے بہت خلاف ہیں۔ انہوں نے مجھے رسالے پڑھنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں خواتین اور شعاع ابو سے چھپ کر بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

چلیے! آپ کو اپنی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ سناتی ہوں۔ ''ایک دفعہ میں سیڑھیوں پہ بیٹھ کر بڑے سکون سے رسالہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ مین گیٹ بند ہے۔ جب ابو باہر سے آئیں گے میں رسالہ چھپا دوں گی۔ لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابو آئے اور آدھی سیڑھیاں بھی چڑھ آئے۔ کہ اچانک میں نے ابو کو دیکھا اور میں سکتے میں آ گئی۔ میں بھاگ کر چھت پر چڑھ گئی مگر ابو میرے پیچھے آ گئے اور بولے بیٹا جی جو پڑھ رہے تھے، اسے میرے پاس لے آؤ۔ پھر ابو نے مجھ سے رسالہ لے کر اس کے جتنے ٹکڑے ان سے ہو سکتے تھے انہوں نے کر دیے اور میں رونے لگ گئی کیونکہ میری کہانی ابھی مکمل نہیں تھی۔ میں دیکھتی رہی کہ ابو اب کیا کریں گے۔ پھر ابو نے سارے ٹکڑے شاپر میں ڈال کر ڈریسنگ کے اوپر رکھ دیے۔ رات کو جب سب لوگ سو گئے تو میں اٹھی اور اندر آ کر شاپر اٹھایا اور پیس جوڑے۔ پیس جوڑنے کے بعد اپنی کہانی مکمل کی اور پھر مجھے سکون کی نیند آ گئی۔''

آخر میں شعاع اور خواتین کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ اور کوثی جمال کو ڈھیر سارا اسلام۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کے لیے میں بہت دعائیں کرتی ہوں۔ آمین

ج: پیاری مہک! آپ بہت اچھی لگی ہیں۔ آپ کے والد آپ کو رسالہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے والد کو خواتین کے سلسلے پیارے نبی کی باتیں اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھوا دیں۔ اگر وہ پڑھنا نہ چاہیں تو اپنی والدہ کو پڑھ کر سنائیں تا کہ وہ اندازہ کر سکیں کہ ان پرچوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو لڑکیوں کو خراب کرے۔

حیرت کی بات ہے آج کل بچوں کے ہاتھوں میں فون نظر آتا ہے جس میں ہر طرح کی چیزیں ہوتی ہیں ٹی وی پر سب کچھ دکھایا جا رہا ہے، لیکن والدین کو اعتراض ان پرچوں پر ہوتا ہے جس میں زیادہ تر کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔

آپ نے تو خود عالمہ کا کورس کیا ہے۔ آپ کے والد کو آپ پر اعتماد کرنا چاہیے۔

کوثی جمال...... منڈی یزمان

طبیعت بہت اداس ہے۔ جو چرا اپنی چھایا ہے مجھ پر اکثر کسٹمرز بھی آ کر تنگ کرتے ہیں پھر بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دو دن پہلے فجر کے ٹائم اماں اٹھیں تو توازن برقرار نہ رہا اور کافی گہری چوٹیں لگ گئیں۔ دیکھ کر دل حلق میں آ گیا۔ اماں دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ دونوں آپال گراں کو سنبھال رہی ہیں۔ چھوٹا بھائی بھی گھن چکر بنا ہوا ہے۔ اوپر سے طوفانی بارشیں بھی اپنے عروج پر ہیں پورے پاکستان میں یہی حال ہے ہر طرف کیچڑ، جس اور کہیں کہیں تو تند و تیز سیلابوں کے ریلے جوق در جوق۔

لگتا ہے اس دفعہ ٹائٹل کے رنگ بھی بارشیں اڑا لے گئیں۔ جولائی اور اگست دونوں کے ٹائٹل کا کلر ایک جیسا ماڈل انمول بھی۔ سوری یہ تو ہرگز نہیں ہے کہاں وہ گول مٹول وگز و نبہ پیاری سی۔ انمول بھی پیاری ہیں لیکن اسمارٹ ہیں۔ آپا ناہید اسماعیل ویلکم جی! آپ کا اپنا سٹور ہے جب دل چاہے تشریف لائیں بے انتہا خوشی ہوگی اور خصوصی رعایت بھی۔ رافعہ کے سروے کا بہترین اختتام، راشدہ رفعت سے ہو گیا۔ اب قارئین کی باری۔ ''سید افراز رسول ملاقات چند سوالوں پر ہماری بس ہو گئی اور جلدی سے ورق گردانی کی۔ ادشا باشے نریم عزیز بہت ہی پیاری مصنف۔ ملاقات کرتے پتا ہی نہیں چلا کب صفحے ختم۔ شادی کے معاملات میں میری طرح وقت مقرر کے انتظار میں۔ ''دانہ پانی'' بقول تیرا بیڑہ غرق ہو، کس امتحان میں ڈال دیا تو نے بے چاری موتیا کو۔ ہوگا اس کے ساتھ بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ دوشیزائیں میں ''دانہ پانی'' دکان میں بیٹھ کر پڑھی ہیں آج کل مستقل سلسلے جیسے تیسے کر کے پڑھے جاتے ہیں کچھ کہیں بیٹھ کر اور کچھ کہیں۔ باقی کہانیاں رہ جاتی ہیں ٹائم نہیں ملتا۔

''رمشہ روشن، نیا نام'' ارمان کے ساتھ خوب صورت انٹری۔ لگتا میرے پنڈ کی کہانی لکھ ڈالی۔ ہمارا پنڈ بھی اب بہت الٹرا ماڈرن ہو گیا۔ جدھر دیکھو لڑکیاں موٹر بائیک اڑاتی زن سے گزر جاتی ہیں۔ پہلے پہل اماں دروازے میں کھڑی فریش ہوا کھا رہی ہوتیں، لوگوں کو

آتے جاتے دیکھتیں یا پھر ہمارے پنڈ کے چوک میں روز کوئی نہ کوئی کپڑے یا برتنوں کی سیل کا ڈیرا لگا رہتا ہے۔ تو بہت ساری خواتین کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ ایک نے چیز لینی ہوتی باقی محلے کی خواتین ایویں ہوا خوری کرنے ساتھ آجاتی ہیں۔ یہ نظارے دلچسپی سے دیکھنا اماں کا مشغلہ رہا۔ ایسے میں کوئی لڑکی بائیک اڑاتی گزر جاتی تو اماں کی صلواتیں سنا دیتیں اور ہمارے قہقہے دور تک جاتے۔

ج: پیاری کوثر! لگتا ہے آپ اپنی امی کی بیماری کی وجہ سے زیادہ ہی پریشان ہیں اسی لیے اس دفعہ آپ کے خط میں ہمیں پہلے جیسی چونچالی محسوس نہیں ہوئی، دکان پر خریداروں کا ہجوم تو دکان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ہمیں تو خوشی ہوئی دکان کامیابی سے چل رہی ہے۔

امی کی بیماری پریشان کن ضرور ہے لیکن بڑھاپا اور کمزوری لازم وملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو بیماری اور معذوری سے محفوظ رکھے، ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے آمین۔ اپنی امی کو ہمارا سلام کہہ دیں۔

شہناز ملک...... خانیوال

خواتین اور شعاع کی جو بات سب سے اچھی ہے، وہ اس کا معیار ہے۔ آج کل کے دور میں جہاں سوشل میڈیا نے اپنا قبضہ جمایا ہوا ہے وہاں بھی خواتین نے اپنا معیار برقرار رکھا ہوا ہے۔ جب ہم بہنیں سولہ سترہ سال کی تھیں تو ہمارے ابو ہمیں بہت اشتیاق سے شعاع خواتین خرید کر دیتے تھے۔ انہیں پتا تھا یہ ایک معیاری رسالہ ہے اور آج جب میری بچیاں پڑھ رہی ہوتی ہیں تو میں بھی انہیں منع نہیں کرتی۔ "مالا" زبردست ناول جا رہا ہے۔ میں نے اپنے دو افسانے بھیجے ہیں۔

ج: پیاری شہناز! آپ کا ایک افسانہ شعاع کے ستمبر میں شائع ہو گیا ہے۔

خواتین اور شعاع پر آپ کا اعتماد ہی ہماری کامیابی ہے بہت شکریہ۔

انعم وجاہت...... جلال پور جٹاں

سادہ سی ناقابل فہم مسکراتی ہوئی لڑکی دل کو بھا گئی پھر دوڑ لگائی مالا کی طرف، پوری قسط میں سرکار، کبیرہ تائی اور شمس کا ذکر بالکل نہیں ہوتا۔ پلیز آپ ہر قسط میں سارے کرداروں کو شامل کیا کریں۔ اس کے بعد میرا تن من نیلو نیل ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ پندرہ سالوں میں یہ پہلی کہانی ہے کہ مجھے شروع میں معلوم نہیں ہوا کہ عباس تحریم کا بیٹا ہے ورنہ ہر کہانی کے آغاز میں ہی پتا چل جاتا ہے بالاشبہ رائٹر نے بہت اچھی کہانی لکھی، بہت اچھا سبق تھا۔ نجانے کیوں ہم اسلام کے احکامات بھول جاتے ہیں۔ یقین کریں مجھے یہ لمبی لمبی منگنیاں نکاح اور نیلی فونک رشتے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ میری عمر کوئی بہت زیادہ تو نہیں چھبیس سال کی ہوں، انیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی تھی اور میرا تجربہ یہ ہی ہے کہ فون میں اور اصل زندگی میں بہت فرق ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں کچھ غلطیاں بھی محسوس ہوئیں کہ تحریم اپنی خالہ کے پاس ماسٹرز کرنے ایک سال کے لیے گئی جبکہ ماسٹرز یا ایم ایس تو دو سال میں ہوتا ہے امریکا میں عباس کی گریجویشن تھی جبکہ گریجویشن کی ڈگری تو وہ پاکستان سے لے کر گیا ہے بہرحال مقصد رائٹر کی دل آزاری یا تنقید بالکل بھی نہیں ہے بلکہ اصلاح کی چھوٹی سی کوشش ہے، باقی ناول بے حد شاندار اور سبق آموز تھا اس کے بعد "سزا" پڑھا الف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دانہ پانی ہائے اللہ عمیرہ آپی یہ کیا کیا نجانے کیوں لگتا ہے کہ یہ ایک خواب ہی ہو گا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

افسانے سارے ہی اچھے اور سبق آموز تھے حق حقدار تک الف پڑھ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیسے کیسے لوگ ہیں۔ کوثر جمال آپ کو دکان کی بہت مبارک باد آپ کے لیے دو مشورے ہیں کہ دکان میں باقی سامان کے ساتھ ساتھ دہی بڑے یا چنا چاٹ مطلب کم لاگت اور کم دام میں بکنے والی چیزیں بھی رکھ لیں، اس کے علاوہ بچوں کے لیے سامان رکھیں یقیناً آپ کو بہت فائدہ ہو گا اور افتخار احمد آپ کی کمی مجھے بہت محسوس ہوتی ہے۔ اللہ آپ کے والد کو جنت اور آپ کو صبر دے آمین۔ نفسیاتی الجھنوں میں بہن کا مسئلہ پڑھ کے بے حد دکھ ہوا، بھائی اپنے خرچ سے تنگ ہیں آپ کو اور آپ کے بچے کو کیسے رکھیں گے، وہ، اصل میں غریبی ان سارے حالات کی ایک بہت بڑی وجہ ہے میاں محمد بخش نے بڑا اچھا شعر کہا تھا کہ۔

روگاں وچوں روگ وڈا جس دا نام غریبی

چھڈ جاندے دوست رشتے دار سب قریبی

"مقدس بام" ابھی پڑھا نہیں کیونکہ چراغ کی حرکتیں ہمیں بہت چراغ پا کرتی ہیں اس لیے اینڈ پہ پڑھتے ہیں اور ایک اچھی بات میں بتاؤں آپ کو خواتین کے ساتھ ساتھ اب میں نے شعاع بھی خریدنا شروع کر دیا، وہ بھی خواتین کی ہی دوسری بہن ہے بہت مزہ آیا پڑھ کر، پندرہ سالوں میں یہ اپنا تیسرا خط ہے۔ یاد آیا پلیز ہمارا موٹا سا شمارہ واپس کر دیں جیسے کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ میری شادی کو تقریباً ساڑھے چار سال ہو گئے ہیں تین مہینے پہلے میرا مس کیرج ہو گیا تھا پلیز دعا کریں کہ اللہ جلدی سے مجھے اولاد سے نوازے آمین۔

ج: پیاری انعم! آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے ناول پر۔ آپ کے مس کیرج کا جان کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازے آمین۔

موٹا سا شمارہ ضرور واپس ہو گا۔ ان شاء اللہ، اللہ سے بہتری کی امید رکھیں۔

فرحت بنت اکرم...... بریہ وجہاں فاطمہ دیدار سنگھ ضلع گوجرانوالہ

رائٹرز، قارئین اور ادارے کے اسٹاف کی دل کی گہرائیوں کے ساتھ بے حد ممنون ہوں۔ کہ جنہوں نے میری عمر کے صرف تین سالوں کے دورانیے میں میری سوچ، میرے انداز کو یقینی طور پر بدل کے رکھ دیا۔ میں دعوے کے ساتھ کہتی ہوں۔ کہ میری رہنمائی خواتین ڈائجسٹ نے کی۔ شکریہ

میں ایک چھوٹے سے گاؤں کی میٹرک پاس صرف اٹھارہ انیس سال کی لڑکی ہوں۔ تین سال سے پڑھ رہی ہوں۔ میں اور رسالوں کو بھی پڑھتی ہوں۔ مگر خواتین میری پہلی چوائس ہے۔ تبصرے کی محفل میں اس لیے شامل ہوئی ہوں کہ چند رائٹرز ہیں جن کے ناولز ڈھونڈ کر پڑھتی ہوں جیسے نمرہ احمد، سمیرا حمید، نازیہ رزاق، اور فرزانہ کھرل "میری موسٹ فیورٹ ہیں۔ میری ریکویسٹ ہے آپ سے پلیز فرزانہ کھرل کو سلسلے وار ناول کے لیے کہیں۔ ان کا "کیسری کے پھول" "دور کے درختوں تک" ابھی بھولے نہیں ہیں۔ سو پلیز انتظار رہے گا اور نمرہ جی کیا بات ہے۔ گھر بیٹھے ہمیں دنیا دکھا دیتی ہیں۔

ج: پیاری فرحت! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ خواتین ڈائجسٹ نے آپ کی رہنمائی کی۔ آپ کی سوچ بدلی۔ بلاشبہ تحریروں کا انتخاب کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں یہی مقصد ہوتا ہے۔ لیکن یہ آپ کی اپنی اچھائی بھی ہے کیونکہ نصیحت کا اثر بھی وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کشادہ دل اور مثبت سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ نے خواتین کی تحریروں کو سمجھا ان کا اثر قبول کیا۔

صفیہ مہر فرحان...... فتح پور کمال

سال پچھلے اپریل 2021ء میں، میں نے آخری بار انٹری دی تھی۔ میں صفیہ مہر کے نام سے لکھتی تھی، مئی 2021ء میں شادی ہوئی میری تو بہت سارے چینج کے ساتھ نام تبدیل ہوا۔ صفیہ مہر سے صفیہ فرحان ہوگئی، خوشیاں ملیں تو ساتھ ہی قسمت میں ایک نہ بھرنے والا زخم بھی ملا۔ "ساری کہانی ہی خوب صورت ہے" میں سائرہ رضا کا حال پڑھا۔ انہوں نے لکھا، میرا مس کیرج ہوا تو میں بہت ٹوٹ گئی۔ میرے بھی پہلے بے بی ٹوئنز تھے، چھٹے ماہ میں میرا بھی مس کیرج ہوا۔ تو مجھے لگا، بچوں کے ساتھ میں بھی مر گئی ہوں۔

میرے ہمسفر نے میرا قدم قدم پر ساتھ دیا مجھے پھر سے سمیٹا۔ میرا شوہر ہر ماہ بغیر کہے شعاع، خواتین لا دیتا ہے، اس ماہ میں رہ نہیں سکی، نمرہ احمد کا "مالا" پڑھ کر لگا اس کی تعریف کرو سو حاضر ہے، ہر قسط پڑھ کر دوسری کا انتظار شروع کر دیتی تھی۔ او بیٹا تمہارے بچے کے لیے میں بھی دعا میں کرتی تھی۔ ماہرم دل تو ہار چکے ہو، مالا کے سامنے بھی ہتھیار پھینک دو، بہرحال غلطی تمہاری ہے۔

"دانہ پانی" عمیرہ احمد کے لیے جتنے لفظ اکٹھے کروں کم لگتے ہیں۔ اب چلتے ہیں اپنی پسندیدہ رائٹر کے فیورٹ ناول "مقدس بام" چراغ بہت ہی مزے کی لڑکی ہے کچھ بھی ہو لڑکیاں ایسی ہی شرارتیں کرتی اچھی لگتی ہیں سنجیدگی کے لیے عمر پڑی ہوتی ہے۔ شمس کی بینڈ بھی رہتی

بقیہ صفحہ نمبر 214 پر

عمیرہ احمد

دانہ پانی



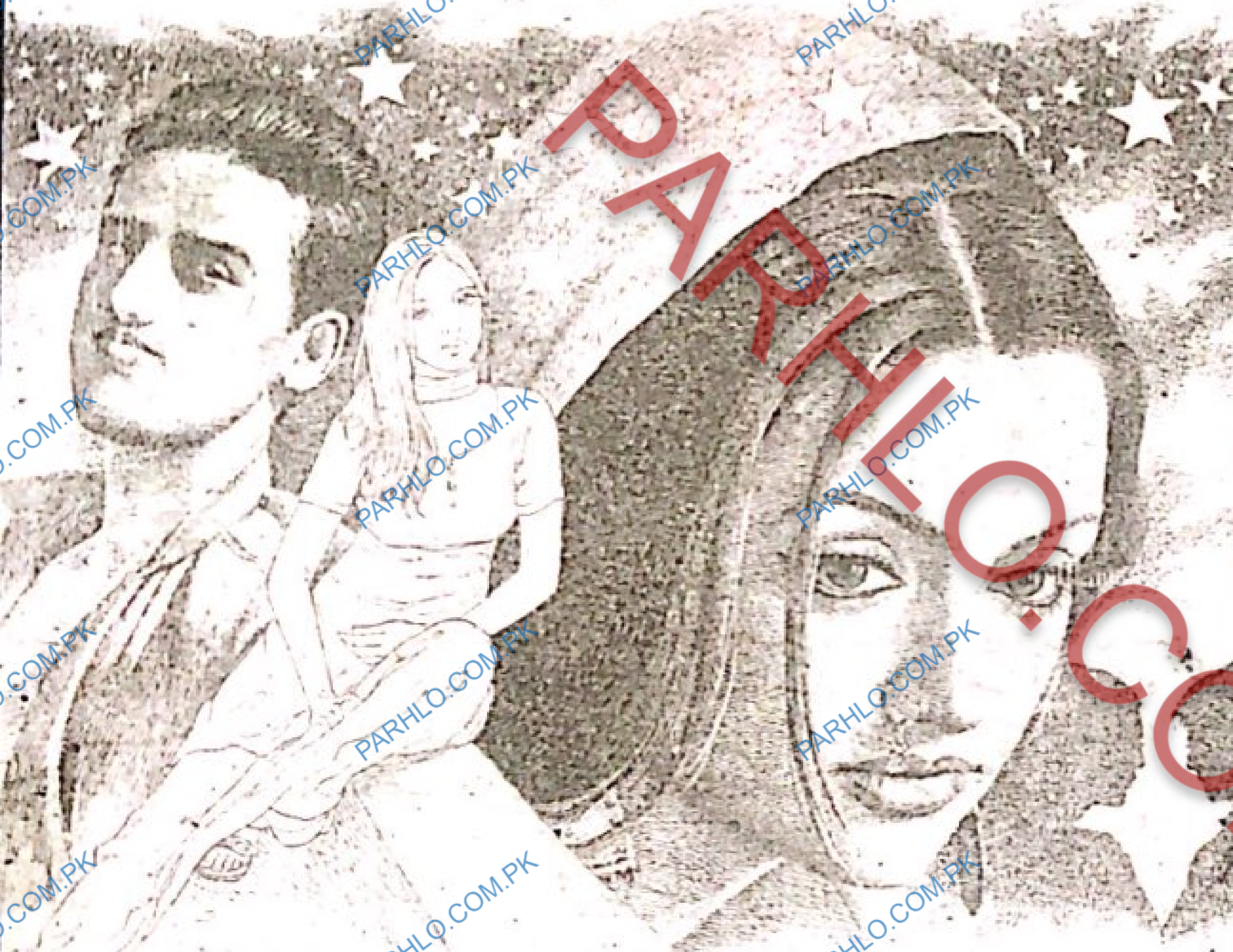
جھوک جیون کی ہر صبح گاؤں ماشکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے فجر کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روز انہ ہی گاموکی مشک کے پانی کی مہک اور مٹھاس کا انتظار کرتے ہیں۔ گامو دس سال سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی توکّلی ہے۔

گامو ماشکی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔ گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

تاجور کا حویلی میں پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے

ہیں تاجور کو کبھی کسی چیز کو منع نہ کرنا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے حویلی آتی ہے تو تاجور اس کے توتلے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں چرچے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ دری پر بیٹھ جاتا ہے۔ موتیا خواب میں دیکھتی ہے کہ ایک سانپ جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی



کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا گھبرا جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو کبھی حویلی لے کر نہیں جاتی۔ جس پر تاجور برا مانتی ہے۔ تاجور ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھٹیوں میں گاؤں آئی ہے۔ گاؤں کی ڈسپنسری میں بلا اجازت بیٹھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے۔ کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اندازے سے دوا دے رہی ہے۔

مراد بیرسٹر بن کر واپس اپنے ملک لوٹ آیا ہے۔ تاجور حویلی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔

موتیا اپنی سہیلی کی بارات دیکھنے اسٹیشن جاتی ہے۔ اسی ٹرین سے مراد بھی واپس آتا ہے۔ وہاں اس کی نظر موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔

بتول اور موتیا تانگے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گاموچوہدری مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے اب تک کوئی لینے نہیں آیا۔ بارش کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھیگ جاتا ہے۔ رات تک بخار میں جلنے لگتا ہے تاجور کو بالآخر موتیا کو بلانا ہی پڑتا ہے۔ تاجور اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انجکشن اور دوا دے کر گھر آجاتی ہے۔

مراد اپنی ماں کے ساتھ نانا سے ملنے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جاتی ہے۔ امرود کے باغ میں پہنچ کر موتیا امرود توڑ کر کھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف آرہا ہوتا ہے موتیا کو اس لمحے سانپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گھبرا کر زمین پر گھاس کو دیکھتی ہے۔ سانپ مراد کے قدموں کے قریب ہی رینگ رہا تھا۔ موتیا چیختی ہے اور گاموا پنی لاٹھی سے سانپ کو مار دیتا ہے۔

مراد، پیر ابراہیم اور چوہدری شجاعت گاموا اور اس کے خاندان کے بہت شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے مراد کی جان بچ گئی۔ مراد گامو کے گھر پھولوں کے ٹوکرے بھجواتا ہے۔

موتیا اپنی سہیلی بتول کو اپنے خواب کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ یہ سب خواب میں دیکھ چکی ہے لیکن وہ حیران ہے کہ سانپ نے کیوں نہیں کاٹا۔ بتول یہ باتیں شکوراں کو بتاتی ہے یہاں تک کہ مراد کے سینے پر دل کے مقام پر داغ کے بارے میں بھی، تاجور یہ سن کر حیران رہ جاتی ہے اور اسے موتیا کا کالا جادو قرار دیتی ہے۔ مراد ان دونوں کی باتیں سن کر دنگ رہ جاتا ہے اور بتول کے ذریعے موتیا کو ملنے کا پیغام بھجواتا ہے۔ مراد موتیا سے دن دہاڑے ملتا ہے اور کھل کر اپنی محبت کا اقرار اور شادی کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔ بتول ان دونوں کے عشق سے حسد کرنے لگتی ہے۔

تاجور، موتیا کو حویلی دانے صاف کروانے بلاتی ہے اللہ وسائی حجت کرتی ہے لیکن موتیا راضی ہو جاتی ہے۔ دانے صاف کرتے اس کی انگلی زخمی ہو جاتی ہے اور مراد اس پر اپنا رومال لپیٹتا ہے، تاجور یہ دیکھ کر جل جاتی ہے تب شکوراں ان دونوں کی ملاقات، محبت اور شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تاجور فوری فیصلہ کرتی ہے اور ماہ نور سے رشتہ طے کرنے پر پیر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ مراد پہلے ہی اپنے نانا سے موتیا کے رشتے کی بات کر چکا ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تاجور ایک ناگن کی مانند تلملا اٹھتی ہے۔

چھٹی قسط

سجناں ولوں خط آیا کیویں کھولاں دس
کدھرے ایہہ نہ لکھیا ہووے تیری میری بس

مراد نے بندوق چلانے کے لیے لبلبی دبانے کی کوشش کی تھی۔ وہ نہیں دبا۔ اُس کی نظر موتیا کی گردن پر رُک گئی تھی، جہاں اُس کی بندوق کی نال تھی۔ اُس کی دودھیا حسین صراحی دار گردن کے اس گڑھے میں وہ چند دن پہلے تک پانی بھی حلق سے گزرتے دیکھ لیتا تھا۔ اب اُسے گولی مار دیتا تو اُس کا اسی حلق سے ابلتا خون کیسے دیکھتا اور خون دیکھنے کی ہمت کر بھی لیتا تو اُسے تڑپتا کیسے دیکھتا۔ اور تڑپتا دیکھنے کے لیے دل پتھر کر بھی لیتا تو موتیا کو مرتا کیسے دیکھ لیتا۔

اُس کا دل چاہا، وہ بھی بھاگ جاتی بالکل سعید بزدل کی طرح، پر وہ تو بھاگی بھی نہیں تھی، وہیں کھڑی تھی، اُس کے سامنے...... وہ بے وفا تھی اور ڈھیٹ بھی تھی یا پھر اُس کو یہ گھمنڈ تھا کہ وہ اُسے مار نہیں سکتا۔ اگر وہ گھمنڈ تھا تو ٹھیک تھا۔

اُس نے گولی نہیں چلائی تھی، بندوق کی نال نیچے کر لی تھی۔ وہ نہ بھی کرتا تو بھی موتیا کو پتا تھا وہ اُسے مار نہیں سکتا تھا۔ پر اُس نے شک بھی کیسے کر لیا اُس پر۔ موتیا کو موت سے کہاں خوف آیا تھا، اُس "شک" نے لرزہ طاری کیا تھا اُس پر جو پیار کرنے والوں کے درمیان تو کبھی آتا ہی نہیں تھا۔

"جا موتیا! تجھے دل سے اُتار دیا میں نے۔"

مراد نے بندوق کی نال ہٹاتے ہوئے اُس سے کہا تھا اور کسی نے جیسے موتیا کے دل میں گولی ماری تھی۔

"ایک بار تو نے جان بچائی تھی میری، آج اسی کے طفیل جان بخش دی میں نے تیری۔ بس اب تو میری نہیں رہی۔ جا جس کے ساتھ جانا ہے جا۔ زندہ رہ کے مر جا میرے لیے۔" مراد رکا نہیں تھا، نہ اُس کا چہرہ دیکھنے کے لیے نہ اُس کا رونا اور بلکنا دیکھنے کے لیے، وہ بس پلٹا تھا اور تیز قدموں سے درختوں کے اُس جھنڈ سے نکل گیا تھا اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ مڑ کے بغیر سرپٹ گھوڑا بھگاتے حویلی کی طرف چلا گیا تھا اور موتیا وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

"جا موتیا! تجھے دل سے اُتار دیا میں نے۔"

اُس کا جملہ کسی گولی کی طرح بار بار اُس کے وجود کو آ کر لگ رہا تھا اور اُن لفظوں نے اُس کے پورے وجود کو چھلنی کر دیا تھا۔ جو پیار اُس نے مراد سے کیا تھا، ویسا تو کسی کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ دنوں، ہفتوں میں اندھا پیار...... ایسا پیار تو رب کے لیے ہوتا ہے۔ ہر کوئی بندہ رب کی تسبیح کرتے کرتے پیار کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے اور جب بندے کا کلمہ پڑھا جانے لگے تو پھر ٹھوکر تو لگتی ہے۔ موتیا کو بھی لگی تھی پر وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کیوں لگی تھی۔

"جو مجھے مار نہیں سکا، وہ مجھے چھوڑ کیسے سکتا ہے؟"

پتا نہیں کتنی دیر وہاں بُت بنے کھڑے رہنے کے بعد موتیا نے سانس لینے کی جیسے پہلی کوشش کی تھی اور سانس لینے کی اُس کوشش میں اُس کا پورا وجود بے حال ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ سانپ کہاں تھا جس نے خواب میں اُس کو کاٹنا تھا اور اُس نے مر جانا تھا۔ وہاں کھڑے کھڑے اُسے اپنا خواب یاد آیا اور وہ سانپ بھی اور وہاں درختوں کے جھنڈ میں نیم تاریکی میں اُس نے زمین پر کسی چیز کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ وہ آ جاتا اُسے ڈس لیتا وہ مر جاتی اور بس اُس کی تکلیف تو ختم ہو جاتی جو مراد کے ایک جملے نے اُسے دی تھی۔

چاند کی چاندنی بھی وہیں تھی۔ مہکتی، سرسرائی، ہوا میں بسی آم کے بور کی خوشبو بھی پر اب موتیا کو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جھنڈ سے اندھوں کی طرح چلتے ہوئے باہر آئی تھی۔ نہ اُس نے پگڈنڈی پر بکھری اُن چوڑیوں کو دیکھا تھا، نہ ہوا کی وجہ سے زمین پر اِدھر سے اُدھر جاتے اپنے دوپٹے کو جس کو اگلا کوئی جھونکا کھیتوں میں اُڑا کر پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچا دینے والا تھا۔

اُس نے سعید کو تلاش نہیں کیا تھا، اُس نے بتول کو بھی نہیں ڈھونڈا تھا۔ مراد کے علاوہ اس وقت اُسے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا اور مراد وہاں نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ جس وقت حویلی واپس پہنچا تھا، اُس وقت تاجور صحن والے برآمدے میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ مراد کو آتا دیکھ کر جیسے اُس کی جان میں جان آئی تھی۔ وہ گھوڑے کو باہر چھوڑ کر نہیں آیا تھا، اندر صحن میں لے آیا تھا۔ بندوق ہاتھ میں لیے وہ گھوڑے سے اُترا تھا۔ ماں سے نظریں ملائے بغیر وہ برآمدے میں کھڑی ماں کی طرف گیا تھا اور بندوق سمیت گھٹنوں کے بل اُس کے قدموں میں گر گیا تھا۔ تاجور کا دل ایک لمحے کے لیے پتے

کی طرح لرزا تھا۔ وہ کسی کو واقعی قتل نہ کر آیا ہو۔ اُس کو اندیشہ ہوا۔

''آپ جیت گئیں، میں ہار گیا امی ...... موتیا بے وفا نکلی ...... آپ ماہ نور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہیں میری، جب چاہیں کر دیں ...... موتیا مر گئی میرے لیے۔''

اُس نے تاجور کے پیر پکڑ کر کہا تھا اور تاجور کے جلتے وجود پہ جیسے ہفتوں بعد جیسے ٹھنڈا پھاہا رکھا تھا۔ اُسے یہ تو وہی مراد تھا ...... اُس کا پیارا، جان قربان کرنے والا نورِ نظر۔ بھٹک گیا تھا اور اب سیدھے راستے پر بھی آ گیا تھا۔ تاجور نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگایا تھا۔ اُس کا منہ اور ماتھا چوما تھا۔ چند گھنٹے پہلے جانے والے اور واپس آنے والے مراد کا چہرہ ایک جیسا نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے سے چمک اور خوشی غائب ہوئی تھی۔ پر کیا ہوا؟ وقت گزرنے کے ساتھ دل بہلے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چار دن کے پیار کا خمار گہرا ہوتا ہے، پر ابدی نہیں بندہ بھولنے پر آئے تو رب بھول جاتا ہے۔ یہ تو بس موتیا تھی۔ تاجور اُسے سینے سے لگائے اُسے تھپکتے اور خود کو تسلیاں دیتی رہی۔

اُس نے مراد سے اُس لمحے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ کچھ بتانے کے قابل نہیں تھا اور وہ اُسے یہ تکلیف دینا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اُس سے الگ ہوا، کچھ بھی کہے بغیر اندر چلا گیا۔ وہ بندوق تاجور کے پیروں میں پڑی ہوئی تھی جسے وہ چند گھنٹے پہلے غیظ و غضب میں لے کر گیا تھا وہ صرف پیار نہیں ہار کر آیا تھا، اپنی عزت، غیرت سب ہار آیا تھا۔ تاجور نے اُسے اُٹھا لیا۔

اُس نے اپنا بیٹا، اپنا غرور، گھر، فخر سب بچا لیا تھا پر پتا نہیں کیا بات تھی، موتیا کے لیے اُس کے دل میں بھڑکنے والی آگ اب بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی وہ اب بھی کچھ مانگ رہی تھی۔ کچھ اور زہر ...... کچھ اور حسد ...... نفرت ...... انتقام ...... کچھ تو۔

☆☆☆

''بتول! کیا تو باہر ہے؟''

صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھی بتول ماں کی آواز پر ہڑبڑا کر چونکی تھی۔ وہ کنویں سے واپس آ کر اندر کمرے میں نہیں گئی تھی، وہیں صحن میں چارپائی بچھا کر بیٹھ گئی تھی اور اب شاید شکوراں نیند میں جاگی تھی۔ اس سے پہلے کہ بتول وہیں سے اُسے آواز دیتی، شکوراں باہر نکل آئی تھی۔

''تجھے آوازیں دے دے کے پاگل ہوئی ہوں میں۔ کہاں تھی تو؟'' شکوراں نے جمائی لیتے ہوئے اپنی بیٹی کو دیکھا جو صحن کے بیچوں بیچ چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور اُس کے گلے میں اُس کا دوپٹہ تک نہیں تھا۔

''کہیں نہیں اماں، یہاں باہر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اندر دم گھٹ رہا تھا میرا۔''

بتول نے ماں سے کہا تھا اور چارپائی سے اُترنے لگی۔

''یہ باہر کا دروازہ کیوں کھلا ہے؟''

شکوراں نے پتا نہیں کیا وہم ہونے پر صحن کا دروازہ دیکھا تھا جو بھڑا ہوا تھا پر اُس کی زنجیر اُتری ہوئی تھی جو بتول لگانا بھول گئی تھی۔ اندر جاتی بتول ٹھٹکی تھی، پھر اُس نے وہیں کھڑے کھڑے ماں سے کہا۔

''تو چڑھانا بھول گئی ہو گی اماں ...... دروازہ تو تُو نے ہی بند کر لی ہے۔''

اُس نے سفید جھوٹ بولا تھا۔

''کوئی آیا تو نہیں تھا ...... سعید؟''

شکوراں نے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر اُس سے کہا۔

''وہ دن کو آنے سے پہلے دس بار سوچتا ہے تو رات کا کہہ رہی ہے۔'' بتول نے اُس ہی لہجے میں ماں سے

کہا۔

''تو تو کہیں نہیں گئی؟''

شکوراں کو اب بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں اس بار ماں کے سوال پر بتول کو کیا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اُس نے سوچا، وہ ماں کو سب بتا دے اور پھر اسی لمحہ میں اس نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

''اماں تو کیوں شک کرنے بیٹھ گئی ہے مجھ پر رات کے اس پہر ...... کہیں گئی ہوتی تو تجھے گھر ملتی ...... کہیں سے آئی ہوتی تو بھی آ کے صحن میں بیٹھی ہوتی۔ عجیب ہے تو بھی۔''

اُس نے جھلا کر شکوراں سے کہا تھا اور پھر جیسے اُس کی نظروں سے بچنے کے لیے وہاں سے چلی گئی تھی۔ شکوراں عجیب سی کیفیت میں وہاں کھڑی رہی تھی۔ چاند کی چاندنی اُس کے صحن میں دروازے سے چارپائی اور چارپائی سے اندر کمرے تک جاتے بتول کی چپل کے نشان دکھا رہی تھی۔

اُس کی چپل کنویں کے آس پاس کی نم زمین سے گزرنے کے بعد گاؤں کی گلیوں سے ہوتے ہوئے بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ لیپے ہوئے صاف ستھرے صحن میں وہ گیلے نشان جیسے چاند کو چشم دید گواہ بنا بیٹھے تھے اور اب وہ گواہ سارے بھید کھول رہا تھا۔

شکوراں پلکیں جھپکائے بغیر اُن نشانوں کو دیکھتی رہی، اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اُس کی جوان بیٹی بغیر دوپٹے کے رات کے پچھلے پہر کہیں سے ہو کر آئی تھی کہ ماں سے جھوٹ بولنا پڑ گیا تھا اُسے۔ شکوراں کی نیند اُڑ گئی تھی۔ جوان بیٹیوں کی ماؤں کی نیندیں بڑی کچی ہوتی ہیں۔ پتا نہیں وہ آج کیسے گہری نیند سو گئی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو کوسا اور وہ چلتی ہوئی اندر کمرے میں آ گئی تھی۔

اندر لالٹین کی روشنی میں اُس نے بتول کو اپنی چارپائی پر دوسری طرف منہ کیے لیٹا دیکھا تھا۔ وہ جیسے ماں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شکوراں اپنی چارپائی پر بیٹھ کر اُسے دیکھتی رہی۔

''اماں! لالٹین بجھا دے، مجھے روشنی میں نیند نہیں آ رہی۔''

اُس نے شکوراں سے اسی طرح منہ پھیرے ہوئے کہا تھا۔

''تیرا دوپٹہ کہاں ہے بتول؟''

بتول نے جواب میں شکوراں کو کہتے سنا اور وہ لیٹے لیٹے ساکت ہوئی تھی۔

''پتا نہیں ہو گا ادھر ہی کہیں، اب رات کے اس وقت دوپٹے ڈھونڈنے بیٹھوں میں؟''

بتول نے چند لمحوں کے بعد جھنجلا کر سیدھا ہوتے ہوئے اُس سے کہا اور پھر اُٹھ کر لالٹین بجھا کر دوبارہ آ کر لیٹ گئی تھی۔

شکوراں اسی طرح چارپائی پر بیٹھی رہی تھی۔ اُس کا دل ریل گاڑی بن گیا تھا، پتا نہیں کیا کیا ہونے لگا تھا اُسے۔

☆☆☆

''اب کیسی طبیعت ہے اُس کی؟''

اللہ وسائی نے موتیا کے انتظار میں دہلیز کے چکر کاٹتے کاٹتے رات گزاری تھی اور موتیا کو دیکھتے ہی اُس نے پوچھا تھا۔

''ہاں! اب ٹھیک ہے۔''

موتیا نے ماں سے نظریں ملائے بغیر گھر کے صحن میں آ کر وہاں پڑے گھڑے سے پیالے میں پانی ڈال کر پیا تھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" اللہ وسائی نے بے اختیار کہا۔
"میں صبح جاتی ہوں، جا کر پتا کرتی ہوں اُس کا۔"
موتیا نے ماں کی بات پر پانی پیتے پیتے چھوڑا۔
"نہیں اماں! اب صبح ہی نہ چل پڑیں...... ایسے ہی بتول پریشان ہو رہی تھی۔ وہ ٹھیک تھیں بس وہم کرتی ہیں۔"
اُس نے ماں کو روکا۔ اللہ وسائی نے بغور اُس کا چہرہ دیکھا۔
"تجھے کیا ہوا ہے؟ کیوں اتنا پانی پی رہی ہے؟" اُس نے موتیا کو غٹاغٹ ایک پیالہ پیتے ہی دوسرا پیالہ بھرتے دیکھ کر کہا۔
"پتا نہیں گرمی زیادہ ہے، اس لیے۔" موتیا نے پیالے سے ہی ایک اوک میں پانی لے کر چہرے پر چھینٹے مارتے ہوئے کہا۔
"تیری چوڑیاں کہاں ہیں موتیا؟" اللہ وسائی کو اُس کی خالی کلائیاں نظر آئی تھیں پھر اُس کے کندھوں پر بتول کا دوپٹہ۔ پانی پیتے ہوئے موتیا ٹھٹکی تھی۔
"بتول کے گھر اُتار کر رکھی تھیں اماں آتے ہوئے یاد ہی نہیں رہا۔"
اللہ وسائی نے عجیب بہت حیران ہو کر موتیا کا چہرہ دیکھا۔ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتی تھی اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کبھی موا اور اللہ وسائی اُس کے کہے پر بھروسا نہ کرتے، پر اللہ وسائی حیران ہوئی تھی۔ وہ چوڑیاں کیوں اُتارنے بیٹھ گئی تھی اور دوپٹہ...... اللہ وسائی نے کوئی اور سوال نہیں کیا تھا۔ اُس نے خود ہی سوچ لیا تھا کہ غلطی سے بتول کا دوپٹہ بھی اوڑھ کے آ گئی ہو گی وہ۔
"چل موتیا سو جا اب۔ تیرے لیے میں بھی بیٹھی رہی ہوں اب تک۔"
اللہ وسائی کہتے ہوئے اندر چلی گئی تھی اور موتیا وہیں گھڑے کے پاس پانی کا خالی پیالہ لیے بیٹھی رہی۔ پیالے کو تیسری بار پانی سے بھرتے ہوئے اُس نے پانی میں چاند لہراتے دیکھا تھا۔ وہ جیسے اُس کے پانی کے پیالے میں اُتر آیا تھا۔ موتیا پانی پی نہیں سکی، وہ بس ہلتے ہوئے پانی میں اُس چاند کو دیکھتی رہی۔
وہ بچپن سے اسی طرح چاند کو اپنے پیالے میں اُتار لیا کرتی تھی۔ وہ تتلیوں، جگنوؤں کے ساتھ ساتھ چاند بھی پکڑا کرتی تھی اور اب چاند اُس ہلتے ہوئے پانی میں ہلکورے لیتے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا اور اُس کی چاندنی جیسے مرہم بن کر اُس کے وجود کو لپیٹ گئی تھی، پر موتیا ویسے ہی درد سے بے سدھ تھی۔
وہ کیسے ایک پل میں یہ کہہ گیا تھا کہ اُس نے دل سے اُتار دیا، کوئی ایک بار دل کے تخت پر بٹھا کر اُتار کیسے سکتا ہے اور وہ بھی "میرا مراد"۔ اُس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ جیسے چاند سے پوچھا تھا، اور چاند گونگا ہو گیا تھا۔ بول سکتا تو اُسے دشمنوں کا بتاتا، پیٹھ میں چھرا گھونپنے والوں کا۔ پر چاند کو تو بس گواہ بننا آتا تھا، اُس سے زیادہ کچھ نہیں۔ موتیا کے بہتے آنسو اب پانی کے اُس پیالے میں گر رہے تھے۔ میٹھے پانی کو نمکین کر رہے تھے اور چاند کو نمکین۔
"میں اُسے منا لوں گی، دیکھنا۔ میں اُسے منا لوں گی۔" اُس نے چاند سے کہا تھا۔
"میری غلطی ہے، میں آدھی رات کو چل پڑی سعید کو سمجھانے۔ مراد نہیں کوئی بھی ہوتا تو شک کرتا۔ یہ سب [illegible] ڈال دیتا۔"
وہ چاند کو تاویلیں اور وضاحتیں دے رہی تھی [illegible] شکایت کرنے کے پھر خود ہی اُس کا دفاع [illegible]

تھی۔ چاند چپ سنتا رہا۔ ایسے قصے، ایسی کہانیاں، ایسی باتیں، ایسے فسانے اُس نے صدیوں سے سُنے اور دیکھے تھے اور صدیوں تک دیکھنے تھے۔ پھر بھی وہ جیسے موتیا کی ہم جولی بن بیٹھا تھا۔ یہ پوچھنے کے بجائے کہ مراد دنیا کیسے بن بیٹھا تھا، وہ اُس کے آنسو پی رہا تھا۔
اتنے سالوں میں اُس نے حسن کو بس روتے ہی دیکھا تھا اور عشق کو ہمیشہ خالی ہاتھ...... یہ تو بس موتیا تھی جو اُس کو اپنے ہاتھوں میں اُتار لیتی تھی اور وہ اُتر آتا تھا۔ وہ اُس کے ہاتھوں میں چاند نہیں اُس کا چکور بن جاتا تھا۔

☆☆☆

چاند نے رات کے اُس پہر مراد کی حویلی میں تاجور اور مراد کو بھی دیکھا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ تاجور کی کھلی کھڑکی سے چاند نے جھانک کر اُسے اپنے بستر پر پرسکون گہری نیند میں دیکھا۔ غرور دل توڑ کر ہمیشہ گہری نیند سوتا ہے۔
مراد اپنے بستر پر ٹانگیں زمین پر لٹکائے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چاندنی کھلی کھڑکی کی سلاخوں سے اُس کے کمرے میں بھی اُتر آئی تھی۔ وہ غم زدہ عاشق تھا۔ شک کر بیٹھا تھا اور اب اپنے دل کی کرچیاں لیے بیٹھا تھا جو جڑنے پر تیار ہی نہیں تھا۔ چاند حسن کا حال دیکھ آیا تھا، اب عشق کا عالم دیکھنے آیا تھا۔

ٹھیں لگدا وقت وچھوڑے دا
بن یار گزارا کون کرے
دُنیا توں کنارہ ہو سکدا
یاراں تو کنارہ کون کرے
اِک دن ہووے
دے لنگ جاوے بیلیا
ساری عمر گزارا کون کرے

وہاں بیٹھے بیٹھے مراد نے موتیا کو اپنی زندگی کے ہر صفحہ سے مٹانا شروع کر رکھا تھا اور صفحے تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ کھڑکی سے آتی چاندنی میں ڈوبا وہ غم کے مہیب اندھیروں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ موتیا بے وفا تھی اور اُس نے اُسے چھوڑ کر جینا تھا اور بس۔ یہ آخر کے دو لفظوں نے سارا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا...... جینا تھا...... پر کیسے...... مرنا ہوتا تو آسان تھا۔ وہ اسی بندوق سے جان لے لیتا جس کی نالی اُس کی شہ رگ پر رکھ کر وہ گولی نہیں چلا سکا تھا۔ یا اسی کنویں میں کود کر مر جاتا جہاں وہ پہلی بار موتیا سے ملا تھا۔ یا اُس ریل گاڑی کے آگے کود جاتا جس سے اُترتے ہوئے اُس نے موتیا کو پہلی بار دیکھا تھا۔
مرنے کے سو طریقے تھے پر اُس کے بغیر جینے کا کوئی ایک بھی طریقہ نہیں تھا...... اور زندگی لمبی تھی...... کم از کم وہاں بیٹھے اُسے لگ رہی تھی۔ وہ اب بس اُسے بھولنا چاہتا تھا اور بس بھولنا چاہتا تھا اور بھولنے کے ایک ایک حرف پر وہ اُس کے دل میں کبھی جاتی تھی، جونک کی طرح۔ وہ بے رحمی سے کھینچتا، وہ اُس کے وجود کو لہولہان کرتی الگ ہوتی کسی اور جگہ چپک جاتی۔ وہ کوئی بے بس کمزور مرد ہوتا تو بلک بلک کر روتا پھر اُسے معاف کر کے دوبارہ اُس کے سنگ ہو لیتا۔ پر وہ انا پرست مرد تھا جس کی رگوں میں تاجور کا خون دوڑتا تھا۔ وہ موتیا کے لیے ماں سے جنگ کر سکتا تھا تو موتیا کے لیے دل بھی مار سکتا تھا۔ پر وہ مرا ہوا دل پھر بھی اُس کے وجود میں آہیں بھر بھر کے گرلا رہا تھا۔
اُسے بتا رہا تھا کہ پیار ایسے نہیں مرتا خود اپنے ہاتھوں...... یہ کبھی خودکشی نہیں کرتا...... اُسے مارنے کے لیے [illegible]

مراد بے حال بیٹھا تھا اور چاند کو اُس پر بھی ترس آیا تھا۔ حسن اور عشق کو فنا ہے، پر اُن کی کہانی لافانی رہ جاتی ہے۔ حسن عشق کی بے نیازی اور کج ادائی نہیں سہ سکتا، عشق حسن کی بے وفائی برداشت نہیں کر سکتا۔ پر پھر بھی جب جب دونوں سامنے آتے بے اختیار ہوتے۔ دور ہوتے تو بھی ایک دوسرے کی یادوں کا طواف کرتے۔ بچھڑ جاتے تو قصے، کہانیاں، داستانیں چھوڑ جاتے۔

پر یہ کبھی نہیں ہوا کہ حسن اور عشق ایک دوسرے کو بھول جاتے۔ اور اب یہ بیڑہ مراد نے اُٹھایا تھا۔ ناممکن کو ممکن کرنے کا۔ چاند کو اُس پر ترس آیا۔ وہ گونگا نہ ہوتا تو اُس سے کہتا کہ موتیا کو دل کے تخت سے اُتارے گا تو پھر تخت خالی رہے گا کسی دوسرے کو بٹھانے کے لیے۔ پر چاند تو گونگا تھا۔ موتیا کے لیے وہ چکور بن جاتا تھا، مراد کے لیے چور۔

☆☆☆

"تو اتنی صبح کیسے آ گئی موتیا؟" بتول نے پیڑا بناتے ہوئے اپنی ماں کو دروازے پر کہتے سنا اور پیڑا بناتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپائے تھے۔

"وہ بتول سے کچھ ضروری کام تھا۔ وہ گھر پر ہے نا؟" اُس نے موتیا کا اگلا جملہ بھی سنا تھا اور اس کا دل چاہا تھا اس کی ماں کوئی بہانہ بنا دے کہہ دے کہ وہ گھر پر نہیں تھی۔

"ہاں ہاں اندر ہی ہے تو دروازہ بند کر لے میں حویلی کے لیے نکل رہی ہوں۔" شکوراں نے موتیا سے کہا تھا۔

"[illegible]! یہ مراد کو دینا۔" شکوراں نے حیران ہو کر موتیے کے پھولوں کا وہ ہار دیکھا، جو موتیا اُسے پکڑا رہی تھی پھر اس نے پلٹ کر موتیا کا چہرہ اور اس کی سرخ آنکھیں دیکھیں۔

"دے تو دوں گی پر یہ تیری آنکھیں کیوں سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔" شکوراں نے اُس سے کہا۔

"ہاں۔ بس وہ میں اور بتول کل رات گئے کنویں پر بیٹھی رہیں تو پھر گھر آ کر بھی نیند نہیں آئی۔" موتیا نے شکوراں سے نظریں چرائی تھیں اور شکوراں کا دل جیسے اُس نے کسی بوجھ سے ہلکا کیا تھا۔

"تو بھلا تیرے ساتھ کنویں پر جاتا تھا تو بتا دیتی۔ ایسے چھپاتی کیوں رہی مجھ سے۔" شکوراں ہنستے ہوئے نکل گئی۔

اسے اپنی بیٹی کی "معصومیت" پر یک دم ہی جیسے پیار آیا تھا۔ پر اسے دیر ہو رہی تھی اور وہ واپس اندر جا کر بتول سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

بتول نے اندر توے پر روٹی ڈالتے ہوئے دروازے پر ان دونوں کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی، وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو موتیا کے سوالوں کے لیے تیار کر رہی تھی۔ کنویں سے رات کو غصے میں چلے جانے کا سبب ہو جانے کا جواز ڈھونڈ رہی تھی اور چوہدری مراد کے یوں اچانک وہاں آ جانے کی تاویلیں اور اس سب کے درمیان موتیا کب آ کر پیڑھی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گئی تھی، اُسے احساس ہی نہیں ہوا۔

احساس تب ہوا جب اس کے بجائے توے پر روٹی کو موتیا نے پلٹا تھا۔ بتول دوسرا پیڑا بنا رہی تھی۔ بتول نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ اُس نے موتیا کو اس حال میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں یوں جیسے وہ ساری رات روتی اور جاگتی رہی تھی۔

بتول کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے پہلے سوال کے لیے تیار کرنے لگی پر سوال وہ نہیں آیا تھا جو اس نے سوچا تھا۔

"سن بتول! مجھے مراد سے ملنا ہے۔ اُسے کہہ وہ مجھ سے ملے...... کہیں آ جائے ورنہ میں حویلی آ جاؤں گی۔" نہ کوئی سوال، نہ شکایت، نہ طعنہ...... موتیا نے سیدھا آتے ہی اس سے مطالبہ کیا تھا۔

"خیر تو ہے بیٹھے بٹھائے چوہدری مراد سے کیوں ملنا ہے؟ اب تو شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو ایک بار ہی ملنا اب تو۔" بتول نے انجان بننے کا فیصلہ کرتے ہوئے چمٹا اُٹھا کر روٹی کو توے سے اتار کر لکڑیوں پر سینکنا شروع کیا تھا۔

"وہ رات کو وہاں آ گیا تھا۔ اس نے مجھے سعید کے ساتھ دیکھا اور وہ غصے میں آ گیا۔ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا وہ بندوق سے پر پھر مجھے یہ کہہ کر چھوڑ گیا کہ اس نے اپنے دل سے مجھے نکال دیا۔"

وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ بتول کو وہ سب کچھ بتا رہی تھی اور بتول سنتی ہی جا رہی تھی۔

"بس اس سے کہہ وہ مجھ سے ایک بار ملے اور اس کی غلط فہمی دور کر دو، اسے بتاؤ کہ تم بھی وہاں اور سعید میں تمہارے کہنے پر ملنے گئی تھی کچھ اور بات نہیں تھی۔"

"ہاں ہاں۔ میں ابھی جاتی ہوں تھوڑی دیر میں۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ کیا ہوا وہاں۔ نہ میں نے مراد کو آتے دیکھا نہ تمہیں جاتے۔ میں تو بس تمہارا انتظار کر کے پھر آ گئی وہاں سے۔" بتول نے گڑبڑا کر اس سے کہا تھا اور ساتھ ہی اپنی وضاحت بھی دے دی۔

"اور تجھے تو ابھی تک سعید نے آ کے کچھ نہیں بتایا۔ پر تم فکر نہ کرو، میں جاتی ہوں ابھی حویلی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بتول نے گڑبڑاتے ہوئے نظریں ملائے بغیر جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے مر جانا ہے بتول! اگر وہ اسی طرح روٹھا رہا تو۔" بتول کے ہاتھ پکڑتے ہوئے وہ بلک بلک کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہے موتیا! کچھ نہیں ہوگا۔ بس میں جا رہی ہوں حویلی سہ پہر کو آتی ہوں تو خوش خبری لاؤں گی تیرے لیے۔" بتول نے اس کے آنسو پونچھے تھے اور پھر روٹی کا ایک لقمہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"چل روٹی، مکھن اور ساگ کھاتے ہیں اماں گھوٹ کے گئی ہے اور تجھے پسند بھی ہے اماں کے ہاتھ کا ساگ۔" اس نے جیسے موتیا کا ذہن بٹانے کی کوشش کی تھی پر موتیا نے لقمہ منہ سے نکال کر رکھ دیا تھا۔

"بھوک مر گئی ہے میری بتول...... جب تک مراد ناراض رہے گا۔ میں ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتی۔"

اس نے اپنا سر پیڑھی پر بیٹھے ہوئے اپنے دونوں گھٹنوں میں گھسا لیا تھا۔ بتول کو روٹی پر پگھلتے مکھن کی طرح اپنا آپ بھی پگھلتا لگا۔ بھوک صرف موتیا کی ہی نہیں اس کی بھی اڑ گئی تھی۔ وہ حویلی جاتی تو واپس آ کر موتیا سے کیا کہتی۔ مگر حویلی جانے سے پہلے اسے گاؤں میں کسی پیر کے مزار پر لگے درخت کی شاخ سے وہ دھاگہ کھولنا تھا جو اس نے منت کے طور پر باندھا تھا کہ سعید کو کچھ نہ ہو، وہ چوہدری مراد کے ہاتھ سے بچ جائے۔ اور وہ بچ گیا تھا۔ بتول کو ساری عمر اپنی دعاؤں پر یقین نہیں آیا تھا اور اب یک دم ہی اس کی دعائیں قبول ہونے لگی تھیں۔ وہ پہلا دھاگہ تھا جو اس نے کھولنا تھا اور آخری دھاگہ بھی جو اس نے باندھا تھا۔

☆......☆......☆

"میں نے رات بڑا گندا خواب دیکھا ہے اللہ وسائی! یہ موتیا کہاں ہے؟" گامو نے صبح سویرے کنویں سے واپس آتے ہی بڑی فکرمندی سے بیوی سے کہا تھا، جو روز کی طرح اس کے لیے ناشتہ بنانے بیٹھی ہوئی تھی اور اب اس کی بات سنتے ہی فکرمند لگنے لگی تھی۔

"تو نے آج کل میری طرح الٹے سیدھے خواب دیکھنا شروع کر دیے ہیں۔" اللہ وسائی نے پاس بیٹھتے ہوئے گامو سے کہا اور اس کے جملے پر وہ چونکا تھا۔

"تو نے بھی کوئی خواب دیکھ لیا؟"
"دفع کر ایسے خوابوں کو، تو بتا تو نے کیا دیکھا۔" اللہ وسائی نے اسے کریدا تھا۔
"کچھ یاد نہیں بس یہ یاد ہے کہ جو بھی تھا موتیا کے بارے میں تھا اور موتیا پریشان ہے۔" گامو نے بات جیسے گول کرتے ہوئے کہا اور پھر ساتھ ہی اس نے موتیا کو آواز دی۔
"بتول کی طرف گئی ہے۔ اس کا دوپٹہ دیا تھا ادھر۔" اللہ وسائی نے بتایا اور ساتھ ہی فکر مند ہو گئی۔
"اب پھرنے نہیں جانے دیا کر اُسے۔ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں شادی میں۔" گامو نے چنگیر اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔
"ہاں میں نے بھی سوچا ہے بس آج مایوں بٹھا دینا ہے اُسے۔ ویسے اس کو تو گھر بٹھانا مشکل ہو گیا ہے اس بار۔ ہر وقت بتول بتول کرتی رہتی ہے۔" اللہ وسائی نے کہا۔
"آج صدقہ بھی دے رہی ہوں اس کا، نظر بھی تو لگ جاتی ہے ناں۔ یاد ہے جب ڈاکٹری میں داخلہ ہوا تھا تب بھی بیمار ہو گئی تھی۔" گامو کو یاد آ رہا تھا۔ وہ باپ تھا۔ بیٹی کے بارے میں آنے والے کسی برے خواب پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"ہاں ہاں مجھے کیوں یاد نہیں ہو گا گامو! کہاں کہاں لے کر پھرے تھے اُسے، پھر پیر صاحب نے دعا کی تھی تب ہی آرام آیا اور اب دیکھو...... کیسا نصیب ہے میری دھی کا کہ ان ہی پیر صاحب کے خاندان کا حصہ بن جائے گی۔" اللہ وسائی کی بات کرتے کرتے آواز بھر آئی۔
"جھلی ہو گئی ہے۔ کیوں صبح صبح بدشگونی کرنے بیٹھ گئی ہے۔" گامو نے اسے ڈانٹا۔
"تیرا دل پتھر کا ہو گیا ہے گامو! تو سوچتا نہیں کہ وہ چلی جائے گی تو گھر کتنا سونا ہو جائے گا ہمارا۔" اللہ وسائی نے جیسے اس کو طعنہ دیا۔
"میں نہیں سوچتا کچھ بھی اللہ وسائی! سوچنے بیٹھوں گا تو کھانا پینا ہی چھوٹ جائے گا میرا تو۔ دھی ہوتی ہی پرایا دھن ہے۔ جتنے سال ہمارا آنگن مہکایا، مہکایا اب اگلوں کے گھر کی بہار بنے گی۔" گامو کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔
"میں تو بس ہنستا بستا دیکھ لوں اُسے پھر تو چاہے بلاوا آ جائے۔" اللہ وسائی نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں۔ گامو جیسے تڑپ اٹھا۔
"دھی کی پروا ہے تجھے اور میرا دھیان نہیں۔ مجھے کون دیکھے گا۔" اللہ وسائی روتے روتے ہنسی۔
"ارے کر لینا تو دوسری شادی بلکہ موتیا کو کہہ کے جاؤں گی میں کہ......" وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ گامو نے چنگیر پیچھے کر دی تھی۔
"اچھا اچھا ناراض نہ ہو صبح سویرے، چل سو سال زندہ رہنے کی دعا کروں گی۔ موتیا کے بچوں کی شادی دیکھ کے جاؤں گی وہ بھی تیرے جانے کے بعد۔" گامو کو ناراض ہوتے ہوتے ہنسی آ گئی۔
"چل کھا کھانا۔ عورتوں کی طرح روٹھ روٹھ کے بیٹھتا ہے صبح سویرے۔" اللہ وسائی نے اُسے بہلاتے ہوئے لسی کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔

☆☆☆

"تم کہیں جا رہی ہو؟"
چوہدری شجاع نے حویلی کے صحن میں کھڑی بگھی کو دیکھ کر اندر آتے ہوئے کچھ حیرانی سے تاجور سے پوچھا تھا جو [illegible]

تاجور نے ایک بے حد معنی خیز گہری مسکراہٹ کے ساتھ شوہر کو دیکھا اور کہا۔
"ہاں بابا جان کے پاس...... ماہ نور کا رشتہ مانگنے۔ آپ کے کپڑے بھی نکال دیے ہیں ملازم نے۔ آپ بھی تیار ہو جائیں۔"
چوہدری شجاع کو لگا۔ تاجور کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔
"تم ہوش میں تو ہو۔ تمہیں بتا نہیں دیا میں نے کہ گامو کو زبان اور تاریخ دے آیا ہوں میں اور یہی تمہارے بیٹے کی بھی مرضی ہے۔"
اس نے بڑی ناراضی سے جیسے بیوی کو یاد دلایا۔ تاجور نے بڑے اطمینان سے جھمکے پہنتے ہوئے کہا۔
"چوہدری صاحب! مرضی بدل گئی ہے آپ کے بیٹے کی۔ وہ اب نہیں کرے گا موتیا سے شادی، چاہے آپ نے زبان دی ہو یا نہیں۔"
چوہدری شجاع ہکا بکا بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی اور سوال کرتا، مراد اندر آیا تھا۔
"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ابو۔ موتیا سے شادی نہیں کرنی میں نے۔"
"کیوں؟...... تم نے مذاق بنا رکھا ہے۔ ایک دن ایک بات کرتے ہو اگلے دن دوسری۔ میں کیا کہوں گا گامو کو۔" چوہدری شجاع اس پر غضب ناک ہوا تھا۔
"آپ کو کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ میں نے خود موتیا کو بتا دیا ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ آپ کو اب گامو کے سامنے سر نیچا نہیں کرنا پڑے گا۔" مراد کہہ کر کمرے سے چلا گیا تھا۔
"چلیں چوہدری صاحب! اب لمبی سوچوں میں نہ پڑیں۔ بیٹے کی طرح فیصلے کیا کریں فٹافٹ...... اسی تاریخ کو ماہ نور کو بیاہ کر لے آؤں گی اپنے مراد کی دلہن بنا کر جس تاریخ کو موتیا کو بیاہنے جانا تھا۔" تاجور نے عجیب انداز میں جیسے مذاق اڑاتے ہوئے شوہر سے کہا تھا جو صرف اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔
"اور اگر گامو میرے پاس آ گیا تو۔" اس نے جیسے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔
"وہ نہیں آئے گا چوہدری صاحب! بیٹی بتا دے گی باپ کو کہ اس کے کن کرتوتوں کا پتا چل گیا ہے ہمیں اور گامو تو پھر منہ چھپاتا پھرے گا آپ سے۔ اب تفصیل سننے نہ بیٹھ جائیں آپ! واپس پر بیٹے سے پوچھ لیں سب کچھ۔ جس نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اسے۔ مجھے تو کچھ بتایا ہی نہیں اس نے۔" تاجور نے بڑی بے نیازی سے کہا اور کمرے سے نکل گئی اور چوہدری شجاع کچھ اور پریشان ہو گیا۔

☆☆☆

"چوہدری صاحب! یہ پھولوں کا ہار موتیا نے بھیجا ہے۔ صبح آئی تھی میری طرف، میں حویلی کے لیے نکل رہی تھی تو اس نے کہا کہ آپ کو یہ دے دوں۔" شکوراں نے ایک رومال میں لپٹے ہوئے موتیے کے پھولوں کے اس ہار کو دینے کے لیے چوہدری مراد کو اپنے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر روکا تھا۔ اس کا خیال تھا، مراد کا چہرہ کھل اٹھے گا پر ایسا نہیں ہوا تھا۔
"اسے باہر پھینک دو۔ مجھے موتیا اچھا نہیں لگتا اب۔" وہ کہہ کر تیزی سے اندر چلا گیا تھا اور شکوراں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ چوہدری مراد کو موتیا پسند تھا یہ سب کو پتا تھا اور اب موتیا کے ہاتھوں سے گندھا ہوا موتیا کا ہار پھینکنے کو کہہ رہے تھے وہ بھی جب ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شکوراں کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
"سن شکوراں! سعید کا باپ آئے گا آج تیری طرف بتول کا رشتہ مانگنے۔ ہاں کر دینا اور رواج کی کوئی بات [illegible]

جانے کے لیے نکل رہی تھی پر تاجور کی بات پر جیسے اُسے شادیِ مرگ ہو گیا تھا۔ وہ موتیا اور اس کے پھولوں کو بھی بھول گئی تھی اور مراد کے ردِعمل کو بھی۔

"چوہدرائن جی......" فرطِ جذبات سے اس کے منہ سے کوئی جملہ ہی نہیں نکل رہا تھا۔ وہ بس رونے لگی تھی۔

"اچھا...... اچھا بس کر اور یہ دے موتیا کا ہار مجھے، میں کلائی میں ڈال لوں۔" تاجور نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے وہ ہار لیا تھا اور اسے اپنی کلائی میں سوچے سمجھے بغیر ڈال لیا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔ اس کے پاؤں خوشی کے مارے آج جیسے زمین پر پڑ ہی نہیں رہے تھے۔ نوکروں نے بھی بڑے دنوں بعد تاجور کو اتنا خوش دیکھا تھا۔

"سہ پہر تک آ جاؤں گی میں واپس اور ان شاءاللہ آ کر اچھی خبر سناؤں گی سب کو۔" اس نے جاتے جاتے شکوراں سے کہا تھا اور شکوراں نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ وہ بس تکتے ہوئے اس کے پیچھے اس کو بگھی تک چھوڑنے گئی تھی جس میں چوہدری شجاع پہلے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

☆☆☆

"ابا جان! آپ کو مجھ پر نہیں اپنے داماد پر تو بھروسہ ہے نا۔ ان سے پوچھ لیں مراد نے خود انکار کیا ہے یا میرے کہنے پر۔"

تاجور نے پیر ابراہیم کے پاس آ کر ماہ نور کے رشتے کی بات کا آغاز کیا تھا اور پیر ابراہیم یہ ماننے پر تیار نہیں ہو رہے تھے کہ موتیا کے کردار میں کوئی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے مراد نے انکار کیا ہوگا۔ وہ خود گاموں سے بات کرنا چاہتے تھے مگر تاجور اور ان کا بیٹا یحییٰ جیسے ان کی اس ضد پر جھلا گئے تھے اور بالآخر چوہدری شجاع نے مداخلت کی تھی۔

"تاجور ٹھیک کہہ رہی ہے ابا جان! مراد اب موتیا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اکیلے میں ایک بار پھر اس سے بات کی ہے۔ لیکن وہ نہ ٹھیک سے وجہ بتا رہا ہے نہ ہی موتیا سے شادی پر تیار ہے۔ اب ایسی صورتِ حال میں گاموں سے بات کرنا بے کار ہے۔" چوہدری شجاع کی بات پر پیر ابراہیم کچھ نرم پڑے تھے مگر ان کی بے یقینی اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

"یہی تو ابا جان...... اگر مراد نہیں مان رہا تو ہم کیوں زبردستی کریں؟ اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ آپ ماہ نور کے لیے رشتہ لے کر جائیں، یہ صرف میری خواہش نہیں ہے۔" تاجور نے باپ کو کمزور پڑتے دیکھ کر کہا۔

"اور موتیا بھی ڈاکٹر بن رہی ہے، وہ بھی کسی اونچے خاندان پر ہی ہاتھ مارے گی جیسے اس نے پہلے مارنے کی کوشش کی ہے ابا جان۔ کوئی میرے مراد کے لیے جوگ تھوڑی لے لینا ہے اس نے۔" تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

"آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں ابا جان! میری اپنی بھی یہی مرضی ہے کہ ماہ نور اور مراد کی شادی ہو۔ خود ماہ نور بھی بہت پسند کرتی ہے مراد کو۔ اگر موتیا والا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تو آپ سے بات کرتا کہ میری بیٹی کی یہ خواہش ہے کہ آپ آپا سے بات کریں۔" یحییٰ نے اب جیسے محاذ خود سنبھال لیا تھا۔ تسبیح کے دانے گراتے پیر ابراہیم ان سب کی باتیں سنتے رہے۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اور جب سب اپنی اپنی باتیں کر کے تھک کر خاموش ہو گئے تو انہوں نے کہا۔

"بڑی مشقت ہے ماہ نور کے نصیب میں یہاں شادی ہوئی تو......" اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ کہتا، تاجور بولی تھی۔

"دعا دیجیے ابا جان! بددعا نہیں۔"

پیر ابراہیم نے تاجور کا چہرہ دیکھا اور پھر سر ہلا دیا تھا۔ تاجور کا چہرہ کھل اٹھا۔

"جو رب کی مرضی...... جو اس کے فیصلے۔" انہوں نے مدھم آواز میں انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہا تھا۔

باہر برآمدے میں دروازے کے ساتھ لگی ماہ نور کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی کلائی میں مہکتا وہ موتیا کے پھولوں کا ہار سونگھا تھا جو تاجور نے وہاں آتے ہی اپنی کلائی سے اتار کر اس کی کلائی میں پہنا دیا تھا۔

☆☆☆

بتول نے اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ان نوٹوں کو بے یقینی کے عالم میں دیکھا تھا۔ جو سعید کا باپ شگن کے طور پر اس کے ہاتھ پر رکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی آئے تھے اور مٹھائی کے ساتھ وہ سعید کے لیے اس کا رشتہ طے کر کے چلے گئے تھے اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی۔ وہ اسی دن بیاہی جانے والی تھی جس دن موتیا کی بارات آنی تھی۔

"پتا نہیں بتول! کیا معجزہ ہوا ہے صبح سویرے کیسے چوہدرائن نے سعید کے باپ کو اس طرح تاریخ طے کرنے بھیج دیا۔" شکوراں تھوڑی دیر پہلے ہی حویلی سے آئی تھی۔ وہ جیسے خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔

"میں تو اب جلیبیاں بنوا کے پورے گاؤں میں بانٹوں گی اور دیکھ تو بھی اب ادھر ادھر جانا چھوڑ دے بس چار دن ہی تو رہ گئے ہیں تیری بارات میں۔"

شکوراں بات کرتے کرتے کئی بار بے دم ہوئی۔ اسے ابھی سے کاموں کا سوچ سوچ کر فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ یہ تو شکر ہے کہ داج کی ساری ذمہ داری تاجور نے اٹھائی تھی اور شکوراں کو اس کی فکر نہیں رہی تھی۔

"ارے تجھے ایک بات تو بتانا تو بھول ہی گئی۔ چوہدری مراد نے مجھے کہا کہ موتیا نے جو ہار بھیجا ہے وہ پھینک دو۔" شکوراں کو یک دم جیسے وہ بات یاد آئی جو وہ صبح سے بتول کو بتانے کا سوچ رہی تھی۔ بتول کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا۔

"اور بتول! آج چوہدرائن جی جب اپنے میکے سے ہو کر آئی ہیں تو بڑا کچھ ساتھ لے کر آئی ہیں۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگا کہ وہ کہیں چوہدری مراد کا رشتہ نہ طے کر آئی ہوں حالانکہ انہوں نے بتایا نہیں اور یہاں گاؤں میں ہر طرف چوہدری مراد اور موتیا کی شادی کی بات ہے سب کی زبان پر۔ لیکن اتنے دنوں میں کوئی تیاری نہیں شروع ہوئی حویلی میں۔ آج چوہدرائن جی اپنے میکے سے آئی ہیں تو آتے ہی انہوں نے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ تو ذرا موتیا کو کرید تو یہ چکر کیا ہے۔" شکوراں نے اس سے کہا تھا۔

"اماں! چوہدری شجاع نے اگر چاچا گاموں کو زبان دی ہے تو وہ نہیں پھریں گے۔ اور میں کیا پوچھوں موتیا سے؟ تیاری ہو رہی ہے اس کے گھر بھی۔ اور یہ پھول پھینکنے والی بات موتیا سے نہ کرنا۔ سو لڑائیاں ہو جاتی ہیں دو پیار کرنے والوں کی۔ میری اور سعید کی بھی تو ہوتی رہتی ہے لڑائی۔" بتول نے بڑے اطمینان سے ماں کو سمجھایا تھا اور شکوراں کو جیسے اس کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے تو، میں تو خوامخواہ ہی وہم اور شک کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ چوہدری صاحب نے زبان دی ہے تو کہاں پھرنا ہے انہوں نے اپنی زبان سے۔"

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں کوئی اور بات ہوتی موتیا دروازے پر دستک دے کر اندر آ گئی تھی۔ بتول کو اس کا پہلے ہی انتظار تھا۔ سہ پہر ہو رہی تھی اور وہ سہ پہر کے انتظار میں ہی بیٹھی رہی ہو گی جب بتول حویلی سے لوٹتی اور مراد کا جواب لے کر آتی۔

"ارے خالہ! یہ مٹھائی وغیرہ کہاں سے آ گئی۔" موتیا پھل اور مٹھائی دیکھ کر جیسے کچھ حیران ہوئی تھی۔

"لے تو کھا تیری سہیلی کی بھی تاریخ طے ہوگئی سعید کے ساتھ۔" شکوراں نے خوشی سے بے حال خود ہی ایک لڈو نکال کر اس کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی تھی اور موتیا بھونچکارہ گئی تھی۔ بتول شرمانے لگی تھی۔

"خالہ! آپ سچ کہہ رہی ہیں؟ مذاق تو نہیں کر رہیں میرے ساتھ۔" وہ یک دم بہت ہی خوش ہوگئی تھی۔

"اپنی سہیلی سے پوچھ...... سچ ہے کہ جھوٹ میں تو ذرا حلوائی کی طرف جارہی ہوں۔ جلیبیاں بانٹنی ہیں گاؤں میں۔" شکوراں اٹھ کر ہنستے ہوئے کھڑی ہوئی تھی اور موتیا بتول سے لپٹ گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا تجھ سے بتول! تیری شادی سعید سے ہی ہونی ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا خواب میں۔"

بتول اس کے ساتھ ہنستی رہی مگر وہ اب بھی اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ رشتہ دوستی کی قیمت پر ہوا تھا۔ کوئی بتول کے اندر اب بھی پکار پکار کر کہہ رہا تھا پر بتول مجبور تھی۔ یہ دل بڑا کمینہ ہوتا ہے۔

"تو مراد سے ملی آج......؟ اس نے کیا کہا؟ اور اب تو جب اسے تیری اور سعید کی شادی کا پتا چلے گا تو سارے شکوے شکایتیں اور شک دور ہو جانے ہیں اس کے۔" موتیا نے کہا اور اپنی بات پر جیسے خود ہی ہنس پڑی، وہ جیسے تصور میں مراد کا شرمندہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ہاں میں ملی تھی چوہدری مراد سے اور میں نے بتا دیا ہے انہیں سب کچھ۔ ناراض تھے بھی اگر پہلے تو اب نہیں ہیں۔" بتول اس سے نظریں ملائے بغیر اسے جلدی جلدی بتاتی چلی گئی اور موتیا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"تو پھر کب ملے گا وہ مجھے؟"

"ملنے کا تو نہیں کہا۔ کہہ رہے تھے، اب شادی پر ہی ملیں گے۔ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور میں بھی سمجھتی ہوں، ٹھیک ہی ہے...... تم دونوں پھر ملو گے پھر کوئی مسئلے والی بات ہوگئی۔ غصہ تو ہے چوہدری مراد کو کہ آدھی رات کو گھر سے نکلی کیوں چاہے کسی کو سمجھانے ہی۔ پر یہ تو پتا ہونا چاہیے تھا نا اُسے۔" بتول جھوٹ بولتی جارہی تھی۔

"اسی لیے تو ملنا چاہتی تھی ایک بار اس سے۔" موتیا سنجیدہ ہوئی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مرد کا غصہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور یہاں تو زیادتی بھی چوہدری مراد کی ہے۔" بتول نے کہا تھا۔

"تو سچ کہہ رہی ہے نا کہ وہ ناراض نہیں مجھ سے۔" موتیا نے جیسے تسلی چاہی۔

"ناراض ہوتا تو شادی کی تیاریاں ختم کروا دیتا۔ تو چل کے دیکھ لے حویلی...... کیسے دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور اب تو بھی گھر میں ٹک کے بیٹھ جا اور مجھے بھی بیٹھنے دے۔" بتول نے جیسے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے اور موتیا ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"چل ٹھیک ہے پھر تجھ پر بھروسا کرتی ہوں۔ خالہ سے پوچھنا تھا، میرے پھولوں کا ہار لے لیا اس نے؟ پروتے ہوئے تین بار سوئی لگی تھی انگلی میں۔" موتیا نے تجسس سے پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں لے لیا! کیوں نہ لیتا؟ اس نے تو رکھ لیا تھا کمرے میں۔ اماں کہہ رہی تھی، سونگھ رہا تھا۔" موتیا کا چہرہ لال ہوا۔

"میرے لیے کچھ نہیں کہا؟"

"جو بھی کہا ہوگا، اماں کو تھوڑی بتایا ہوگا وہ تو دل میں کہا ہوگا۔ اور تو نے اماں کو کیوں دیا ہار، مجھ کو بھی دے [illegible]" بتول [illegible] انداز [illegible]

"تو [illegible] سے جاتی۔ خالہ تو صبح سویرے ہی چلی جاتی ہیں۔ تیرے جاتے جاتے موتیا مرجھا جاتا [illegible]"

بتول اُسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ مٹھائی کے ڈبے سے ڈھیر ساری مٹھائی ایک پلیٹ میں ڈالنے میں مصروف تھی اور اس کا چہرہ یک دم ہی موتیا سے گلاب بن گیا تھا۔ بتول کے کانوں میں تاجور کی آواز گونجی تھی۔

"مراد کو اس کا کوئی پیغام نہیں دے گی تو اب۔ ماہ نور سے رشتہ طے ہوگیا ہے اس کا اور مراد کی بارات اب وہاں جائے گی۔"

"چوہدرائن جی! موتیا کے ماں باپ تو اس کی شادی کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔" بتول نے جیسے تاجور کو بتانا چاہا تھا کہ ان کے گھر انکار بھیجا جانا چاہیے۔

"تو کرتے رہیں۔ دان کی بیٹی کو بتا آیا ہے میرا بیٹا۔ اگر پھر بھی ضد ہے ان کی تو کرتے رہیں۔" بتول عجیب سی کیفیت میں پھنسی تھی۔

"اور تجھے کیوں فکر ہے سہیلی کی؟ تو اب سعید اور اس کے گھر والوں کی فکر کر۔" تاجور نے ساتھ ہی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کا گال تھپکا تھا۔

"اور دیکھ بس چپ، کوئی ایک لفظ کسی سے نہیں۔" تاجور نے جانے سے پہلے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اُسے بتایا تھا اور بتول نے حسبِ معمول کی طرح سر ہلا دیا تھا۔

اور اب وہ مٹھائی کی پلیٹ بھرتی موتیا کو دیکھ رہی تھی جو اس سے کہہ رہی تھی۔

"یہ ساری مٹھائی لے کے جارہی ہوں میں۔ اماں ابا کو کھلاؤں گی اور خود دو تین بار کھاؤں گی۔ اس دن کا کتنا انتظار تھا مجھے۔" موتیا اب گنگنا رہی تھی اور اس کی آواز بتول کو کسی آری کی طرح کاٹنے لگی تھی۔

مندری وچ نگ ماہیا
یاراساں سمجھدے رئے کھوٹا
نکلیا نگ ماہیا

بتول کے ہاتھ پاؤں جلنے لگے تھے۔ وہ اگر شادی کی تیاری کرتی رہتی اور مراد کی بارات اس کے گھر نہ جاتی؟ یہ خیال نہیں تھا، اُسے یقین تھا اب یہی ہونا تھا پر کیا اُسے موتیا کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا اور بتا دیتی تو کیا کیا اور کس منہ سے؟

"بس چپ، کسی سے ایک لفظ نہیں۔"

اسے تاجور کی ہدایت یاد آئی تھی اور اس نے جیسے اپنے کان اور دل دونوں بند کر لیے تھے۔

☆☆☆

"کب سے گوٹا لگا رہی تھی اس دوپٹے پر اور دیکھو ادھر دوپٹہ بھرا اُدھر میری موتیا کے لیے شہزادہ آگیا۔" اللہ وسائی نے گوٹے کناری سے بھرا ہوا وہ سرخ دوپٹہ موتیا کے سر پر اوڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

وہ اور گامو بیٹھے اس کے جہیز کی چیزیں ایک ٹرنک میں رکھ رہے تھے جو گامو ایک دن پہلے شہر سے خرید کر لایا تھا۔ اتنے سالوں میں بس اتنا ہی جوڑ سکے تھے وہ کپڑے لتے کے نام پر موتیا کے لیے اور چوہدری شجاع نے تو کچھ بھی دینے سے منع کر دیا تھا گامو کو۔ بس سادگی سے نکاح کرنے کا کہا تھا۔ جو دھوم دھڑکا کرنا تھا۔ وہ اپنی حویلی میں ہی کرتے اور گامو کی دھوم دھڑکے کی جوگا تھا ہی نہیں۔

سامان رکھتے اور باتیں کرتے کرتے اللہ وسائی نے شادی کے جوڑے کا دوپٹہ موتیا کو اوڑھا دیا تھا اور موتیا شرما کر نظریں نیچی کر کے بیٹھ گئی تھی۔ گامو اور اللہ وسائی نے جیسے نظروں ہی نظروں میں اس کی بلائیں لیں۔

"کیسا روپ آیا ہے خالی ایک دوپٹہ اوڑھنے سے بھی۔" اللہ وسائی تو جیسے قربان ہوئی جارہی تھی اور موتیا [illegible]

"پر میں سوچتی ہوں، حویلی والے کچھ نہیں لے کر آئیں گے؟ کوئی زیور، کپڑے، بری......" اللہ وسائی نے اپنے اُس خیال کو آواز دی۔ جو اسے ہر روز آتا تھا۔ حویلی میں تاجور نے ان سے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا تھا۔

"اب مجھے کیا پتا ان کے رواجوں کا۔ ہمیں کچھ بھی دینے سے منع کر دیا تو شاید ان کے ہاں بھی کچھ بھی دینے کا رواج نہ ہو۔" گامو نے اندازہ لگایا۔

"ایسا تھوڑی ہوتا ہے گامو! اور کچھ نہیں لڑکے والے ایک جوڑا تو لے ہی آتے ہیں اور کوئی زیور گہنا۔" اللہ وسائی مصر تھی۔

"میں بیٹی کا باپ ہوں۔ خود جا کے نہیں پوچھ سکتا چوہدری جی سے کہ کیا کیا لائیں گے۔ کچھ لے آئے تو بسم اللہ ورنہ شادی کا جوڑا تو ہے ہی ہمارے پاس۔"

گامو نے جیسے دوٹوک انداز میں کہا تھا اور موتیا ان دونوں کی باتیں سنتے ہوئے بس مسکراتے ہوئے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ کسی کپڑے اور گہنے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مراد کی ہونے والی تھی۔ اس کا نام اس کے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے لگنے والا تھا۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا۔ باقی سب اس کے لیے بے معنی تھا۔ لیکن اس ٹرنک میں پورے گاؤں کے لوگوں کی محبتیں اپنی اپنی حیثیت کے تحفے کے مطابق اس کے پاس آ گئی تھیں۔

موتیا چوہدرائن بننے جا رہی تھی اور گاؤں والے خوش تھے یوں جیسے گاؤں کی حکومت ان کے اپنے ہاتھ میں آنے والی تھی۔

وہ سارے مل کر موتیا کی شادی کا انتظام کر رہے تھے۔ بارات نے صرف شربت پینے رُکنا تھا۔ کھانا نہیں کھانا تھا اور شربت کا خرچا مٹھائی کے ساتھ گاؤں کے حلوائی نے اُٹھا لیا تھا۔ تنبو، قناتوں والے نے بغیر پیسے لیے تنبو، قناتیں دینی تھیں اور وہ گلاس بھی جن میں شربت بٹنا تھا۔ آس پڑوس کی عورتیں بستر بنانے میں مدد کے لیے روز آ جاتی تھیں اور رات کو دیر گئے تک ڈھولک بجتی۔ گھر کے اندر عورتیں اور باہر گلی میں گامو مردوں کے ساتھ۔ گاؤں میں ہر شادی ایسے ہی ہوتی تھی۔ بیٹیاں سانجھی ہوتی تھیں اور یہ تو موتیا تھی، گاؤں والوں کی مسیحا اور راج دُلاری۔

☆☆☆

تیاریاں حویلی میں بھی ہو رہی تھیں اور بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں لیکن دُلہن کا نام لیے بغیر ہو رہی تھیں۔ تاجور ماہ نور کے لیے جو بھی خرید اور بنوا رہی تھی۔ وہ گاؤں کی کسی عورت یا حویلی کے کسی ملازم کو دکھایا نہیں جا رہا تھا۔ صرف ایک شکوراں تھی جو موتیا کے نصیب پر رشک کرتے ہوئے بری کی چیزیں پیک کر کر کے رکھ رہی تھی اور ہر روز جیسے بتول کو ساتھ بتا بھی رہی تھی۔ تاجور نے ابھی تک شکوراں کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ مراد کی بارات موتیا کے گھر نہیں جا رہی تھی۔

☆☆☆

اور جس دن اُس نے بالآخر شکوراں پر یہ راز کھولا تھا، شکوراں ہل کر رہ گئی تھی۔ وہ شادی سے ایک دن پہلے کا وقت تھا اور تاجور نے اُسے یہ بتانے کے بعد اس کے مزید کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

"تو تو اپنی بیٹی کی شادی میں مصروف ہو گی تو تو کل مت آنا اور جس سوال کا جواب نہ آ رہا ہو وہ بتول سے پوچھنا۔ تمہاری بیٹی تم سے کئی گنا زیادہ سمجھدار ہے شکوراں۔"

شکوراں اس کی کسی بات کی سمجھ نہیں پائی تھی پھر وہ بکتی جھکتی گھر ضرور چلی آئی تھی جہاں بتول نے اُسے بھی تاجور کی طرح منہ بند رکھنے کا کہا تھا۔

"اماں! داج بکھرا ہوا ہے پورے گھر میں اور تجھے موتیا کی پڑی ہے۔ سامان سمیٹ جلدی، ابھی جاجا نے بندے بھیجنے ہیں پیٹیاں اور ٹرنک اٹھانے کے لیے۔" شکوراں بیٹی کے کہنے پر جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگی تھی پر وہ اب بھی اُلجھی ہوئی تھی۔

"پر بتول! گامو اور اللہ وسائی تو کل بارات کا انتظار کر رہے ہیں۔ پورا گاؤں اور برادری اکٹھی ہونے والی ہے وہاں۔ اگر بارات نہ آئی تو......"

بتول بُری طرح جھنجھلائی تھی۔

"اماں! تجھے مجھ سے زیادہ موتیا کی پڑی ہے۔ میری بارات ہے کل۔ میرا سوچ۔ چھوڑ موتیا کو۔"

شکوراں نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تیری بچپن کی سہیلی ہے وہ بتول۔ اس کی بدنامی ہوئی تو تجھے بھی تو دُکھ ہو گا۔" شکوراں نے کہا تھا اور بتول کچھ خفیف سی ہوئی۔

"کیا پتا عین وقت پر بارات موتیا کے گھر ہی جائے، تجھے چوہدری مراد کا تو پتا ہے نا وہ ضد پر اڑ جائے تو بس اڑ جاتا ہے۔" بتول نے ماں سے کہا تھا اور شکوراں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"تو کہہ رہی ہے کہ ماہ نور سے شادی طے کروا کر بھی وہ آخری دن ماہ نور کے بجائے موتیا کو بیاہنے چلا جائے گا اور چوہدرائن جی ایسا ہونے دیں گی؟"

بتول نے شکوراں کا چہرہ دیکھا وہ سوال نہیں تھا وہ جانتی تھی۔

☆☆☆

"گامو کے گھر کے آگے سے گزر کر جائے گی بارات۔"

چوہدری مراد کی بارات جانے کے لیے تیار کھڑی تھی جب تاجور نے چوہدری مراد کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر سب سے آگے چلنے والے ملازم سے کہا۔ طیفا اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔

"گامو کے گھر نہیں جائے گی بارات؟"

"نہیں۔" تاجور نے دوٹوک انداز میں کہا اور طیفے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ تاجور ٹھہرے بغیر اندر کی طرف چلی گئی جہاں مراد سہرا بندھوانے کے لیے آ رہا تھا۔

"گاؤں کا چکر لگوانے کی کیا ضرورت ہے؟ بارات سیدھی سیدھی گاؤں سے نکل جائے۔"

چوہدری شجاع نے تاجور سے کہا تھا جس نے انہیں گامو کے گھر کا بتانے کے بجائے صرف یہ کہا تھا کہ بارات گاؤں کا چکر لگا کر پھر دوسرے گاؤں کے لیے نکلے گی۔

"چوہدری صاحب اکلوتے بیٹے کی بارات ہے، اس طرح چوری چھپے نہیں لے جا سکتے۔ اللہ بخشے ابا جی نے بتایا تھا مجھے کہ جب آپ میری بارات لا رہے تھے تو پہلے پورے گاؤں کا چکر لگایا تھا۔ تب تو سو پچاس گھر بھی نہیں تھے گاؤں میں۔ اب تو اتنی گلیاں ہو گئی ہیں۔" تاجور نے بڑے انداز سے بات پلٹی تھی اور چوہدری شجاع قائل ہو گیا تھا۔

تاجور اب مراد کے سر پر کلاہ رکھ رہی تھی اور بیٹے پر قربان جا رہی تھی جس پر انوکھا ہی روپ چڑھا تھا پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ بس کرسی پر بیٹھا ساری رسومات ادا کروا رہا تھا جو تاجور اور خاندان کی دوسری عورتیں اور مرد ادا کر رہے تھے۔

باہر ڈھول اور باجوں کا شور تھا پر مراد کے اندر ایک گہرا سکوت تھا یوں جیسے وہ کسی اور کی شادی میں شریک ہو رہا تھا یا یوں جیسے وہ ایک بُت تھا جس کے ماتھے پر سہرا باندھ دیا گیا تھا۔ گلے میں ہار ڈال دیے

گئے تھے۔ قربانی کے ایک جانور کی طرح۔ پر قربان تو نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو یہ سب کچھ اپنی مرضی اور خواہش سے کر رہا تھا۔ اس نے جیسے اپنے آپ کو خود ہی جھٹلایا تھا۔ موتیا ایک بار پھر ذہن کے پردوں پر لہرائی تھی۔ اس نے اس تصور کو بھی جھٹک دیا تھا۔ اس کی گردن میں آج صرف گلاب کے ہار تھے اور گلابوں کی پتیاں ہی نچھاور ہو رہی تھیں ہر طرف۔ پر پتا نہیں دل موتیا موتیا کیوں کر رہا تھا؟

☆☆☆

موتیا نے اپنے کمرے کے اس پرانے شیشے میں تیار ہو کر دوپٹہ سر پر اوڑھنے سے پہلے ایک بار خود کو دیکھا تھا۔ وہ سارے نقلی زیور تھے جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ ماتھے کا ٹیکا، کان کے بندے، ناک کی نتھلی، گلے کا ہار، چوڑیاں، کنگن...... پر اس میں اگر کوئی کندن تھا تو وہ اس کا اپنا وجود تھا جو اس زیور سے بھی زیادہ حسین اور قیمتی لگ رہا تھا۔ کم سے کم اندر آتی اللہ وسائی کو، جسے دیکھ کے موتیا ہنستے ہوئے شرمائی تھی۔ اللہ وسائی نے بیٹی کے سر پر وہ دوپٹہ پنوں کے ساتھ سجایا تھا اور آخری پن لگاتے بہت دور ڈھول تاشوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"بارات آ گئی۔" اللہ وسائی کے جسم میں یک دم ہی پھرتی آ گئی تھی۔

"میں ذرا دیکھ کے آؤں چھت پر چڑھ کے کہ کہاں تک آ گئی ہے بارات۔" اس نے موتیا سے کہا تھا۔

"اماں میں نے بھی دیکھنی ہے بارات۔" موتیا نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اللہ وسائی کھلکھلائی۔

"تو دلہن ہے، تو کیوں بارات دیکھنے کھڑی ہو گی بھلا؟" اللہ وسائی نے جیسے اُسے یاد دلایا تھا۔

"کہتے ہیں دلہن اگر اپنی بارات آتے دیکھے اور دولہا دیکھے تو دونوں کا پیار کبھی نہیں مکتا۔" موتیا نے ماں سے کہا تھا۔ وہ اور بھی کھلکھلا کر ہنسی۔

"چل آ موتیا اگر ایسا ہے تو چھت پر لے جاتی ہوں تجھے۔"

اللہ وسائی اُس کا ہاتھ تھامے اسے کمرے سے باہر لے آئی تھی باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ ڈھول تاشوں کا شور اب اور بھی قریب آ گیا تھا۔ یقیناً ساری عورتیں اور بچے بارات دیکھنے ہی گلی میں نکل گئے تھے۔ لکڑی کی سیڑھی پر اپنی اوٹ میں اسے لیے اللہ وسائی اسے اوپر چھت پر لے آئی تھی۔ ڈھول تاشوں کا شور اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے کانوں میں بات کرنی پڑ رہی تھی۔ اللہ وسائی نے گلی میں نیچے جھانک کر دیکھا اس لمبی گلی میں لوگ ہی لوگ تھے اور بارات اس گلی میں اب داخل ہونے والی تھی۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب مراد بے قرار ہوا تھا۔ اُسے موتیا کے گھر کے سامنے نہیں جانا تھا پر اس کے اردگرد اور آگے ناچتا ہجوم، اُچھالے جانے والے سکے لوٹتا اسے اسی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب مراد کے گھوڑے کو گلی کا موڑ مڑتے دیکھ کر چوہدری شجاع نے بگھی میں اپنے ساتھ بیٹھی تاجور سے خفگی سے کہا تھا۔

"ہمیں گامو کے گھر کے سامنے سے بارات نہیں گزارنی تھی۔" تاجور نے عجیب سی ہنسی میں اس کی بات اڑائی۔

"کیوں گامو گاؤں کا چوہدری بن گیا ہے یا یہاں رہتا نہیں؟" پھر ساتھ ہی اس نے بگھی کی کھڑکی سے ملازم کو آواز دے کر کہا تھا۔

"اتنے سکے اُچھالو اس گلی میں کہ گامو کا گھر سکوں سے بھر جائے۔ اس نے بڑی خدمت کی ہے ہماری۔" اس نے کہہ کر شوہر کو دیکھا تھا جو بس خاموش اسے دیکھ رہا تھا اور بارات گلی میں داخل ہو گئی تھی۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب گامو کے کانوں میں پہلی دفعہ اتنے شور میں بھی کسی نے سرگوشی کی۔

"بارات چوہدرائن کے بھائی کے گھر جا رہی ہے اس کی بیٹی بیاہنے، تیری بیٹی بیاہنے نہیں آئے۔ یہاں سے بس گزر کر جائیں گے۔"

وہ جو بھی تھا، بارات کے ساتھ تھا اور گامو نے اس سرگوشی پر کان نہیں دھرا تھا۔ گاؤں والے اس کی بیٹی کے نصیب سے جلتے تھے ورنہ اس طرح کی خبریں کیوں پھیلاتے۔ سکوں کی برستی بارش میں ملنی کے لیے لی ہوئی چادر کندھے پر ڈالے گامو نے گھوڑے پر بیٹھے سہرا باندھے مراد کو دیکھا تھا اور پھر گلی میں اندر آتی ہوئی بگھی کو بھی جس میں چوہدری شجاع اور تاجور بیٹھے تھے۔

اسے اپنی بیٹی کے نصیب پر رشک ہوا تھا۔ اس پورے گاؤں میں کسی کی ایسی بارات نہیں آئی تھی۔ کسی نے اتنے سکے نہیں لٹائے تھے جو لوگوں کے گھروں کے آنگنوں اور چھتوں پر دانوں اور بارش کی طرح برس رہے تھے۔ پورا گاؤں ناچ رہا تھا۔ وقتی طور پر سب بھول ہی گئے تھے کہ وہ بارات کہاں سے گزر کر کہاں جا رہی تھی۔ سکے انسانوں کی بینائی اسی طرح لے جاتے ہیں۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب اپنے چہرے کے سامنے سے سہرا ہٹا کر گھوڑے کے اوپر بیٹھے ہوئے مراد نے اوپر دیکھا اور چھت کی منڈیر کے پیچھے اللہ وسائی کی اوٹ میں سرخ جوڑے میں کھڑی جس حور کو اس نے دیکھا تھا۔ وہ شاید اُسے دنیا میں نہیں جنت میں ملی تھی۔

وہ سرخ گھونگھٹ تھا جو اس کے سر سے سرک گیا تھا اور گوٹے سے سجا دوپٹہ اور اس کی بالشت بھر لمبی کرن اب موتیا کے چہرے کو اپنے گھیرے میں لیے روپہلا کیے ہوئے تھی۔

وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ دھوپ میں چمکتی سیاہ کاجل سے آنکھیں سجائے ماتھے پر ٹیکا لگائے وہ بھی اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔ پل بھر کو مراد سب بھول گیا تھا۔

اپنا غصہ، اس کی بے وفائی، وہ بارات، ڈھول تاشے، برستے سکے، اس کا سہرا اور وہ گھوڑا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ یاد تھی تو بس وہ جو اس چھت پر سرخ گوٹے کناری اور کرن کے دوپٹے میں بس اسے دیکھ رہی تھی اور بس اس کی تھی۔ یہ جو بیچ میں ساری دنیا تھی یہ تو بس فریب تھا۔ وہاں اگر سچ تھا تو بس وہ دونوں تھے۔ تیسرا کوئی نہیں۔ سارا میل، سارا شکوہ، سارا غصہ پتا نہیں ہوا بن کر غائب ہوا تھا یا دھواں بن کر......

پر اس لمحے اس ایک لمحے مراد کو موتیا سے کوئی بھی گلہ نہیں رہا تھا اور موتیا بھی ویسے ہی پلکیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی ہی جا رہی تھی۔

مراد نے گھوڑے کی باگیں کھینچنی چاہیں اور اُسے احساس ہوا گھوڑا اس کی مرضی سے نہیں چل رہا تھا۔

اور اُسی ایک لمحہ میں تاجور نے بگھی میں بیٹھے چھت پر کھڑی دلہن بنی موتیا کو دیکھا تھا اور وہ بھی مراد کی طرح اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ اُسے مراد کی بارات اس گلی میں نہیں لانی چاہیے تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سفیعہ عمیر

وبال یادیں

کہتے ہیں کہ بچپن بڑھاپے میں دوبارہ لوٹ آتا ہے۔ میری امی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ آخری عمر میں بچپن، جوانی اور نہ جانے کیا کچھ لوٹ آیا تھا یا تو انسان کو یادداشت کی بیماری ہو جائے تو کتنے ہی پٹارے کھل جاتے ہیں۔

امی کے اندر سٹھیا کا مرض کئی سالوں سے سوتا جاگتا رہا تھا۔ پھر ایک روز ایسی بیمار ہوئیں کہ وہ مرض پورے وجود پر حاوی ہو گیا۔ اگر بلڈ پریشر، شوگر وغیرہ قابو میں آ بھی جاتا تو دماغ کی سوچیں نہیں تھمتی تھیں۔ اور زبان کو وقفہ تو بالکل نصیب ہی نہیں ہوتا تھا۔ امی نے ساری عمر ہمت سے بڑھ کر کام کیا۔ بچے پالے، گھر سنوارا ساتھ اپنی دوستیاں ملنا ملانا بھی نبھایا۔ چھوٹا دماغ پر اثر ہوا تو یہ بھی بھول جاتی تھیں کہ کون سے وقت میں جی رہی ہیں۔

ابو جی کو گزرے بیس سال ہونے والے تھے۔ مگر امی کو ہر وقت فکر رہتی کہ ابو جی کو کھانا دینا ہے۔ میرا اکثر ان کی تیمارداری پر ہوتی تھی۔ اب تو میں خود بھی نانی بن چکی تھی۔ لیکن امی کو لگتا تھا کہ وہ وقت چل رہا ہے جب ہم سب بچے چھوٹے تھے۔ پوچھتیں گڑیا کدھر ہے۔ میں کہتی اپنے گھر میں ہے۔ ان کو یقین نہیں آتا کیونکہ ان کے ذہن میں دو پونیوں والی چھوٹی سی گڑیا تھی، وہ مانتی ہی نہ تھیں کہ گڑیا اب بال بچے والی ہے لیکن باہر جاتی تھیں کہ اندھیرا ہونے والا ہے گڑیا کو لے آؤں۔ میں مشکل سے سنبھالتی۔

ایک روز چھوٹے ماموں کا حال چال پوچھنے لگیں۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ماموں تو فوت ہو

وہ تو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں جھلی چنلی بیٹھی ہوں اس کو کیا ہو سکتا ہے۔ اب میں کیا کہتی بعد میں پیدا ہونے والا بعد تک رہے یہ کوئی گارنٹی تو نہیں۔ لیکن جو بھی تھا ایک بات سچ تھی امی معصوم بہت تھیں۔

ایک شام بیٹھے بیٹھے امی نے کہا ماسی حسنہ آئی ہیں لڑکے کو بھیج کر بوتلیں منگوالو۔ میں نے غور کیا ہاں کبھی کوئی ماسی حسنہ ہوا کرتی تھیں شاید نام بھی سنا تھا اور امی نے لڑکے کو بھیجنے کا کہا تو مجھے خیال آیا امی کے ذہن میں وہ وقت چل رہا تھا، جب سوڈا شیشے کی بوتلوں میں ہی ملتا تھا۔

گھروں میں فریج تھے نہیں۔ اور ہوتے بھی تھے تو ہر کھانے کے ساتھ سوڈا پینے کا رواج نہیں تھا۔ مہمان آنے پر ملازم کو بھیجتے اور ٹھنڈی بوتلیں منگوا لیتے تھے۔ پہلے میں نے امی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی ماسی حسنہ نہیں ہیں آرام کریں۔ پر امی کہاں ماننے والی تھیں۔ بار بار ایک ہی بات دہرانے لگیں۔ بارہ روپے دیے تھے لڑکے کو بوتلیں آ گئیں؟ میں نے بھی تنگ آ کر کہہ دیا ہاں امی آ گئیں بوتلیں۔ میرا خیال تھا امی کون سے سوجا میں گی۔ امی ادھر اُدھر ... ہوئیں اور پوچھا باقی پیسے؟

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بارہ روپے دے کر بوتلیں منگوائیں سارے مہمانوں کو پلائیں اب بقیہ پیسے مانگ رہی ہیں۔ آج کل ایک بوتل نہ آئے بارہ کی امی نجانے کس زمانے میں تھیں۔ خیر میں نے کہہ دیا کہ پیسے رکھ دیے ہیں تو امی کو تسلی ہوئی۔

میری بیٹی کی شادی، امی کے بھتیجے ظفر سے ہوئی



ملنے آئے۔ میرے نواسے نے نیا نیا قد نکالا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں بھرا جوان لگتا تھا۔ وہ آیا تو امی کو لگا وہ ظفر ہے، بہت محبت سے ملیں۔ اور ظفر کو پہچانا تک نہیں۔ وہ بچہ بہت خوش ہوا کہ بڑی نانو نے صرف مجھے ہی پہچانا۔ اسے کیا معلوم امی اس میں اس کے باپ کا بچپن دیکھ رہی تھیں۔ امی کے ذہن سے سوچو تو کتنی مشکل زندگی تھی انہیں ننھے قدم اٹھاتے

چھوٹے بچے یاد تھے۔ اب ہر کوئی اونچا لمبا اپنے دو چار بچوں کو اٹھائے نظر آتا تھا تو ان کو امتحان میں ڈال دیتا تھا۔

میں نے اپنے بیٹے کی شادی اپنی بھانجی سے کی تھی۔ امی اس رشتے میں پیش پیش تھیں۔ دولہا دلہن کی مشترکہ ساس بمعہ نانی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ ... پرانی بات اب کہ میری بہو ملنے آئی

تو امی صحیح سے پہچان نہ پائیں۔ اس کی اپنی ایک چھوٹی بیٹی تھی۔ امی کا تو ذہن چکرا گیا۔

"شاہین! تمہاری شادی ہو گئی؟" امی نے سنبھل کر میری بہن سے پوچھا۔

"جی نانی! ہو گئی ہے۔ شکیل سے ہوئی ہے۔" اس نے تفصیل سے وضاحت دی۔

"ہائے شکیل سے شادی کر لی وہ تو اتنا بڑا ہے تم سے۔" امی نے سر پیٹا۔ شاید ان کے ذہن میں وہ وقت تھا۔ جب شاہین تین سال اور شکیل دس سال کا تھا۔ اس وقت تو سچ میں اس کی نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ان کی شادی ہو جائے گی۔

"نانی آپ نے ہی کروائی تھی۔" شاہین نے ہنستے ہوئے یاد کروایا۔

مگر امی ساری ملاقات میں رشتے ہی سمجھتی رہیں۔

☆☆☆

جب باقی ذہن میں مسئلے ہوں تو طبیعت بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ امی کی بھی ایک بار طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ ڈاکٹرز نے ہسپتال میں داخل کر لیا۔ میرے بھائی جان اس ہسپتال میں بڑے ڈاکٹر تھے۔ جب دوسروں کو معلوم ہوا ڈاکٹر صاحب کی والدہ داخل ہیں تو وہ حال پوچھنے آ جاتے۔ ہسپتال میں ایک پرانے جاننے والے عابد صاحب تھے جن کے والد کا گھر ہمارے قریب ہی ہوا کرتا تھا۔

جب عابد صاحب حال پوچھنے آئے تو میں نے بھی ان کی بہنوں کا حال پوچھا۔ بھائی جان بھی پرانی باتیں کرنے لگے۔ سوئی ہوئی نڈھال امی کو پرانی باتوں سے بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ ذہنی طور پر اس ہی وقت میں جی رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔" امی نے عابد صاحب کو کہا۔ جو اب وکیل بن چکے تھے۔

ہم سب بھی الرٹ ہو گئے۔ امی نے بہت عرصے بعد کسی کو اتنا لمبا سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" عابد صاحب نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ حاجی دین محمد کے بیٹے ہو ناں؟" امی نے ان کو پہچان لیا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مطلب علاج کام کر رہا تھا۔

"جی میں ان ہی کا بیٹا ہوں۔" عابد صاحب امی کے سامنے ہی پلے بڑھے تھے۔ امی سے ملاقات ہونے پر خوش کیسے نہ ہوتے۔ معصومانہ تبسم ہونٹوں پر سجائے وہ بہت ادب سے مخاطب تھے اور امی بھی سب کچھ چھوڑ کر ان سے ہی بات کرنا چاہتی تھیں۔

"وہ تمہارا ہی بھائی تھا، جو شیخوں کی لڑکی بھگا کر لے گیا تھا؟" امی نے بہت سہولت سے پوچھا۔

عابد صاحب کا رنگ تو اڑا ہی، ہمارے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کہاں امی کو کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ اب یاد آیا تو اتنا تفصیلی یاد آ گیا تھا۔ ہم سب تو چپ ہی رہ گئے۔ عابد صاحب نے ہی سب سے پہلے بولنے کی جسارت کی۔

"نہیں وہ میرا بھائی نہیں تھا۔ وہ تو میں ہی تھا۔" عابد صاحب نے جھکے سر کے ساتھ کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

بھائی جان دروازہ کھول کر نرسوں کو کوئی ہدایت دینے لگے میں اور میری بہن دوپٹوں میں منہ دے کر رہ گئیں۔ باقی ملاقات میں عابد صاحب کا جوش ہلکا ہو چکا تھا۔ امی نے وہ بات یاد کروا دی تھی جس کو وہ بھولے بیٹھے تھے۔ عابد صاحب کے جانے کے بعد میں بھائی جان اور چھوٹی بہن وہ اتنا ہنسے کہ مت پوچھو۔ امی کی بدولت ہمیں ہمارے بچوں کو اور آپ سب پڑھنے والوں کو وہ قصہ سننے کو مل گیا جو سب بھلا بیٹھے تھے۔ اور وہ یاد بھی آیا تو کس کو ڈیمنشیا کی شکار مبینہ عرف بینا کو۔

☆☆☆

ہم بھی شیخ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ہم نوکری پیشہ لوگ تھے۔ ہمارے ہی محلے میں ایک شیخ ارسلان رہتے تھے۔ جن کی چار بیٹیاں دو بیٹے اور کئی کاروبار تھے۔ ان کی بڑی بیٹی فاطمہ میری ہم عمر تھی۔

میری اور فاطمہ کی منگنی آس پاس ہی ہوئی تھی۔ شادی سے کچھ پہلے میں ان کے گھر گئی۔ فاطمہ نے جدید فیشن کا کڑھائی والا سوٹ گھر پر ہی پہنا ہوا تھا۔ اور صوفے پر آڑی ترچھی لیٹ کر وہ رسالہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی ہو بیٹھی اور حال چال پوچھنے لگی۔ فاطمہ نے مشکل سے گیارہ جماعتیں پڑھی تھیں۔ ان کے گھروں میں زیادہ پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔ ذرا عقل آتی تو لڑکے کاروبار میں شامل ہو جاتے اور لڑکیاں گھرداری میں مصروف ہو جاتیں۔

"میں نے اپنے جہیز میں آٹھ سویٹر بنے ہیں۔" میں نے اپنی مصروفیت بتائیں۔

"اچھا اچھا، مگر ریاض کو نہیں پسند۔" فاطمہ نے بوریت سے کہا ریاض اس کا منگیتر تھا۔

"میں نے تین چار نئی ڈشز بھی سیکھی ہیں۔ شادی کے بعد شہر سے دور جا کر رہنا ہے۔" میں نے اپنی کہی۔

"چلو اچھا کیا لیکن ریاض کو میرا کوکنگ کرنا پسند نہیں۔" فاطمہ نے ڈھیلے انداز میں کہا۔

"یہ تو بہت اچھا ہے بس بن سنوار کر بیٹھنا آرام کرنا۔" میں نے اس کے مزاج کی بات کی۔

"ہاں بیس جوڑے بنوائے ہیں میں نے، ہمارے گھروں میں بہت برا مانا جاتا ہے کہ ایک جوڑا دعوتوں پر بار بار دہرایا جائے۔" فاطمہ میں بیگمات والے سارے جراثیم تھے۔

فاطمہ سے چھوٹی بہن صاعقہ تھی۔ جس کی فاطمہ کے کچھ عرصے بعد ٹھاٹ سے اپنے جیسے امیروں میں شادی ہوئی۔ اور اس سے چھوٹی تھی جویریہ۔ جس کو پڑھنے کا شوق تھا۔ وہی شوق اسے یونیورسٹی تک لے گیا تھا۔

☆☆☆

جویریہ کلاسیں ختم ہونے کے بعد تھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں موجود دو کتابیں اینٹوں جیسی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک ہاتھ سے وہ بالوں کو کان کے پیچھے کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ یونیورسٹی گیٹ کے آس پاس بے تکا رش تھا۔ ہر کوئی ٹکراتا ہوا گزر رہا تھا۔ جویریہ محنت سے راستہ بنا کر باہر نکلی۔ اس کی ذاتی گاڑی لینے آتی تھی۔ باقی سہیلیاں بھی رکشہ کروالیتیں بھی بس لے لیتیں۔

جویریہ ادھر نظریں گھما کر کار دیکھنے لگی۔ کار تو نظر نہیں آئی قریب کھڑا عابد نظر آ گیا۔ وہ ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ عابد کے والد وکیل تھے۔ وکیل صاحب نے پہلے ماں باپ کی پسند سے خوب صورت گھریلو خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ بچے تھوڑے بڑے ہوئے تو وکیل صاحب کو ایک روز بس سٹاپ پر کھڑی ایک کمزور گہرے رنگ کی اسکول ٹیچر پسند آ گئی اور وکیل صاحب نے اس سے شادی کر لی۔

اب پہلی بیگم اوپر کے پورشن میں رہتی تھیں اور دوسری بیگم نیچے کی منزل پر رہتی تھیں۔ ایک ہی جیسے شکل وصورت کے کئی بچے تھے جو رنگت سے پہچانے جاتے تھے۔ ہلکی رنگت والے پہلی بیوی سے تھے اور گہری رنگت والے دوسری بیوی سے۔ جویریہ نے زیادہ غور نہیں کیا۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔

"اللہ حوسونی لڑکی۔" ایک گندے میلے حلیے والی فقیرنی، جویریہ کے سامنے آ گئی اور اسے چاہت سے دیکھنے لگی۔ جویریہ دبک کر پیچھے ہو گئی۔

یہ فقیرنی ادھر ادھر رہتی تھی۔ مگر آج پہلی بار جویریہ اسے اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس لیے ڈر گئی۔ جبکہ فقیرنی نے یوں ماتھے پر تیوری چڑھائی جیسے اس کے دل کو ٹھیس پہنچی ہو۔ وہ تنہا تھی اور توجہ ہی چاہتی تھی۔ فقیرنی نے جھٹ جویریہ کے ہاتھ سے کتاب لی اور دوڑ لگا دی۔ تھوڑا آگے جا کر اس نے مڑ کر دیکھا اور جویریہ کو پیچھے آنے کا کہا۔

جویریہ کو فقیرنی کی حکم عدولی کا ڈر نہیں تھا اس کو تو اپنی کتاب عزیز تھی۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ اس کے پیچھے جانے لگی۔ جویریہ جتنا تیز ہوتی فقیرنی اس سے دگنی رفتار سے بھاگنے لگتی۔ جیسے کوئی کھیل کھیل رہی ہو۔ گلی کے کونے میں مڑ کر جویریہ کا سانس پھول گیا



کا اندازہ نہیں۔ہم ابھی جویریہ کی شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہے۔'' شیخ صاحب نے ایک ہی جملے میں انکار کر دیا۔

''ہمیں اندازہ ہے ہیں لیکن آپ بے خبر لگ رہے ہیں۔آپ کی بیٹی آج صبح میرے بیٹے عابد کے ساتھ نکاح کر آئی ہے۔ہمیں جواب دینے سے پہلے اس کے ارادے پوچھ لیں۔'' عابد کی ماں نے بھی لحاظ نہیں رکھا۔پھر وہ تفصیل برخاست نہیں ہوئی چلی اور اتنا چلی کہ عابد کی بھی پیشی ہوئی۔لڑکی والوں نے لڑکی کو چلتر کہا تو لڑکے والوں نے لڑکے کو لالچی کہا۔

شیخ صاحب تو ایسے بپھرے ہوئے تھے جیسے ابھی عابد کے منہ سے تین لفظ کہلوا کر رہیں گے۔وہ تو کسی کی نیکی کام آ گئی کہ وہ محفل بغیر خون خرابے کے ختم ہو گئی۔مگر مسئلہ تو قائم تھا۔نکاح تو ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''بازار جاؤ تو اتنی دیر تو لگ ہی جاتی ہے۔جاوید کی امی نے مجھے اتنی باتیں سنا دیں۔ان کی بیٹیاں آئی ہوئی تھیں۔میں نے تو یہی سوچا کہ وہ ختنلی نہیں ہوں گی۔مجھے کیا معلوم نندوں کو میرے خلاف ساس کے کان بھرنے کا موقع مل جائے گا۔نہ جانے کیا کیا کہا۔'' صاعقہ منہ کھول کر روئے جا رہی تھی۔

سب کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔اس کو کیا معلوم جانے اس کی نہیں جویریہ کی وجہ سے سونگھا ہے اور جب معلوم ہوا تو وہ چپ ہو کر بیٹھ گئی۔گھر میں مسئلے تو تھے مگر ایسے نہیں تھے کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے۔ماں باپ کو یقین تھا۔

جاوید اور اس کے ماں باپ آ کر منا کر صاعقہ کو لے کر جائیں گے اور جویریہ کو عقل بھی آ ہی جائے گی وہ معمولی نوکری والے کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔

☆☆☆

''دل پھینک ہونا اس کے خون میں شامل ہے۔اس کے باپ نے بھی تو راہ چلتی پسند کر لی تھی۔کبھی دوسری پسند کر لے گا تو تم کیا کرو گی؟'' گھر کے افراد صبح شام جویریہ کو سچ کی کڑوی گولی کھلاتے تھے۔

''اس کے ابو کو بھی محبت سے روکا تھا آخر انہوں نے کر لی۔عابد اور مجھے ہماری محبت مل گئی ہے۔ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ بھی عشق کے بھوت کے زیر اثر تھی۔

''شکر ہے تم نے بھاگ کر شادی نہیں کی عقلمندی کی اور نکاح پڑھوا کر گھر آ گئیں۔ورنہ بھاگنا ہی پڑتا اس کے پاس تو بائیک بھی نہیں ہوگی۔جاوید ہر سال نئی کار لیتا ہے۔'' صاعقہ نے جتایا۔

''پھر بھی تم ادھر بیٹھی ہو۔'' جویریہ نے یاد کروایا۔

''چلی جاؤں گی۔امی ابو نے بات کی ہے۔جاوید اپنے ماں باپ کو لے کر آئے گا تو چلی جاؤں گی مگر تم کوئی بے وقوفی نہ کرنا وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔'' صاعقہ نے اب کی بار بہن بن کر کہا۔

☆☆☆

جویریہ نے ملازم کے ہاتھ عابد کو خط بھیج کر بلوایا۔رات کے اندھیرے میں وہ اس سب کا حل سوچتے جا رہی تھی۔جب لان میں اسے بیگ گھسٹنے کی آواز آئی۔صاعقہ خاموشی سے اپنا بیگ لیے کہیں جا رہی تھی۔اس نے اوٹ میں ہو کر دیکھا۔جاوید بھائی گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔جاوید کے ماں باپ کہہ رہے تھے، بہو خود گئی ہے خود آ جائے گی اور صاعقہ کے ماں باپ بضد تھے کہ وہ آئیں گے تو صاعقہ جائے گی۔اب تو بیاہتا جوڑے سے رہا نہیں گیا۔صاعقہ خاموشی سے جاوید بھائی کی کار میں بیٹھ گئی اور اپنے ہی شوہر کے ساتھ فرار ہو گئی۔

پھر جویریہ نے وہیں کھڑے ہوئے نظر اٹھا کر عابد کا گھر دیکھا۔اور سامنے دور چھپ کر کھڑے عابد کو دیکھا۔وہ موازنہ کرنے لگی۔ان کا جوڑ ماں باپ کی رضامندی سے بھی ہوتا تو مشکل سے نبھتا نظر آتا تھا۔اب گھر والوں کو ناراض کر کے کیا اسے کچھ حاصل ہوگا؟ وہ یہی سوچتی رہی اور عابد سے نہیں ملی۔

☆☆☆

''آپ نے جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کیجیے پورے محلے اور خاندان میں بات پھیل گئی ہے۔مجھے سوکن سے طعنے مل رہے ہیں۔میں اس پر انگلی اٹھاتی تھی آج میرے بیٹے نے وہی کیا۔میں نے بھی بیٹیاں بیاہنی ہیں۔عزت سے خاموشی سے اپنی بیٹی رخصت کر دیں۔'' عابد کی ماں نے رعب سے کہا۔جویریہ بھی پیچھے کھڑی سن رہی تھی۔

''ہم عزت سے بیاہ دیں گے تو کیا آپ عزت سے رکھیں گے؟ معاف کیجیے گا آپ کے بیٹے کو عشق لڑانے کے علاوہ شاید ہی کچھ وراثت میں ملا ہے۔'' جویریہ کی ماں کو دولت کا رعب جھاڑنا خوب آتا تھا۔

''آپ میرے بیٹے کی تذلیل کر کے اچھا نہیں کر رہیں۔آپ کی بیٹی نے مرضی سے نکاح کیا ہے۔''

''وہ اپنی ہی مرضی سے رشتہ ختم بھی کر دے گی۔'' جویریہ کی ماں نے بھی دو ٹوک کہا۔انہیں صاعقہ کی من مانی کا بھی غصہ تھا۔

عابد کی ماں چلی گئی۔جویریہ عابد سے بھی ماں کو کچھ نہ کہہ سکی۔اس کی بھوک ہڑتال میں رونا چلانا سب دم توڑنے لگا تھا۔

☆☆☆

''چلو سمدھن جی! بچوں میں لڑائی ہوئی تھی ختم ہو گئی۔اب آپ نے ماں بن کر میری بیٹی کو رخصت کرنا ہے۔شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔'' صاعقہ کے ماں باپ کو غصہ آیا تھا کہ بیٹی خود چلی گئی۔ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے صاعقہ کی ساس بیٹا بہو کے ساتھ آئی تھیں۔

وہ اکیلی کب آتی تھیں۔اپنے باغ کے موسمی پھل، مٹھائی کے ڈبے ساتھ لاتی تھیں اور واپسی پر ملازموں کے ہاتھوں میں نیلے نوٹ تھما کر جاتی تھیں۔ان کے آنے سے صاعقہ کا مان تو بڑھ گیا۔ماں باپ بھی راضی ہو گئے۔اور جویریہ بھی سمجھ گئی۔ماں باپ کی پسند سے کیے رشتوں میں ہی یہ مان ملتا ہے کہ روٹھ کر آیا جائے اور منانے کی توقع کی جائے۔

صاعقہ ماں باپ کے گھر ہے تو انہوں نے سر پر بٹھایا۔سسرال گئی تو وہاں سب نے سینے سے لگا لیا کہ روٹھی بہو آ گئی۔وہ عیش و آرام ٹھکرا سکتی تھی، مگر یہ اپنائیت یہ عزت یہ لاڈ اسے ہر صورت چاہیے تھا۔وہ عابد کی محبت کی خاطر یہ سب قربان نہیں کر سکتی تھی۔سو فیصلہ ہو گیا۔گھر والے نہیں مانے جیسے خاموشی سے اس نے نکاح کیا تھا ویسے خاموشی سے نکاح ختم بھی ہو گیا۔عابد گلی کے نکڑ پر کھڑا نظر اٹھا کر عرصے تک شیخ صاحب کے گھر کو دیکھا رہتا تھا۔جویریہ کی شادی بہت دھوم دھام سے اس کے لندن والے کزن سے ہو گئی۔وہ ملکوں ملکوں گھومنے لگی۔پھر جب بھی وہ اپنے شہر آئی تو گلی میں داخل ہوتے ہوئے آنکھیں زور سے بھینچ لیتی۔کہیں پیچھے دیکھنے سے وہ پتھر کی نہ ہو جائے۔

ناولٹ

متاعِ زیست ہے جو خواب

بشریٰ احمد

چچا میاں کا گھر اس کے لیے ایک جادو نگری تھا۔

بڑے بڑے کمرے، لمبی راہداریاں، محراب دار بالکونیاں، چوبی منقش دروازے۔

بچپن میں وہ دادی کے ساتھ وہاں جاتی تو واپسی کے بعد بھی دنوں اس گھر کے فسوں خیز ماحول سے نکل نہ پاتی۔ چچا میاں مشفق لیکن کم گو انسان تھے۔ چچی جان خوش لباس، باوقار خاتون تھیں جو ایک تکلف آمیز فاصلہ رکھ کر ملنا جلنا پسند کرتی تھیں لیکن ان میں بھی رعونت ہرگز نہ تھی۔

اسعد بھیا اور عینی آپا دونوں انتہائی ذہین، فطین اور کتابوں کی دنیا میں گم رہنے والے تھے۔ اشعر بھی ذہین تو ان جیسا ہی تھا لیکن ذہانت سے بھی زیادہ جو چیز اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی وہ اس کی خوب صورتی تھی اور اپنی خوب صورتی کا اسے بخوبی ادراک بھی تھا۔ وہ ہر کسی کے ساتھ خاصا لیا دیا، بے نیازانہ رویہ روا رکھتا تھا۔

سب سے آخر میں تھا ولی۔ جس سے مومنہ کی کچھ خاص نہیں بنتی تھی۔ یہ الگ بات کہ چچا میاں کے گھر گزارے جانے والے چند ہفتوں میں اسے ولی ہی دستیاب ہوتا تھا۔ وہ کھلنڈرا سا تھا۔ کتابوں سے اسے کچھ خاص شغف نہ تھا۔

سنا تھا کہ اپنے باقی بہن بھائیوں کے برعکس بغیر کسی امتیازی پوزیشن کے، بس ایسے ہی پاس ہو جایا کرتا تھا۔ مومنہ کے نزدیک وہ عام سا تھا۔ بہت عام۔

بچپن سے لڑکپن تک، وہ ہر سال دادی کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیوں میں چچا میاں کے ہاں رہنے آتی تھی۔ لیکن چند ہفتوں کی جگہ ایک ڈیڑھ ہفتے میں ہی دادی، واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا کرتی تھیں۔

چچا میاں لاکھ رنجیدہ ہوتے۔ چچی جان روکنا چاہتیں لیکن دادی کے پاس، جلد ہی دوبارہ آنے کا وعدہ ہوتا۔ ملتان واپس آ کر، گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں، مومنہ کو چچا میاں کا ٹھنڈے کمروں والا گھر رو رو کر یاد آتا۔ وہ سوچتی رہ جاتی کہ کیا تھا اگر دادی گرمی کا ایک مہینہ ہی وہاں گزار لیتیں۔

☆☆☆

اماں دادی کی سگی بھتیجی تھیں۔ ساس بہو والا رشتہ دونوں نے ہی قائم نہیں کیا تھا۔ ابا خوش مزاج تھے اماں پر جان چھڑکتے تھے۔ فکر معاش میں گرداں ابا کے لیے ذہنی ہم آہنگی رکھنے والی بیوی، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھی۔

گھر میں طریقہ تھا، سلیقہ تھا، خوشی تھی اور سکون تھا۔ لیکن مومنہ کو اوپر تلے کے بہن بھائیوں کے شور شرابے، ہنسی مذاق، لڑائی جھگڑوں میں چچا میاں کا گھر اور اس گھر کے رہنے والے آئیڈیل لگتے۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ ناشکری کی مرتکب ہو رہی ہے تو وہ اللہ سے خوب توبہ کرتی اور گھر میں دل لگاتی۔

چچا میاں کی پسند کی شادی تھی۔ چچی جان خاصے اونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے گھر والوں کو بھی چچا میاں کی بڑی بڑی ڈگریاں اور خاندانی شرافت بھا گئی۔

دادی نے بیٹے کی پسند کو اولیت دی اور یوں شاہانہ چچی بیاہ کر ملتان آ گئیں۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی چچا میاں کا تبادلہ لاہور ہوا تو چچی جان ان کے ساتھ ہی لاہور شفٹ ہو گئیں، جہاں میاں کا بہتر مستقبل تھا۔

اس کے بعد چچا میاں، نوکری کے سلسلے میں کئی شہروں میں سکونت پذیر رہے لیکن چچی نے، لاہور میں قیام کو ہی ترجیح دی جہاں ان کے بچے بہترین تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم تھے۔

ہاں ایک مختلف وقت وہ بھی آیا جب، ڈیڑھ سال کے لیے چچا میاں کا تبادلہ ملتان کر دیا گیا۔ اگرچہ انہیں سرکاری رہائش گاہ ملی ہوئی تھی لیکن دفتر سے واپسی پر وہ اکثر شامیں ان کے گھر ہی گزارتے جہاں اماں اور دادی شام کی چائے کے ساتھ، نت نئے پکوان پکائے ان کی منتظر ہوتیں۔

دونوں بھائیوں میں بہت پیار تھا۔ ابا، چچا میاں کی بہت عزت کرتے تھے تو چچا میاں بھی ابا کے لیے ان سے بڑھ کر خیر خواہ تھے۔ اماں چونکہ ان کی بھی ماموں زاد بہن تھیں، سو پرانا ساتھ تھا۔ وہ خوب کھل کر اماں کی گرہستی کو سراہتے اور انہیں ابا کی خوش قسمتی قرار دیتے۔

ایسے میں مومنہ کے ذہن میں، شاہانہ چچی کا پروقار اور خوب صورت سراپا ابھر آتا، جن کے کپڑوں پر اس نے کبھی سلوٹ نہیں دیکھی تھی۔

ان کے مقابلے میں اماں، ہلکے رنگوں کے سادہ سے کپڑوں میں ملبوس کتنی پھیکی سی لگتی تھیں۔ یہ اس کی اپنی سوچ تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے اپنی ماں سے پیار نہیں تھا بلکہ لاشعوری طور پر وہ انہیں، اسی روپ میں دیکھنا چاہتی تھی جو چچی جان کا ہوتا تھا۔ پھر بھی چچا میاں، اماں کو سراہتے اور ان کے شکر گزار ہوتے کہ ان کی وجہ سے، ان کی ماں کا بڑھاپا آرام و سکون سے گزر رہا ہے۔ ایسے میں اماں انکساری سے وہ سارے فوائد ان کو گنواتیں جو دادی کے دم سے انہیں میسر تھے۔

ان دنوں ولی بھی ہفتہ ہفتہ بھر اپنے ابا کے پاس ملتان آتا تھا۔ ظاہر ہے چچا میاں دفتر جاتے ہوئے اسے ان کے ہاں، چھوڑ جاتے اور یوں وہ دادی سے ڈھیروں لاڈ اٹھواتا۔ سعد اور احسن کے لیے وہ کسی سپر ہیرو سے کم نہ ہوتا۔ سکینہ اس کے گن گاتی، رہ گئی مومنہ تو وہ اسے کمپنی دینے کی کوشش کرتی لیکن ولی کے پاس، اپنی کلاس فیلوز کے ڈھیروں قصے ہوتے جو ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرا کرتیں۔

مومنہ لاہور میں بھی یہ قصے کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ کئی بار بڑے کمرے میں اس کے لیے آئے لڑکیوں کے فون، اس نے خود بھی ریسیو کیے تھے سو وہ کوفت زدہ ہو کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی۔ زہر لگتا تھا مومنہ کو اس کا یہ اوچھا پن۔ اللہ جانے چچا میاں اس پر سختی کیوں نہیں کرتے، وہ حیران ہوا کرتی۔

☆☆☆

چچا میاں کے ملتان میں ڈیڑھ سالہ قیام کے دوران چچی صرف ایک بار ہی ان کے گھر آئی تھیں۔ ان کے میکے کے عزیزوں میں شادی تھی۔ آئی تو وہ شادی میں ہی تھیں لیکن قیام، زیادہ تر انہوں نے ان ہی کے گھر کیا تھا۔ اماں کے ساتھ ان کے تعلقات شادی کے اولین دنوں سے اچھے ہی تھے۔ طبیعت، مزاج اور رہن سہن میں فرق کے باوجود، دونوں نے خلوص کا تعلق قائم رکھا۔

ان کی واپسی کے چند دنوں بعد ہی، چچا میاں نے فون کر کے اشعر کے لیے مومنہ کا رشتہ مانگ لیا۔ ابا میاں اور اماں نے رسمی طور پر مشورے کا وقت مانگا۔ دادی کے خیال میں مومنہ کے لیے ولی کا جوڑ مناسب تھا۔ انہیں ولی کی عادتیں پسند تھیں لیکن رشتہ چونکہ اشعر کے لیے مانگا گیا تھا، سو انہوں نے خواہش دبا لی۔

باقاعدہ رسم کے لیے وہ لوگ ملتان آئے تھے۔ اشعر بھی ہمراہ تھا۔ مومنہ کو تو اس سب پر اس وقت تک یقین نہیں آیا، جب تک کہ اس کی انگلی میں نازک سی ہیرے کی انگوٹھی نہیں سج گئی۔ اشعر جیسا شان دار شخص اس کا ہم سفر بننے جا رہا تھا، اسے تو بن مانگے ہی گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ چپکے چپکے اس کے لب مسکرانے لگے۔ گالوں پر لالیاں سی کھل گئیں۔ پیاری تو وہ ہمیشہ سے ہی تھی لیکن حسن میں ایسا نکھار آیا تھا کہ اماں، نظر بھر کر نہ دیکھتیں اور دادی پڑھ پڑھ کر پھونکتیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔

ولی بھی اس کو خوب چھیڑتا اور اظہار افسوس بھی کرتا کہ اگر پہلے ہی آپ پر توجہ دے دیتا تو اتنی لڑکیوں سے دوستی کے بجائے مومنہ سے ہی منگنی کروا لیتا کہ وہ اس کی تمام گرل فرینڈز سے، زیادہ خوب صورت نکلی تھی۔ اور مومنہ لاحول پڑھتی فوراً، ولی سے منگنی۔

"توبہ توبہ...... اللہ تعالیٰ کتنا مہربان ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ کہیں کی نہ رہتی۔"

اشعر کے بے نیازانہ رویے میں بھی، اتنی تبدیلی تو ضرور آئی تھی کہ جتنے دن ان لوگوں کا ملتان میں قیام رہا۔ وہ اس سے آمنا سامنا ہونے پر مسکرا دیتا تھا۔ اور اس کی یہ مسکراہٹ آنے والے سالوں میں مومنہ کے لیے زادِراہ ثابت ہوئی تھی۔ ظاہر ہے منگنی کے بعد اس کا لاہور آنا جانا ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اسفی بھیا اور عینی آپا پڑھنے کے لیے لندن چلے گئے۔ اشعر اسلام آباد میں پڑھ رہا تھا اور ولی لاہور میں ہی تھا۔ اس کو کوئی اسکالرشپ تو مل نہیں سکتا تو اس نے جانا بھی کہاں تھا، یہ مومنہ کا خیال تھا کہ باقی تینوں اسکالرشپ پر ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مومنہ نے بی ایس کیا تھا۔ آگے پڑھانے کی ابا میاں میں استطاعت نہ تھی کہ اور بچے بھی زیرِ تعلیم تھے۔ ان ہی دنوں معمولی سی علالت کے بعد دادی بھی انہیں چھوڑ گئیں۔

دادی کے جنازے پر، چچا میاں اور چچی جان کے ساتھ اشعر اور ولی دونوں ہی آئے تھے۔ دادی مومنہ کے لیے، ماں کے برابر ہی تھیں کہ اس نے ان کے زیرِ سایہ بچپن سے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اگرچہ وہ غم سے نڈھال تھی لیکن مہمانوں کی دیکھ بھال، اماں کے ساتھ مل کرا سے ہی کرنا تھا۔ ان گزرے سالوں میں اشعر کچھ اور نکھر گیا تھا اور تو اور ولی بھی خاصا سنجیدہ ہو گیا تھا۔

اشعر کے انداز میں پہلے کی طرح ہی بے نیازی اور لاپروائی تھی۔ موقع ایسا نہ تھا کہ اس وقت وہ کچھ غور کرتی لیکن ان لوگوں کے جانے کے بعد، اس نے سوچا ضرور تھا اشعر ایسا کیوں ہے۔ پچھلی دفعہ کا مسکراتا چہرہ اسے خواب لگ رہا تھا۔

”شاید دادی کا انہیں بھی ہو گا۔“

وہ خود کو تسلی دیتی۔ عینی آپا نے اسے موبائل تحفے میں بھجوایا تھا وہ وقتاً فوقتاً اسے سب کی تصاویر بھیجتی رہتی تھیں۔ عینی آپا سے ہی پتا چلتا تھا کہ کون کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

اشعر کی ڈگری مکمل ہو گئی تھی۔ جاب سے پہلے وہ سیاحت کے لیے مختلف ملکوں میں گیا تھا۔ کبھی برف پوش پہاڑوں میں کوہ پیمائی کا لباس پہنے، گاگلز لگائے، اسٹک ہاتھ میں تھامے، سارے منظر کو پس منظر بنا دکھائی دیتا۔ کبھی ترکی کے بازاروں میں، قہوہ خانوں میں بیٹھا کسی قدیم داستان کا زندہ کردار محسوس ہوتا۔ وہ ہر منظر کا حصہ بن کر اسے مکمل کر دیتا تھا۔ پہلی بار مومنہ کو، اس کی چھا جانے والی مسحور کن شخصیت سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اسے اپنی دسترس سے بہت دور لگتا لیکن پھر جب عینی آپا اسے، اشعر کے نام سے چھیڑتیں تو وہ سارے وہم جھٹک دیتی۔ بس ان ہی جذبات کے اتار چڑھاؤ میں دن گزرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

منگنی کے بعد وہ سالوں لاہور نہیں گئی لیکن چچا میاں کا گھر اور اس گھر کے مکین، اس کے دل سے جڑے تھے۔ اشعر اس کے خوابوں میں کب آنے لگا اسے پتا بھی نہیں لگا۔ بس وہ بہت خاص ہو گیا تھا اس کے لیے۔ وہ نازاں تھی اپنے نصیب پر۔ اس یک طرفہ محبت نے اس کے چہرے پر گلال بکھیر دیے تھے۔

زندگی ان ہی خوابوں خیالوں کے بیچ گزر رہی تھی کہ ایک دن، ابا کے پاس چچا میاں کی کال آئی اس کے دو دن بعد ہی انہوں نے ولی کو اسے لینے بھیج دیا۔

چچی جان، ریڑھ کی ہڈی کی شدید تکلیف کا شکار ہو کر تقریباً اپاہج، بستر پر پڑی تھیں۔ گھر کا نظام درہم برہم تھا۔ ملازمین کے سر پر مالکن نہ ہو تو وہ بھی اپنی من مانی کرنے لگتے ہیں۔ چچی جان کی دیکھ بھال کے لیے، جو نگران خاتون رکھی گئی تھی وہ بھی کم ہی آرام کرنے پاتی تھی۔ غرض بہت سے مسائل تھے۔

اماں اگرچہ متامل تھیں لیکن ابا نے، بھائی کو مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اماں کو قائل کر کے اسے روانگی کی تیاری کا کہہ دیا۔ اشعر کے ساتھ ایک چھت تلے رہنے کے خیال سے، اس کا دل گھبرا بھی رہا تھا اور ایک انجان سا خوش کن احساس بھی تھا۔

ولی اس کو لینے رات کو پہنچا تھا اور صبح سویرے بمشکل، ناشتا کر کے واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

راستے میں مومنہ نے، چچی کی بیماری کی نوعیت اور علاج کے بارے میں سوالات کیے۔ ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے اسی سنجیدگی سے مختصر جوابات دیے جو اس کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے ولی؟ تم بہت بدل گئے ہو۔“ مومنہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”کیوں۔ کیا ہوا ہے مجھے؟“ ولی نے ایک لمحہ کے لیے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”تم تو بولتے نہیں تھکتے تھے۔ کانوں میں سوراخ ہو جاتے تھے لیکن تمہارے قصے کہانیاں ختم نہیں ہوتے تھے۔“

”وقت ایک سا رہتا ہے نہ انسان۔ تبدیلی تو کائنات میں ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ تم اپنے نازک دماغ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو۔“ اس نے ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا تو وہ بھی مسکرا دی۔

”اور سناؤ۔ اپنی گرل فرینڈز کے حال احوال؟“

”کوئی گرل فرینڈ نہیں میری۔ وہ بچپن کی باتیں تھیں۔“ وہ ڈرائیونگ پر دھیان مرکوز کرتے کچھ سنجیدہ ہوا۔

”ہائیں! کیا اٹھارہ برس کی عمر میں تم بچے تھے؟“ مومنہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

ولی نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے خول میں بند ہو گیا تھا۔ مومنہ نے بھی سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

”پتا نہیں چچا میاں کا نیا گھر کیسا ہو گا۔“ آنکھیں موندے وہ ان کے پرانے گھر کے فسوں خیز ماحول کو محسوس کر رہی تھی۔

ایک سال پہلے چچا میاں نے شہر کے پوش علاقے میں نیا گھر خرید لیا تھا۔ تصویروں میں تو بہت شان دار دکھتا تھا، لیکن مومنہ شاید ماضی میں رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کا دل پرانے گھر کی چاہ میں ہی تھا۔ گھر پر صرف چچا میاں اور چچی تھے۔ ولی اسے گھر چھوڑ کر گاڑی لے کر پھر کہیں نکل گیا تھا۔

وہ چچی کے کمرے میں ان کے بیڈ پر ان کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ وہ بہت نحیف ہو گئی تھیں۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

”ڈاکٹر تو کینسر کا شک ہے۔ بس یہی ٹیسٹ ہو رہے ہیں آج کل۔“ چچی کمزور آواز میں اسے اپنی بیماری کی نوعیت سے آگاہ کر رہی تھیں۔

وہ ایک شاک کی کیفیت میں منہ پر ہاتھ رکھے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ چچا میاں نے تو فون پر اتنی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ یا شاید ابا نے ان لوگوں کو اتنا ہی بتایا جتنا ضروری تھا۔

”تم فریش ہو کر تھوڑا آرام کر لو۔ پھر باتیں کریں گے۔“

چچی بہت بہادر تھیں۔ وہ سر ہلا کر وہاں سے اٹھ آئی کہ چچی کے سامنے فوراً خود پر سے ضبط کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اس کا کمرا چچی کے بالکل سامنے والا تھا۔ خوب صورت فرنیچر سے مزین بڑا سا کمرا۔ نارمل حالات ہوتے تو وہ ایک ایک چیز چھو کر محسوس کرتی لیکن اس وقت وہ غم زدہ ہو رہی تھی چچی کے لیے۔ چچا میاں کے لیے۔ باقی سب کے لیے۔

اسفر بھیا اور عینی آپا کی شادیاں، باہر ان کے ننھیال میں ہی ہوئی تھیں۔ اشعر کسی بڑی سی کمپنی کی ایگزیکٹو پوسٹ پر تھا اور ولی شاید اپنا کوئی بزنس سیٹ کر رہا تھا۔

رات کو کھانے پر سب ہی موجود تھے۔ اشعر نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے، ایک گہری نظر اس پر ڈالی تھی۔ اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کے سحر سے خود کو کبھی نہیں نکال سکتی تھی۔ تمام وقت نظریں نیچی کیے، وہ بمشکل چند نوالے ہی لے سکی۔ پھر چچی جان کے پاس جانے کا کہہ کر ڈائننگ ٹیبل سے ہی اٹھ گئی۔

اشعر کی پرسوچ نگاہوں نے، کمرے سے نکلنے تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ ولی اور چچا میاں خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہم جلد ہی مومنہ کو بیاہ کر اس گھر میں لے آئیں، اس گھر کو اس کی ضرورت ہے۔" چچا میاں نے اشعر کو مخاطب کیا۔

"ابھی تو بچی ہے وہ۔ گزارہ تو ایسے بھی ہو جائے گا۔" اشعر کے انداز میں لاپروائی تھی۔

"چند دنوں کے لیے آئی ہے وہ۔ یوں ہمیشہ نہیں بیٹھی رہ سکتی۔ تمہاری ماں کا علاج لمبا بھی ہے اور تکلیف دہ بھی، میرا خیال ہے ہم سادگی سے شادی کر لیتے ہیں۔"

"ایسے کیسے ہو سکتی ہے شادی۔" اشعر نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"کیوں اسفر اور عینی کی بھی تو ایسے ہی ہوئی تھی۔" چچا میاں کے پاس دلیل تھی۔

"وہ اور حالات تھے بابا!"

"حالات اب زیادہ دگرگوں ہیں اشعر!"

"اللہ سے بہتری کی امید رکھیں۔"

"ساری امیدیں اللہ سے ہی ہیں۔" چچا میاں نے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے گہری سانس لی۔

مومنہ نے گھر سنبھال لیا تھا۔ وہ سادہ مزاج، سادہ طبیعت کی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ چچا میاں اور چچی دونوں کو ہی اس کی موجودگی سے تسلی تھی۔ اگرچہ بیماری اور علاج، دونوں ساتھ ساتھ تھے لیکن اس ایک لڑکی کے آنے سے گھر، گھر لگتا تھا۔

چچا میاں کا نیا گھر بے پناہ خوب صورت اور جدید سہولیات سے مزین تھا لیکن اس کا دل، پرانے گھر میں ہی اٹکا تھا سو دل لگانے کو وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی، اس کے سر پر ہونے سے ملازم بھی مستعد تھے۔ چچی کی تنہائی کم ہوئی تو انہیں مایوس کن سوچوں سے نجات مل گئی۔ بظاہر زندگی رواں دواں تھی لیکن کچھ تھا جو اس کے دل کو کھٹکتا تھا۔

اشعر کی ہر وقت کچھ سوچتی، کچھ جانچتی نگاہیں اسے بے آرام کر دیتیں۔ وہ گزشتہ کئی برس سے یک طرفہ محبت کا شکار تھی، اسے امید تھی کہ اشعر بھی اس رشتے کے حوالے سے اس سے انسیت رکھتا ہوگا۔

کہانیوں، ڈراموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ عینی آپا کی باتوں سے بھی اس نے اپنی محبت کی ایک خیالی دنیا بنا رکھی تھی۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اشعر کی نگاہوں میں اسے، کچھ خاص تو کیا عام سا جذبہ بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ بس ایک روبوٹ تھا جس کی دنیا اس کی اپنی ذات سے شروع ہو کر، اس کی اپنی ذات پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔

چچی نے بھی بارہا اشعر سے جلد شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ مومنہ کے سامنے بھی ذکر چھڑ جاتا۔ لیکن اشعر کے انداز میں گریز ہوتا۔ کبھی ماں کو ٹال دیتا تو کبھی خاموشی اختیار کرتا۔ اتنا مشکل فیصلہ تو نہ تھا۔ برسرروزگار تھا۔ گھر بار سب کچھ تھا۔ اس کی شادی اس کے گھر کی ضرورت بھی تھی پھر بھی وہ کیوں خاموش تھا۔ مومنہ صحیح معنوں میں الجھ گئی۔

"کہیں یہ کسی اور کو تو پسند نہیں کرتے۔" روایتی کہانیاں ذہن میں امڈ آتیں۔ زبردستی رشتہ کیا ہوگا چچا میاں اور چچی نے۔ دماغ دور کی کوڑی لاتا۔ لیکن چچا میاں نے واضح طور پر دادی کے استفسار پر کہا تھا کہ اشعر کی رضامندی لے کر ہی رشتہ طے کرنے آئے ہیں۔

☆☆☆

ٹی وی پر نظریں جمائے وہ سوچوں میں غلطاں تھی جب ولی آ کر اس کے مقابل بیٹھا۔

"سنو مومنہ! کسی سے کہو مجھے ایک کپ چائے کا تو بنا دے سر میں شدید درد ہے۔" ولی کا چہرہ واقعی ستا ہوا تھا، وہ چچی کی رپورٹس لے کر ہاسپٹل سے آ رہا تھا جو تسلی بخش ہرگز نہ تھیں۔

مومنہ سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی ولی کو اسٹرونگ چائے پسند تھی۔ اس کی چائے بنا کر کپ میں ڈال ہی رہی تھی کہ اشعر نے، کچن میں داخل ہو کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"کچھ چاہیے آپ کو؟" وہ اسے دیکھ کر اپنائیت سے مسکرائی۔

"ظاہر ہے کچھ چاہیے تو ہی کچن میں آیا ہوں۔" اس کے انداز میں بے نیازی اور لاپروائی دونوں تھیں۔

"نہیں میرا مطلب ہے۔ کچھ چاہیے تو مجھے بتا دیں۔ میں دے دیتی ہوں۔" وہ خفیف ہوئی۔

"یار! ڈونٹ بی سو فارمل۔ میرا گھر ہے مجھے جس چیز کی ضرورت ہے میں لے لوں گا۔" وہ بیزار سا ہوا تھا اور مومنہ پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بمشکل گردن ہلاتی، ولی کی چائے ٹرے میں رکھ کر لاؤنج میں آئی تھی۔

"بہت شکریہ مومنہ!" چائے کی ٹرے میں پیالا ڈول دیکھ کر وہ اس لڑکی کے خلوص سے متاثر ہوا تھا۔

"آؤ بیٹھو تم کچھ دیکھ رہی تھیں ٹی وی پر۔"

"نہیں میں چچی جان کے پاس جا رہی ہوں، وہ جاگ گئی ہوں گی۔"

مومنہ کی ذہنی و قلبی حالت ایسی نہ تھی کہ زیادہ دیر تک اس کے سامنے کھڑی رہتی۔

رات دیر تک وہ جاگتی رہی کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، اس کی زندگی میں کچھ غلط ہو رہا تھا جس کا ادراک ابھی کسی کو نہ تھا۔

اندر کی گھٹن سے گھبرا کر وہ باہر لان میں نکل آئی۔ خنک ہوا میں سانس لیتے ہی اسے بہتر محسوس ہوا تو وہیں، ایک کرسی پر بیٹھ گئی اسے بیٹھے نجانے کتنے ہی پل بیت گئے تھے جب اس کی نظر اوپر اٹھی۔ ولی اپنے کمرے کے باہر ٹیرس کی گرل پر جھکا نجانے کن سوچوں میں مگن تھا کہ اس نے لان چیئرز پر بیٹھی مومنہ کو دیکھا تک نہ تھا۔

"اسے کیا ہو گیا۔ یہ کیوں اتنا سنجیدہ ہو گیا ہے۔"

مومنہ بلب کی زرد روشنی میں اس کا جھکا سر دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اشعر کی بیگانگی، بے رخی، گریز سب کچھ بھول کر ولی کے بارے میں سوچنے لگی۔

اشعر تو چلو شروع سے ہی ایسا تھا، ولی بھی اسے نارمل نہیں لگتا تھا۔ یہی سوال وہ اگلے دن چچی جان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"محبت ہو گئی تھی اسے اپنی کلاس فیلو سے۔" چچی کے لہجہ میں افسوس تھا۔

"آپ کو یاد نہیں چچی جان! اس کی تو ہر وقت اتنی بہت سی گرل فرینڈز ہوا کرتی تھیں۔"

"دوستی تو بہت سوں سے تھی۔ تمہارے چچا میاں اور میں، ہمیشہ سمجھاتے تھے لیکن اپنی کھلنڈری اور بے باک فطرت کی وجہ سے ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔ لیکن وہ لڑکی ثمن، جب اس کی زندگی میں آئی تو بہت بدل گیا تھا۔ اس کے لیے سنجیدہ تھا۔ اپنے ابا کو اور مجھے راضی بھی کر لیا تھا۔ ڈگری مکمل کر کے رشتہ بھیجنا چاہتا تھا اس کے گھر، لیکن جب انتخاب کا وقت آیا تو ثمن نے اس پر اپنے فارن کوالیفائیڈ کزن کو ترجیح دی۔

غلطی ہماری بھی تھی ساری زندگی ہم لوگ اسفر اور اشعر سے اس کا موازنہ کرتے رہے۔ ٹھیک ہے۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ ان جیسا نہ تھا اچھے گریڈز اپنے بہن بھائیوں کے گولڈ میڈلز کے ڈھیر میں دب کر رہ جاتے۔ ہم نے اس کو وہ اہمیت نہیں دی جو اس کا حق تھا۔ وہ لاپرواہ ہوتا گیا۔ باہر دوستیاں پال لیں۔ لڑکے لڑکیاں دونوں ہی تھے اس کے دوستوں میں لیکن ہمیں، ہمیشہ یہی لگتا کہ یہ خرافات میں پڑ گیا ہے۔ پھر ثمن کے لیے جب وہ سنجیدہ ہوا اور پڑھائی پر فوکس کر کے، ڈگری مکمل کی بلکہ جاب ڈھونڈ رہا تھا جب اس نے اسے مسترد کر دیا۔

بڑی مشکل سے سنبھلا تھا، وہ بس اس کی شوخیاں، شرارتیں ختم ہو گئی ہیں۔ میچور ہو گیا ہے۔ اب تو ماشاءاللہ اپنا بزنس سیٹ کر رہا ہے۔ اشعر کے بعد اگر اللہ نے مہلت دی تو اس کے لیے بھی اچھی سی لڑکی ڈھونڈوں گی۔ بلکہ تم بھی دیکھو اپنے آس پاس اگر کوئی سلجھی ہوئی بچی ہو تو۔"

چچی جان نے تفصیل سے بتایا تو مومنہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ ولی سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

اسے بھی لگا وہ اور ولی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اسے بھی اشعر سے منسوب ہونے کے بعد وہ اپنی دسترس سے، دور کسی سلطنت کا مغرور شہزادہ لگتا۔ خیالی خود پرست، ہاں خود پرست ہی تو تھا وہ، جسے اپنے آگے شاید ہی کوئی نظر آتا تھا۔

جب وہ لا ہور آئی تو ایک دن چچی جان اس سے مومنہ کی تعریف کر رہی تھیں اس کے طریقے سلیقے، گھر گرہستی کی۔ مومنہ شرمندہ ہو رہی تھی اتنی تعریفیں سن کر۔

"ظاہر ہے ساری عمر گھر داری ہی سیکھی ہے اس نے، ورنہ آج کل تو لڑکیاں ہر فیلڈ میں لڑکوں سے آگے ہیں اور یہ محترمہ، گھر کو چمکانے میں ہی زندگی کے قیمتی لمحات گزارے چلی جا رہی ہیں۔ ویسے مومنہ! تم نے کچھ اپ ڈیٹ کرنے کا کبھی نہیں سوچا۔"

وہ سراسر اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"فضول مت بولو! ایسی لڑکیاں قسمت والوں کو ملتی ہیں۔" چچی جان نے نقاہت زدہ لہجے میں اسے ڈپٹا۔ مومنہ کا اترا ہوا چہرہ ان سے مخفی نہ تھا۔

"ہاں جی۔ یہی فرمان عالی شان سالوں سے سن رہا ہوں۔ بہر حال مجھ جیسی تابع دار اولاد بھی قسمت والوں کو ملتی ہے، جو کچھ بھی سوچے بغیر ماں باپ کے فیصلوں کو تسلیم کرلے۔" وہ ہنستے ہوئے گویا خود کو داد دے رہا تھا۔

"تم اس کی باتوں کو دل پر مت لینا۔ یہ شروع سے ہی منہ پھٹ ہے لیکن دل کا برا نہیں۔"

اس کے جانے کے بعد چچی نے مومنہ کا ہاتھ اپنے نحیف ہاتھوں میں لے کر تسلی دینا چاہی۔ وہ پھیکا سا مسکرا دی تھی، لیکن اس کی ایک غلط فہمی ضرور دور ہوگئی کہ مومنہ سے رشتہ کے لیے اس کی رضامندی اصل میں اس کی تابعداری تھی، ورنہ مومنہ اس کی ترجیحات میں شاید آخری نمبر پر ہوتی۔

☆☆☆

وہ بے کل ہوئی پھر رہی تھی پورے گھر میں، چچی جان کے علاج کا پہلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا، جس کے لیے انہیں چند روز کے لیے اسپتال ایڈمٹ ہونا تھا۔ مومنہ اس مرحلے پر کمزور پڑ کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو دل و دماغ میں جاری جنگ سے دھیان ہٹا کر اس نے پوری توجہ، چچی جان پر مرکوز کر دی۔ وہ دن رات اسپتال میں رہتی تھی۔ دن میں چچا میاں بھی ہوتے لیکن رات کو اشعر یا ولی ہوتے تھے۔

"تم رات کو گھر چلی جایا کرو۔ تھک جاؤ گی موی۔" ولی نے اس کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ ایک دو دن کی تو بات ہے اور ویسے بھی چچی کو میری ضرورت ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو موی!" ولی نے فراخ دلی سے اعتراف کیا۔ "لیکن......"

"لیکن کیا!" مومنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"لیکن اچھے لوگوں کو دنیا والے جینے نہیں دیتے۔ اپنے لیے تھوڑا خود غرض ہونا سیکھ لو۔" اس کا اشارہ نہ جانے کس طرف تھا لیکن مومنہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"ولی! مجھے چچی نے ثمن کے بارے میں بتایا تھا۔" مومنہ نے کہا تو اس کی آنکھوں میں ناگوار تاثر ابھرا۔

"وہ دنیا کی آخری لڑکی نہیں تھی۔ تم اپنے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈو۔ چچی تمہارے لیے فکر مند رہتی ہیں۔"

"ہوں۔" اس نے دونوں ہتھیلیاں سر کے پیچھے رکھ کر صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

"کیا ہوا! صحیح کہہ رہی ہوں اگر تمہیں کوئی پسند نہیں کرنی تو ہمیں بتاؤ ہم ڈھونڈ لیتے ہیں۔ لیکن ولی تمہارے گھر کو ایک اچھی لڑکی کی ضرورت ہے۔"

"اشعر سے شادی کے بعد تم سنبھال تو لوگی ہمارا گھر۔ ہمیں کیا فکر۔" وہ غنودگی میں جانے لگا۔

اشعر کے ذکر پر اس کے دل میں ایک بار پھر اتھل پتھل ہوئی۔

"کل کیا ہوگا۔ کس نے دیکھا۔" وہ صوفے سے اٹھ کر کرسی پر آن بیٹھی کہ ولی صحیح سے سو جائے۔

رات کے جانے کس پہر ولی کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ کرسی پر پاؤں اوپر کیے نہایت بے آرام پوزیشن میں سو رہی تھی۔ ولی کافی دیر تک بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ کتنا بے غرض اور سادہ چہرہ تھا۔ دنیا میں اچھائی کا وجود باقی ہے۔ ولی گھر میں اسے ہر کسی کی فکر میں مبتلا دیکھ کر اکثر سوچا کرتا تھا۔

"سنو موی!" اس نے مومنہ کا شانہ ہلایا۔

"ہاں کیا؟" وہ ایک دم چونکنا ہوئی۔

"یہاں صوفے پر آجاؤ۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر لیٹ جاؤ تم۔" وہ صوفے پر اس کے لیے تکیہ سیٹ کرتا باہر نکل گیا تو مومنہ بھی خاموشی سے صوفے پر آکر لیٹ گئی۔

صبح آفس جانے سے پہلے اشعر اسپتال آیا تھا۔ مومنہ چائے کے ساتھ بسکٹ کھا رہی تھی جو ولی کینٹین سے اس کے لیے لایا تھا۔ چچی ادویات کے زیر اثر غنودگی میں ہی تھیں۔

"واہ۔ یہاں تو عیش ہو رہے ہیں۔" اشعر نے شاید مذاق کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ عیش نہیں ہے ناشتا ہے۔" مومنہ نے تصحیح کی۔

وہ چچا میاں کو چھوڑنے آیا تھا۔ پھر چچا میاں نے ہی زبردستی، مومنہ کو فریش ہونے کے لیے اس کے ساتھ گھر بھیج دیا تھا۔

"تمہیں گھر ڈراپ کرنے کے لیے آؤٹ آف دا وے جا رہا ہوں، وگرنہ میرا آفس یہاں سے بس پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔"

یہ وہ اس ہستی کو کہہ رہا تھا۔ جو اپنے گھر اور گھر والوں سے سینکڑوں میل دور، اس کی ماں کی دیکھ بھال کی خاطر خود کو وقف کیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

دو دن اسپتال میں مزید گزار کر چچی گھر آگئی تھیں۔ گھر آکر بھی وہ دوائیوں کے زیر اثر غنودگی میں تھیں۔ مومنہ نے ان کے پاس ہی سونا شروع کر دیا تھا۔

اسفی بھیا اور عینی آپا بھی چھٹیوں پر آرہے تھے۔ ولی بھی زیادہ وقت ماں کے ساتھ گھر پر ہی گزار رہا تھا۔ اپنا کام وہ آن لائن مینیج کر رہا تھا۔ اشعر کی روٹین اسی طرح مصروف تھی۔ صبح کا آفس گیا رات گئے لوٹتا تھا۔

مومنہ دن گن گن کر گزار رہی تھی عینی آپا کی آمد کے فوراً بعد، اس کا بھی گھر واپسی کا ارادہ تھا۔ اس ماحول سے وہ جلد از جلد نکل جانا چاہتی تھی۔

چچی کے سونے کے بعد وہ لان میں بیٹھی۔ اپنے اندر کی گھٹن کو کم کرنے کے لیے اسے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟" ولی کی گاڑی پورچ میں رکی تو اسے دیکھ کر وہ وہیں چلا آیا۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ دماغ ماؤف سا ہو رہا تھا۔

"او ہیلو۔ مومنہ! کیا ہوا؟ تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

ولی نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ ایک دم سے جیسے حواسوں میں آئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔"

"اداس ہو رہی ہو؟" ولی اس کے برابر آن بیٹھا۔

"ہاں۔ نہیں تو۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا کر انکار کیا۔

"ہوں۔ ڈسٹرب بھی ہو۔" ولی نے گہری

سانس لی۔

"اشعر نے کچھ کہا ہے؟" وہ اس کے اندر تک اتر رہا تھا۔

"نہیں۔ وہ بھلا مجھے کیا کہیں گے۔" وہ سنبھلی کہ کھلی کتاب بننا اسے گوارہ نہیں تھا۔

"یہی تو مسئلہ ہے وہ کچھ کہتا نہیں۔" ولی بڑبڑایا پھر بولا۔

"تم کچھ دنوں کے لیے گھر چلی جاؤ۔ اماں کا خیال میں رکھ لوں گا۔"

"نہیں۔ بس اب تو عینی آپا آنے والی ہیں۔ ان کی آمد کے بعد ہی جاؤں گی۔" اس نے انداز میں بشاشت پیدا کی۔

"ولی! تم چچی کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ کیوں تم نے ایک لڑکی کی خاطر خود کو جوگ لگا رکھا ہے۔" اس نے خود پر سے ولی کی توجہ ہٹانے کے لیے سوال کیا۔

"جوگ اور میں نے۔ واٹ آ جوک۔" ولی کھل کر ہنسا۔ "یار! زندگی نے مجھے ایک سبق ضرور سکھایا تھا لیکن جوگ ووگ کچھ نہیں۔"

"تو پھر لڑکی ڈھونڈو۔"

"لڑکی نہ ہوئی جاب ہو گئی جو ڈھونڈوں۔" وہ برا مان گیا۔ "جو قسمت میں ہوگی مل جائے گی۔ شاید اشعر کی طرح میری بھی قسمت جاگ جائے۔ اسے تو بیٹھے بٹھائے اصغری بیگم مل گئیں۔" وہ مومنہ کو چھیڑ رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے تم رہنے دو۔ میں خود تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈوں گی۔ بس یہ بتا دو کہ میری پسند پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔" مومنہ نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھانا چاہا۔

"بس اپنی جیسی ڈھونڈنا۔" ولی سنجیدہ تھا۔

"مذاق اڑا رہے ہو۔"

"نہیں۔ دل کی خواہش بتا رہا ہوں احمق لڑکی!" ولی اس کے سر پر چپت لگاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

[illegible]

ہی مجھے احمق سمجھتے ہیں۔ اشعر سے ہٹ کر اس کی توجہ ولی کی طرف ہو گئی تھی اور ولی اندر کمرے میں آ کر اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا، جسے تیسری بار آج اس نے اشعر کے ساتھ دیکھا تھا۔

"عینی آپا سے بات کروں گا کہ کیا معاملہ چل رہا ہے۔" ولی نے ارادہ باندھا۔

☆☆☆

اسفی بھیا اور عینی صبح سویرے پہنچ گئے تھے۔ چچی کی حالت دیکھ کر دونوں بہت رنجیدہ تھے۔ ماں باپ اور اولاد کے بیچ سات سمندر حائل ہو جائیں تو دل یوں ہی رنجیدہ ہوتے ہیں۔ بہرکیف اس وقت وہ چاروں بہن بھائی اشعر کے کمرے میں جمع تھے۔

رات کے کھانے کے بعد وہ ان سے چائے کا پوچھنے جا رہی تھی، جب اشعر کے منہ سے اپنا نام سن کر وہیں ساکت ہو گئی۔

"مومنہ۔ مومنہ۔ مومنہ۔ آخر آپ سب لوگوں کے حواسوں پر وہ بری طرح کیوں سوار ہو گئی ہے۔"

"تم بتاؤ پہلے کہ سالوں بعد، تمہیں اس سے اچانک کیا پرابلم ہو گئی ہے، جو یوں بی ہیو کر رہے ہو۔ وہاں بھی کالز کر کر کے تم نے مجھے اتنا پریشان کیے رکھا۔ اس کڑے وقت میں جو لوگ ہمارے ساتھ کھڑے ہیں، ان کے ساتھ اتنا ظلم تم کیسے کر سکتے ہو۔" عینی آپا سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

"یار! یہ ڈائیلاگز بول کر مجھے مت الجھاؤ۔ میں نے سیدھی بات کی ہے۔ میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھ رہا۔"

"ہاں بالکل، تم جیسا عظیم انسان کسی کو دھوکا دے بھی نہیں سکتا۔ تم سدا کے خودغرض۔ اپنے مفاد کے آگے ہمیشہ سے ہی دوسروں سے آنکھیں پھیر لیتے ہو۔" ولی بھڑک اٹھا۔

"ہاں اتنا ہی برا ہوں نا تو تم خود کر لو اس سے شادی۔"

"بکواس بند کرو تم!" اسفی بھیا کو بھی طیش آیا۔

"دیکھو اشعر! مجھے اچھی طرح یاد ہے مومنہ کا رشتہ مانگنے سے پہلے، بابا اور اماں دونوں نے تم سے رائے مانگی تھی۔ اپنا فیصلہ تمہارے سر نہیں تھوپا تھا۔"

"ہاں تو میں کب انہیں قصوروار ٹھہرا رہا ہوں، اپنی غلطی مان رہا ہوں نا کہ میں امیچور تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ لڑکی خوب صورت ہو بس کافی ہے۔ لیکن یار! آج کے دور میں شکل و صورت ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ شانزے، مومنہ کے مقابلے میں خوب صورت نہیں لیکن جب وہ بولتی ہے نا تو سامنے والوں پر سحر طاری کر دیتی ہے۔ کیریئر اورینٹڈ ہے۔ ملٹی ٹیلنٹڈ ہے۔ جب وہ پریزنٹیشن دیتی ہے نا تو سامنے بیٹھے لوگ دم سادھ لیتے ہیں۔ معمولی نین نقش کے باوجود اس کی ڈریسنگ سینس اس کو سارے مجمع میں ممتاز کر دیتی ہے۔ تم خود بتاؤ میں مومنہ کو کس بنیاد پر اس پر ترجیح دوں۔"

"اشعر! تم اس لڑکی کے ساتھ بہت بڑا ظلم کر رہے ہو۔ اس کو ایسا روگ لگا رہے ہو جو آنے والے دنوں میں اس کا جینا محال کر دے گا۔ دل کو سمجھا لے گی تو معاشرہ جبڑے کھولے اسے نگلنے کو تیار ہوگا۔ سالوں تمہارے نام سے منسوب رہنے کے بعد کون اسے قبول کرے گا۔" عینی آپا حساس تھیں اس لیے سسک اٹھیں۔

اور دروازے کے باہر کھڑی مومنہ کے سر پر آسمان آن گرا تھا۔ اشعر نے اس کی ذات دو کوڑی کی کر کے رکھ دی تھی، اس سے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ اسی لمحہ ولی کمرے کا دروازہ کھول کے باہر نکلا تھا۔

"مومی!" وہ اسے روک کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن سفید پڑتے چہرے کے ساتھ مومنہ الٹے قدموں وہاں سے نکلی تھی۔

☆☆☆

لاہور میں آج اس کی آخری رات تھی اور یہ رات اس کے لیے شب ہجر بن گئی تھی۔ اس کے کمرے کے در و دیوار اس کے اس رت جگے کے گواہ تھے۔ وہ تو اشعر کو بددعا بھی نہیں دے سکتی تھی کہ اتنے سالوں، اس کی ساری دعاؤں کا مرکز وہی ایک شخص تھا۔

ایک اور طویل رات اس نے جاگتی آنکھوں میں گزاری تھی۔ سارے حساب کتاب کے بعد اس کی ذات، خسارے کی زد میں تھی لیکن اسے جوگ نہیں لینا تھا یہ تو طے تھا۔

صبح اس کی واپسی تھی۔ وہ اٹھی ہوئی گردن کے ساتھ سب سے مل کر واپسی کے لیے ولی کے ساتھ نکلی تھی۔ سوائے ولی کے کسی کو شائبہ تک نہیں گزرا کہ وہ اشعر کی اپنی ذات کو صفر کرنے والی گفتگو سن چکی ہے۔

اس کی متورم آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ، جانے کیسے ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہ گیا تھا لیکن ولی، اس سے نظریں چرائے ہوا بدقت تمام ڈرائیونگ پر توجہ مبذول کیے ہوئے تھا۔ دل اس کے دکھ پر قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ نارسائی کا عذاب وہ جھیل چکا تھا اور یہ لڑکی، کتنی اعلا ظرف تھی کہ ایک لفظ شکایت کا کہے بغیر ان کے گھر سے نکلی تھی۔ اس کا ذہن زیادہ ماؤف ہوا تو، درختوں سے گھری لمبی بل کھاتی سڑک پر ولی نے ایک طرف گاڑی روک دی۔

مومنہ چونکی، شاید سفر تمام ہو گیا تھا لیکن نہیں ابھی تو مسافت باقی تھی۔ اس نے ذرا کی ذرا سوالیہ نظروں سے ولی کو دیکھا جو لب بھینچے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"مومی! یار ہمیں معاف کر دو۔" اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔

"تم لڑو جھگڑو، شکوہ شکایت کرو۔ آنسو بہاؤ۔ لیکن یوں نہ کرو۔" اس نے گویا التجا کی تھی۔

مومنہ کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔

آنکھیں میچ کر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن آنسو بے قابو ہو گئے۔ ولی نے اسے رونے دیا، وہ چاہتا تھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ جلد ہی آنسو پونچھتے ہوئے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ دل واقعی کچھ ہلکا ہوا تھا۔

"مجھے ابا میاں کی فکر ہے۔ جس دن انہیں پتا چلے گا وہ بری طرح ٹوٹ جائیں گے۔" اس نے دل میں آئے خدشات کو زبان دی۔

ولی کیا کہتا۔ وہ خود واقف تھا اس قیامت سے جو ابھی دونوں گھروں کے بڑوں پر گزرنی تھی جب اشعر کا انکار ان تک پہنچے گا۔ ایک شخص کی غلطی کا خمیازہ، کتنے لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے اسے بخوبی ادراک تھا۔

☆☆☆

مومنہ کو گھر پہنچا کر وہ فوراً واپسی کے لیے نکلا تھا۔ وہ ان لوگوں سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ اپنا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی وہ، اشعر کا بھائی ہونے کے ناتے خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ اس کے واپس پہنچنے پر پتا لگا گھر میں بھی اشعر کا لایا ہوا طوفان سب کے جذبات تہہ و بالا کر چکا ہے۔ اماں کی حالت کے پیش نظر ان سے یہ بات چھپائی گئی تھی لیکن اسفی بھیا نے بابا کے گوش گزار ان کے سپوت کے خیالات کر دیے تھے۔

بابا جیسے نرم دل انسان جس نے کبھی کسی جانور کو بھی تکلیف نہیں دی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے دل کو چیرنے کی ہمت کہاں سے لاتے، سو ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔

دوسری طرف ابا اور اماں، مومنہ کے اترے چہرے کو چچی کی تیمارداری اور گھر سے دور رہنے کی تھکن سے جوڑ کر، اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چچی جان کی صحت کے حوالے سے فکرمند تھے۔

ایک ہفتہ تک مومنہ کا دل، فون کی ہر گھنٹی کی آواز پر اچھل کر حلق میں آ جاتا۔ اسے چچا میاں کی کال کا انتظار تھا۔ طوفان کے آگے کوئی کتنی دیر تک بند باندھ سکتا ہے، سو خبر کو ابا تک پہنچنی تھی یہ اسے معلوم تھا۔

اپنے فون سے وہ اشعر کی ساری تصویریں ڈیلیٹ کر کے، اپنے تئیں اشعر کا باب اپنی زندگی سے ختم کر چکی تھی۔ اس کے پاس اشعر کا دیا۔ کوئی ایک جملہ، پیار کی ایک نظر، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بس اس کے اپنے جذبات تھے جہاں اس نے اشعر کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ سو اپنے احساسات کو سلا نا تھا اور اس میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوتی، اگر اشعر کے خیالات اپنے بارے میں اپنے کانوں سے نہ سن چکی ہوتی، بس اب تو صرف ایک دکھ تھا اپنی ذات کی بے وقعتی کا۔

چچا میاں کی کال تو نہیں آئی البتہ ایک شام ولی کے ہمراہ انہوں نے خود آ کر ابا کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی طلب کی تھی۔ ابا بھی مومنہ کے باپ تھے، انہیں بھی اپنا اور اپنی بیٹی کا بھرم عزیز تھا، سو خود کو سنبھالتے ہوئے بھائی کے جڑے ہاتھوں کو الگ کر کے انہیں عزت سے اپنے سامنے لا بیٹھا۔

"رشتے ناتے مقدر کی بات ہیں، بھائی بھائی ان باتوں کی وجہ سے جدا نہیں ہو سکتے۔"

اماں تک، شوہر کی نظروں میں چھپی التجا پہنچی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ سر کے سائیں کا مان نہ رکھتیں۔ فوراً چچا میاں کی خاطر مدارت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

مومنہ کا دل اپنے ماں باپ کی اعلیٰ ظرفی پر بھر آیا۔ رات گئے تک ابا میاں، چچا اور اماں نجانے کیا دکھ شیئر کر رہے تھے۔ مومنہ چھت پر چلی آئی۔

"سنو مومنہ!" چاندنی رات میں چھت پر بلا مقصد ٹہلتی مومنہ کو ولی کی آواز پر قدم روکنا پڑے۔

"تمہیں پتا ہے ہم آج کیوں آئے ہیں؟"

"اشعر کا انکار پہنچانے۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"نہیں صرف اشعر کا انکار پہنچانے نہیں بلکہ ابا میاں کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اپنا سفارشی بنا کر۔" دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر، وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔ مومنہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کیا مذاق ہے۔" وہ طیش میں آ گئی۔

"یہ مذاق نہیں میرے دل کی خواہش ہے۔" اس کے اطمینان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

"تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو یا ہمدردی کر رہے ہو، جو بھی ہے لیکن میرے نزدیک یہ ناقابل قبول ہے۔ اس ٹاپک کو یہیں کلوز کر دو۔"

"کیوں کیا برائی ہے مجھ میں؟"

"کوئی برائی نہیں تم میں، لیکن تم اشعر کے بھائی ہو۔"

"وہ اشعر جس نے تمہیں ریجیکٹ کیا ہے۔"

"نہیں وہ اشعر، جس کا نام اپنے نام سے جڑنے کے بعد میں نے خود کو اس کی امانت سمجھتے ہوئے ہر پل اسے سوچا اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے۔" وہ بے رحم ہوئی۔

"سو واٹ، خواب تو میں نے بھی کسی کے دیکھے تھے۔" ولی کے نزدیک یہ غیر اہم بات تھی۔

"ولی! میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ یہ اگر تمہاری اپنی خواہش ہے تو بالکل بچکانہ ہے اور اگر چچا میاں اور ابا کو خوش کرنے کے لیے، خود کو قربانی کے لیے پیش کر رہے ہو تو میں کم از کم تمہیں اپنے ساتھ یہ ظلم کرنے ہرگز نہیں دوں گی۔"

"یہ میری خواہش ہے۔ میں کسی کی دل جوئی کے لیے خود کو قربان نہیں کر رہا۔"

"میں تم پر اور تمہارے دعوے پر یقین نہیں کروں گی، اشعر بھی راضی تھا اس رشتے پر، لیکن کیا نتیجہ نکلا۔"

"رضامندی اور خواہش میں فرق ہوتا ہے۔"

"خواہشات بدلتی رہتی ہیں۔" اس نے رخ موڑا۔

"میں کوئی دعویٰ نہیں کروں گا۔ میرا عمل مجھے صحیح ثابت کرے گا۔"

"تم یہ فضول بات اپنے ذہن سے نکالو اور نیچے آؤ، میں کھانا لگانے لگی ہوں اور سنو۔ میرے ابا اس فیصلے کو کبھی نہیں مانیں گے۔"

"تمہارے ابا کو اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نے اپنا مقدمہ خود لڑا ہے ان کے آگے۔ ان کو قائل کیا ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"میرے ابا میری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔"

"ہاں یہ بات تمہاری درست ہے۔ چچا جان نے فیصلے کا اختیار تم پر ہی چھوڑا ہے۔"

"تو بس قصہ ختم، تم نیچے چلو، کھانے کو دیر ہو رہی ہے۔ صبح تم لوگوں کو جلدی نکلنا ہے۔" مومنہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

"مونی۔" اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ ولی کی گرفت میں تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

"فیصلہ سنانے میں اتنی عجلت نہ کرو۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ مجھ سے بہتر تمہیں کوئی ملا تو تم میری پابند نہیں لیکن میری بات کو سوچنا ضروری۔"

نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر وہ اس سے پہلے ہی سیڑھیاں اتر گیا۔

☆☆☆

اگلے ہی دن عینی آپا کی کال آ گئی۔ وہ بھی ولی کی ہی زبان بول رہی تھیں۔

"آپا! دیکھیں۔ مجھے آپ کی نیت پر شک نہیں لیکن ایک گھر میں ایک بھائی کے ساتھ میں سالوں منسوب رہی، اب اسی کے چھوٹے بھائی کے ساتھ رشتہ قائم کر لوں، یہ کتنی عجیب بات ہے۔"

"عجیب ضرور ہے پر غلط نہیں۔ نہ شرعی طور پر نہ اخلاقی لحاظ سے۔"

"مت مانیے آپا! میں اس ایشو پر بات بھی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ چچی جان کا بتائیں وہ کیسی ہیں؟"

ان کے دوٹوک انداز پر عینی آپا ٹھنڈی سانس بھر کر اماں کے بارے میں بتانے لگیں۔

☆☆☆

زندگی معمول کی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ اشعر کے خیال سے دل میں سناٹا آتا اور بس۔ وہ خالی الذہن ہو رہی تھی۔ یک طرفہ محبت کی کونپل محبوب کی عدم توجہ سے پنپنے سے پہلے ہی مرجھا جاتی ہے لیکن جڑیں، دل کی زمین میں پیوست رہ جاتی ہیں۔ سازگار حالات کے انتظار میں لیکن محبوب کے زہریلے الفاظ، اسے جڑوں سمیت اکھاڑ ڈالتے ہیں، جس کے بعد نہ محبت رہتی ہے اور نہ محبوب تو یہی مومنہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اب نہ محبت تھی نہ محبوب بس دکھ تھا اپنی ذات کی پامالی کا۔ کاش اس کی ذات کسی دوسرے کے ساتھ غلط پیمانے میں تول کر ہلکی قرار نہ دی جاتی کاش وہ اشعر کے الفاظ نہ سنتی لیکن پھر سوچتی کہ اشعر کے الفاظ ہی تو اسے ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں ورنہ تو شاید وہ پورے قد سے ڈھے جاتی لیکن حقیقت قبول نہ کرتی۔

ولی اپنی مستقل مزاجی سے قطرہ قطرہ پانی ڈال کر اس کے پتھر دل میں سوراخ کرنا چاہتا تھا۔

"سنو مومی! میں جھوٹ نہیں بولوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ لیکن یار، میرے دل میں تمہاری قدر ہے اور تمہارا ساتھ ملے گا تو محبت کے سفر میں ہم دونوں ہم قدم ہوں گے۔"

ہواؤں کی لہروں کے ساتھ، سفر کرنے والے پیغام نے اس کے موبائل اسکرین پر ارتعاش پیدا کیا تھا ایسے نجانے کتنے میسج اسے روز موصول ہوتے تھے جن کا جواب دینا اس نے کبھی ضروری نہیں سمجھا۔ امید تھی کہ اس کی بے رخی سے تنگ آکر وہ اپنے قدم پیچھے ہٹالے گا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مستقل مزاجی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

رات کے ڈھائی بجے اس کی آنکھ متواتر بجنے والے فون سے کھلی تھی۔

"یا اللہ خیر!" اسکرین پر ولی کا نمبر دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ دل میں چچی جان کی صحت اور زندگی کی دعا مانگتے ہوئے اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔

"سنو مجھے نیند نہیں آرہی۔"

"کیا مذاق ہے۔ رات کے اس پہر تم نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے۔"

"نہیں بتانا تو کچھ اور بھی ہے۔"

"ولی پلیز، اس وقت مجھے کچھ نہیں سننا تم دن میں کال کرنا۔"

"سنو، میں آہستہ آہستہ تمہاری ذات کے حصار میں محسوس کر رہا ہوں خود کو۔ کیا اس کی محبت کہتے ہیں؟"

"نہیں، اس کو دماغ کی خرابی کہتے ہیں۔"

"مومنہ...... مجھے پتا ہے تمہاری کون سی بات سب سے زیادہ پسند ہے۔" ولی اس کو جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔

"جب ثمن نے مجھے ریجیکٹ کیا نا تو میں غم، غصہ، مایوسی، نفرت، ہر منفی جذبے کا شکار ہو گیا نفرت مجھے ثمن سے ہوئی تھی۔ غم اپنی محبت کی نارسائی کا تھا۔ غصہ اپنی بے بسی پر اور مایوسی مستقبل سے تھی۔ میں خود سے بھی خفا تھا اور ساری دنیا سے بھی۔ ایک وقت آیا جب میں ڈپریشن کی انتہا پر خود کو ختم کرنے تک کے پلان بنانے لگا لیکن پھر اللہ کا کرم ہوا اور میں نے خود کو سنبھال لیا۔

جس دن اشعر کی باتیں تم نے سنیں، یقین کرو ساری رات میں ایک پل نہیں سویا۔ مجھے لگا تم جیسی حساس لڑکی صبح کا سورج نہیں دیکھ پائے گی۔ لیکن تم جب خود کو سنبھالے تم کمرے سے نکلیں اور کسی پر بھی کچھ ظاہر کیے بغیر، میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھیں تو مجھے تم پہاڑوں کی طرح مضبوط محسوس ہوئیں۔ مجھے امید تھی کہ تم، اشعر کے آگے آنسو بہا کر اسے اس فیصلے سے روکنے کی کوشش کروگی یقین کرو، میں چھ فٹ کا مرد ہو کر ثمن کے آگے گڑگڑایا تھا۔ لیکن تم نے جس طرح اپنے وقار کو مقدم رکھا۔ میرا دل اسی لمحے تمہارا اسیر ہو گیا تھا۔ مجھ جیسے کمزور مرد کے دل میں تم جیسی مضبوط اور باوقار لڑکی کے ساتھ کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ تمہاری آنکھیں اور تمہارا چہرہ، تمہارے درد کے گواہ تھے لیکن تمہارا طرز عمل تمہارے نسوانی وقار کا عکاس تھا۔"

ولی کی آواز بہت آہستہ تھی اور مومنہ کا دل دکھ رہا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میرے دل میں تمہارے ساتھ کی خواہش پیدا ہوئی تھی، محبت نہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں، ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو رہی ہے۔ مومی! میں کمزور انسان ہوں۔ تمہارا ساتھ مجھے مضبوط کر دے گا۔ تم ایک بار سوچو تو سہی......"

"ولی! ہم دن میں بات کریں گے۔" مومنہ نے نرم لہجہ میں اسے ٹوکتے ہوئے کال منقطع کی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ باقی رات اس نے جاگ کر گزارنی تھی۔

☆☆☆

چچی اماں کی طبیعت میں کچھ بہتری آئی تھی۔ اشعر اور شازے کی شادی طے ہو گئی تھی۔ اماں نے یہ خبر اس سے چھپانا چاہی تھی لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ کب ممکن تھا۔

ان کا خیال تھا اسے تکلیف ہوگی۔ خیال تو مومنہ کا بھی یہ ہی تھا لیکن خلاف توقع اس کا دل ہر قسم کے جذبے سے خالی رہا۔ نہ حیرت، نہ خوشی، نہ غمی۔ اسے دکھ ہوتا اگر اس نے حقیقت تسلیم کرنے کے بجائے، راہ فرار اختیار کی ہوتی جب کہ اس نے تو پہلے دن حقائق کے آگے سر تسلیم خم کیا تھا۔

☆☆☆

پرانے دن ایک بار پھر لوٹ آئے تھے۔ اس نے فراغت سے تنگ آکر ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ دن یوں ہی گزر رہے تھے۔ زندگی کافی حد تک سیٹ ہو گئی تھی۔ ولی نے اسے ٹائم دیا تھا جتنا مرضی وہ جائے، ہاں تنگ کرنا اس نے کبھی...

نہیں چھوڑا تھا۔

اور رات کو سونے سے پہلے مومنہ کو اس کا پیغام موصول ہوتا کوئی شعر، کوئی بات، سادہ الفاظ میں دل کا پیغام کہ وہ لفظوں کے الجھاؤ کا قائل نہ تھا۔

مومنہ جواب نہیں دیتی تھی لیکن ولی کو پتا تھا کہ اس کے پیغام پڑھ لیے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے دل کا رشتہ قائم کر چکا تھا۔

مومنہ بھی اس کے چند جملوں کی اتنی عادی ہو گئی کہ ایک دن، دو دن، تین دن جب پورا ہفتہ اس کا پیغام نہ ملا تو چونک گئی۔

''وہ گویا مستقل مزاجی بس یہیں تک تھی۔'' وہ مذاق اڑانا چاہتی تھی لیکن اڑا نہ پائی۔ کچھ بے چینی سی تھی۔ اور یہ بے چینی بے معنی نہ تھی۔

عینی آپا کی کال آئی تھی۔ ولی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ گہری چوٹیں تھیں سو دو تین دن ہوش سے بیگانہ رہا اور ہوش میں آتے ہی عینی آپا کے ذریعے اسے پیغام بھیجا تھا کہ وہ پریشان ہو رہی ہو گی۔ مومنہ فون ہاتھ میں تھامے رو پڑی۔ یہ آنسو ولی کی تکلیف پر نکلے تھے یا اپنی شکست پر اسے معلوم نہ تھا۔

''آپا اسے کہیے گا میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا تھا۔

''آپا اسے بتائیں کہ مجھے اس کی دعاؤں کے ساتھ اس کی ذات بھی چاہیے۔''

''اسپیکر آن ہے میں تمہارے ساتھ فون رکھ دیتی ہوں تم دونوں خود نمٹو۔'' عینی آپا کھلکھلائی تھیں فون اس کے برابر رکھتے ہوئے، وہ باہر نکل آئی تھیں۔

''سنو کہیں تم خودکشی کرنے تو نہیں نکلے تھے۔'' مومنہ دور کی کوڑی لائی۔

''نہیں اب بزدل نہیں رہا۔ تمہارے خیال نے اتنا بہادر بنا دیا ہے۔ سوچو جب تم ساتھ ہو گی تو کیا کچھ نہیں کرلوں گا۔''

''پہلے تم فون تو بند کرو۔ مریض کو اتنی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ دماغ پر اثر پڑ سکتا ہے۔''

''نادان لڑکی، دونوں بازوؤں پر پلاسٹر چڑھا ہے۔ اب فون نہیں بند کر سکتا میں، ہاں لیکن ٹھہرو۔ ایک خوب صورت ڈاکٹر مجھے دیکھنے آئے گی اس سے بند کروالوں گا۔''

''میرا خیال ہے تمہاری مزاج پرسی کے لیے مجھے ہی تمہارے پاس آجانا چاہیے۔''

''زہے نصیب تم آنے والی بنو میں اسپتال میں ہی قیام طویل کر دیتا ہوں۔''

''اللہ نہ کرے۔''

''سنو، میں ٹھیک ہو کر سب سے پہلے تمہارے پاس آؤں گا۔''

''میں انتظار کروں گی۔'' نرم سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی۔ ولی پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

''تم سچ کہہ رہی ہو۔'' وہ یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

''ہاں اور چچا میاں کو کہنا کہ ہم ان کے پرانے والے گھر میں رہیں گے۔''

ولی کو چند سیکنڈ ہی لگے تھے اس کی بات سمجھنے میں اور جب سمجھ میں آئی تو، خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر کراہ کر رہ گیا۔

''اوہو کیوں ہیرو بن رہے ہیں آپ آرام سے لیٹے رہیں۔ میں آپ کی بہن کو بلاتی ہوں۔'' نرس نے با آواز بلند اسے جھاڑا تھا۔

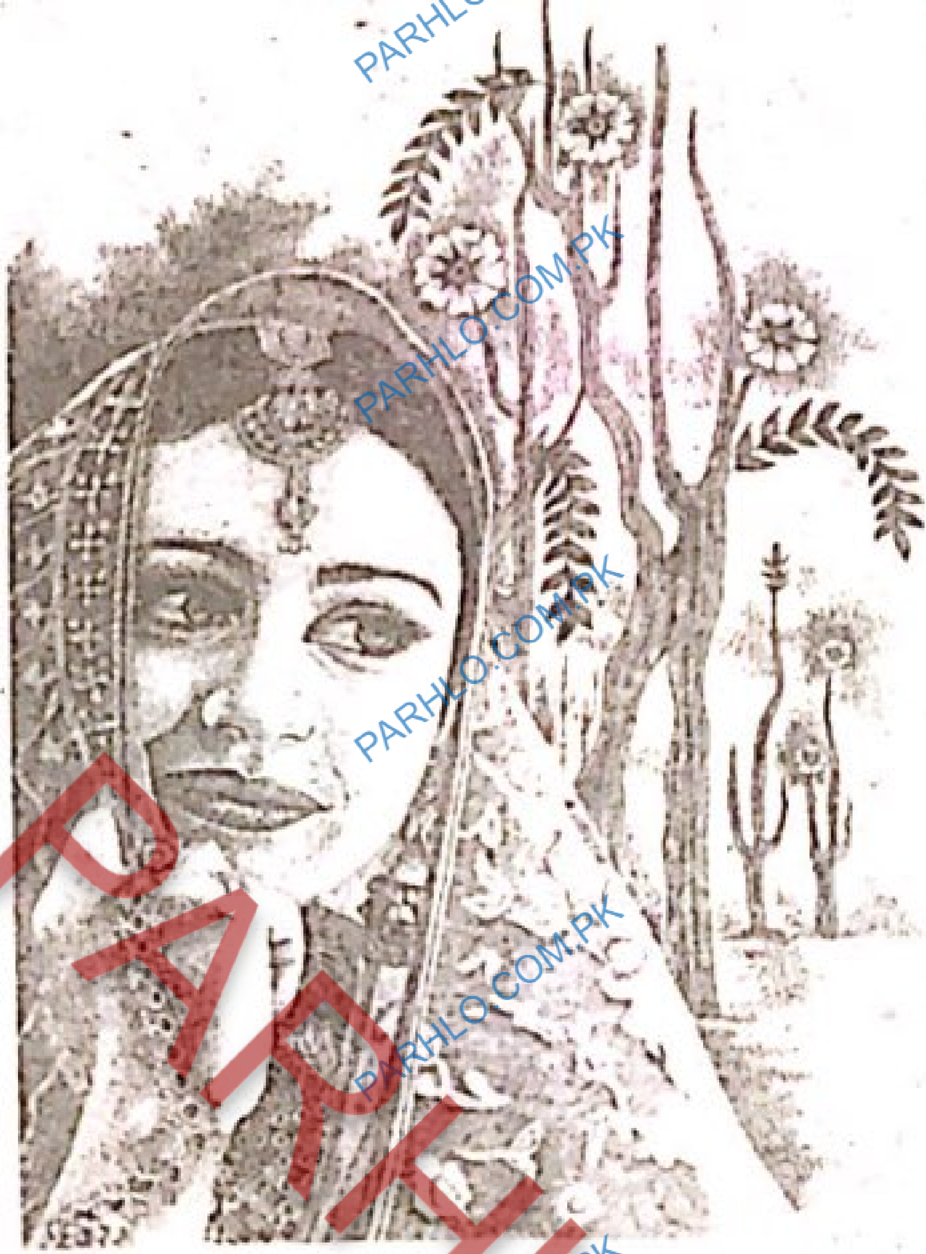
مومنہ نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔ ولی کی ہمراہی میں زندگی کا سفر زندگی سے بھرپور ہو گا۔ اس کی گواہی مومنہ کے دل نے دی تھی۔

مایوسی اور خود ترسی میں ڈوبی زندگی گزارنے کے بجائے اس نے ولی کی ہمراہی میں محبت کی نئی بستی آباد کرنے کا سوچا تھا اس یقین کے ساتھ کہ آنے والے وقت کے دامن میں، اس کے لیے اس کے حصے کی تمام تر خوشیاں ہوں گی۔

☆☆

مجازی خدا

زرقا سکندر



''یہ کرتا کیا پریس کیا ہے میرا...... آستین کی کریز تک تو سلیقے سے بنائی نہیں گئی تم سے پھوہڑ عورت!''

جنید اور زین اپنی چھوٹی خالہ عافیہ کے گھر آئے بیٹھے ہوئے تھے کہ اجلے سفید کپڑوں میں رفعت خالو اچانک ہی کمرے سے باہر آئے اور آتے ہی یک دم دھاڑے۔

''ہزار بار کہا ہے کہ میرے کپڑوں کو ہاتھ مت لگایا کرو، خود ہی کرلوں گا میں۔ کوئی کام ڈھنگ سے آتا بھی ہے تمہیں...... روٹی ہے تو وہ موٹی موٹی تھوپ لاتی ہو اور دہی جمانا تو آج تک تمہیں آیا ہی نہیں۔''

''و......وہ......م...... میں نے تو بڑا ہی د...... دبا کے استری کی تھی۔'' خالہ منمنائیں۔

شوہر کا بگڑا موڈ دیکھ کر ان کی زبان لڑکھڑائی، رنگت پیلی پڑ گئی اور ہاتھ میں پکڑی چائے کی ٹرے بھی لرزا اٹھی۔

''عقل کہیں بازار سے مول آتی تو چھٹانک بھر تمہیں بھی لا پھنکواتا...... کچھ تو افاقہ ہوتا۔''

اس صورت حال میں جنید اور زین خالہ کی بے عزتی پر ندامت سے گنگ رہ گئے۔ ان دونوں بھائیوں کے لیے منہ میں رکھے کباب کو نگلنا مشکل ہو گیا جب کہ خالو، مہمانوں کا لحاظ کیے بغیر خالہ کو بے نقط سنا کر جس تیزی سے برآمد ہوئے تھے اسی رفتار سے واپس ہو لیے۔

''ہمیں بھی اب چلنا چاہیے۔'' آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دونوں کھڑے ہوئے۔

''تم لوگ تو سکون سے چائے پیو اور یہ سموسے اور کباب بھی سارے ختم کرنے ہیں بچو! ان کی کسی بات کا برا نہ ماننا، عادت سے مجبور ہیں، زبان کے کڑوے ضرور ہیں مگر دل کے برے نہیں تمہارے خالو!''

اپنی گھبراہٹ پر فوراً ہی قابو پا کر، خالہ جو کہ اب بالکل نارمل ہو چکی تھیں بھانجوں کا ارادہ بھانپ کر

جھٹ سے بولیں۔
"نہیں خالہ ویسی کوئی بات نہیں...... امی نے جلدی واپس آنے کی تاکید کی تھی۔ ابھی کچھ اور گھروں میں مٹھائی دینا باقی ہے۔"

زرین خالہ کے خلوص کا پاس کرتے ہوئے آپا کہ زرین نے عذر تراشا تو جنید نے بھی بھائی کی تائید میں سر ہلا دیا۔

خالو کی بدسلوکی کے بعد، ان دونوں کے لیے مزید رکنا دشوار ہو گیا تھا مگر پھر بھی خالہ کے اصرار پر بڑے بڑے دو تین گھونٹ میں ہی چائے ختم کر کے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

"ہائے میری بہن بے چاری کی قسمت...... ایک خرانٹ اور بدمزاج انسان سے پالا پڑ گیا ہے اس کا۔"

بیٹوں کی زبانی سارا واقعہ سن کر بڑی آپا نے دھڑا دھڑ سینہ پیٹ لیا۔

"یہی تو رونا ہے کہ اس مغرور انسان کی نظروں میں عافی کی کچھ وقعت نہیں تم بچوں کے آگے ہم نے ایک بھرم رکھا ہوا تھا سو آج وہ بھی ٹوٹا۔"

افسوس سے وہ بار بار ہاتھ ملے جا رہی تھیں۔

"اب اسے اپنی خوشی میں تو شریک کرنا ہی تھا۔ بچے کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا ہے، جہاں سب میکے سسرال والوں کو مٹھائی بھیجی وہاں بہن کو بھلا کیوں کر بھولتی۔ تم بچوں کے ہاتھ اسی لیے بھیجی تھی کہ وہ کم از کم ان کا ہی لحاظ کر لے گا ہم سے تو اسے خار ہے۔ سالوں بعد میرے بچے خالہ کے گھر گئے تھے مگر اس کی وہی پرانی عادتیں، ذرا ذرا سی بات کو لے کر عافی کو ذلیل کرنا اور کوئی آیا گیا نہ دیکھنا۔"

انہوں نے فوراً ہی چھوٹے بھائی نعیم کو بھی فون گھما ڈالا اور لگیں آہ و زاری کرنے۔

"پھر کیا کرنا ہے اس لاوارث کا...... اماں باوا نہیں رہے تو کیا ہم سب بھی اس کے لیے مر گئے۔ اب کیا اس دن کے منتظر ہو بھیا! جب وہ تمہاری بہن کو ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرے گا۔"

"کیا کہوں آپا! عافی ہی ہر بار منع کر دیتی ہے ورنہ میں تو کبھی نہ رہنے دیتا اپنی بہن کو اس جلاد کے پاس۔"

بڑی آپا نے تمہید ہی یوں باندھی تھی کہ نعیم ماموں ان کی بات کا مدعا سمجھ گئے۔ انہیں اتنا طیش آیا وہ فون پھر ہی آپے سے باہر ہونے لگے۔

"ہم تو رفعت کو اپنی بہن دے کر قصوروار ہی ٹھہر گئے۔ اس نے اپنی اور ماں کی جی بھر بھر کے خدمتیں بھی کروالیں ہماری بہن سے، پھر ذلیل بھی اسے ہی کرتا پھرے۔ یہ اچھا دستور ہوا جی۔"

"یہ کم بخت تو عافی کو ساس نندوں کی بھی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا، خود ہی سارے کردار نبھا کر بیوی کا جینا حرام کیے ہوئے ہے۔" آپا کا غصہ بھی گویا سوا نیزے پر تھا۔

"اوپر سے ہماری عافی بھی ناں...... پوری اللہ میاں کی گائے ہے، اسے بات کرنی آئے نہ شوہر سے حق منوانا۔ یہ ذرا ذرا سی لڑکیاں ہیں آج کل کی اور کیسے شوہروں کو قابو میں کیے ہوئی ہیں کہ وہ صرف ان ہی کے اشاروں پہ ناچتے ہیں اور ہماری لڑکی...... بالکل سیدھی ہے۔ مجھلی پھوپھو پر جو چلی گئی ہے، اماں بتایا کرتی تھیں وہ بھی ایسی ہی تھیں۔ اکثر میاں سے مار کھا کے آجاتیں مگر پھر بھی اسی کے نام کی مالا جپا کرتی تھیں۔"

"یہ بات تو بالکل درست کہی آپ نے آپا!" نعیم بھائی بھی ان سے سو فیصد متفق تھے۔

"میں پھر بھی کہے دیتی ہوں نعیم! اگر تم پر دو روٹی بھاری ہے بہن کی تو پھر بھی صاف صاف بتا دو...... میں خود جا کر لے آؤں گی۔ ہاں عافی کو...... پڑی رہے گی یہاں گھر کے کسی کونے میں کم از کم اس جابر کے قہر سے تو بچی رہے گی...... میرے بھائی، ہمارے بڑے ہی کہتے تھے کہ ٹوٹے بازو اپنے ہی گلے لگاتے ہیں۔"

آپا کے لیے خود پہ قابو پانا مشکل ہو گیا تو زاروقطار رو دیں۔

☆☆☆

ماں باپ کے اکلوتے چشم و چراغ رفعت محمود کی بدمزاجی سارے خاندان میں مشہور تھی۔ چھوٹی عمر میں ابا کا انتقال ہو جانے کے سبب انہیں اماں کا سہارا بننا پڑا، کھیلنے کی عمر میں معاشی ذمہ داریاں سنبھالنے لگے۔ دن میں اسکول جاتے اور شام میں ہوزری کی ایک فیکٹری میں کام بھی کرتے۔ بی اے پاس کرتے ہی انہیں گورنمنٹ کے کسی محکمے میں نوکری بھی مل گئی۔ لیکن بچپن کی تمام محرومیاں جھنجھلاہٹ بن کر ان کے رویوں سے جھلکنے لگی تھیں۔

عافیہ سے ان کی شادی کو، تیرہ چودہ برس بیت چکے تھے۔ مگر تاحال کوئی پھول ان کے آنگن میں نہ کھل سکا۔ کچھ شوگر اور بلڈ پریشر جیسے امراض نے عین جوانی میں لاحق ہو کر انہیں مزید چڑچڑا بنا دیا، دوست رشتہ دار ملنے سے کتراتے اور عید تہوار کو ہی شکل دکھاتے۔ جب کہ دفتر میں ساتھی بھی کم ہی ان سے ضرورتاً ہی ہم کلام ہوتے۔ لے دے کر ایک شریک حیات ہی بچی تھی جو ہمہ وقت ان کے زیر عتاب رہتی۔ یہ کوئی موقع محل دیکھے بنا آئے گئے کا لحاظ بس معمولی سی بات کو بنیاد بنا کر شروع ہو جاتے۔ بے چاری گھر بھی سنبھالتی اور ان کے تمام کام بھی سرانجام دیتی ساتھ ہی شوہر کی ڈانٹ پھٹکار بھی وصول کرتی۔

ساس جب تک حیات رہیں۔ عافیہ نے دل و جان سے ان کا خیال رکھا مگر جواباً رفعت کی طرف سے کوئی شکریہ کچھ تعریفی جملے یا پھر محبت کے دو بول تو کجا وہ التا یہ دھونس ضرور جمانے لگے۔

"تم نے اگر میری ماں کی خدمت نہ کی ہوتی تو کب کا تمہاری نالائقیوں پہ کاغذ دے کر فارغ کر چکا ہوتا۔"

☆☆☆

اتوار کی چھٹی کے سبب اس روز رفعت گھر پر تھے۔ کھانا تیار ہونے میں ذرا دیر ہو گئی تو وہ عافی پر خفا ہونے لگے، جلدی جلدی ہاتھ چلاتی عافی سے بدحواسی کے عالم میں، چائے کا تھرماس گر کر ٹوٹ گیا بس پھر کیا تھا۔ یہ چیخ پڑے۔

"اب تمہاری کھوپڑی میں چائے ڈال کر رکھوں گا کیا۔"

بلڈ پریشر ہائی ہو گیا...... انہیں ست نکمی اور نجانے کیا کچھ کہا۔

"بس اب نہ رہوں گی یہاں...... بہت کروالی عزت۔" عافی کا حوصلہ بھی دن بدن جواب دیتا جا رہا تھا۔ "جب ان کی نظروں میں اتنی ہی بری ہوں تو پھر یہاں رہنا ہی بے سود ہے۔"

فوراً ہی فون کر کے نعیم بھائی کو بلا لیا۔

"جیسے جا رہی ہو ویسے ہی آؤ گی، مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا کہ تمہارے ترلے منت کر کے واپس لے آؤں گا۔"

برقع اوڑھے دو جوڑے بیگ میں ڈالے وہ جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

"جاتی ہو تو جاؤ۔ میری جوتی کو بھی پرواہ نہیں پہلے کیا سنوارتی تھیں میرا، جو تمہاری کمی محسوس کروں گا۔"

عافی کا اٹل ارادہ دیکھ کر انہیں بھی یقین ہو چکا تھا کہ یہ اب رکنے والی نہیں...... بیوی کی اتنے سالوں کی خدمت اور وفاشعاری کو فراموش کر کے، انہوں نے بھی آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی تھیں۔

"ہائے...... ان کی نظروں میں یہ وقعت تھی میری۔"

دل میں چھپی کسی موہوم سی امید نے دم توڑا۔ ویسے بھی روز روز کی صلواتیں اور نکتہ چینی سہہ سہہ کر وہ اکتا گئی تھیں۔ نعیم بھائی باہر موٹر بائیک پہ سوار ان کے منتظر تھے۔ چپ سادھے ساتھ ہو لیں۔ پھر بھی گھر سے نکلتے وقت ایک بار مڑ کر پیچھے ضرور دیکھا تھا۔ مگر رفعت اتنی دیر میں اندر جا چکے تھے۔

زرین بھابھی کا رویہ ان کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ نعیم بھائی بھی آتے جاتے حال احوال

ضرور رعایت کرتے اور ہر طرح سے بہن کا خیال رکھتے۔ عافی نے بھی جلد ہی گھر کے کام کاج میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے بھی شاید بھابھی کی نظریں پڑھ لی تھیں۔

''گھر بی بی اور کتنا آرام کرو گی جب یہاں رہنا ہے تو گھر کے کام بھی دیکھنا ہوں گے۔''

پھر وہ وقت بھی آیا جب، نعیم بھائی کے گھر میں تمام کام ہی عافی کے سپرد ہو چکے تھے۔ جنہیں انجام دیتے دیتے دن سے رات ہو جاتی اور وہ تھک ہار کر بستر پہ جا گرتیں۔

نعیم بھائی کے ہاں ایک ماہ مکمل ہوتے ہی، بڑی آپا انہیں لینے آ پہنچیں، یہاں بھی گھر بار اور بچے ان کے حوالے کر کے آپا ہر کام سے بے نیاز ہو گئیں۔ پورا دن بستر پہ لیٹی رہتیں یا بیچ میں ایک دو بار محلے کا چکر بھی ضرور لگا آتیں۔ گھر میں بچے الگ اپنی اپنی پسند کی چیزیں بنوانے کی فرمائشیں کر کے خالہ کو ہولائے رکھتے۔

''تیری ایسی کی تیسی۔''

عافی کو میکے آئے تقریباً چھ سات ماہ ہو چلے تھے جب ایک شام حلیم کا بڑا سا پتیلا چولہے پہ چڑھائے وہ گھوٹا لگا رہی تھیں کہ اچانک کسی نے ان کی کمر پہ آ دھموکا رسید کیا۔

''ہائے میری ماں!'' انہوں نے تڑپ کر پچلی کمر پکڑ لی۔

''کیوں ری کم بخت! یہاں دیگچے بھر بھر کے کھانے پکانے میں تجھے کچھ تکلیف نہیں اور وہاں میرے گھر میں رہتے ہوئے کیا موت پڑ رہی تھی۔ اک ذرا سا ڈانٹ ہی تو دیا تھا کہ یوں روٹھ کر میکے آ بیٹھی۔ تجھے میرے گھر رانیوں کی طرح رہنا راس نہیں آیا تب ہی تو یہاں خوشی خوشی اپنے بھائی بہن کے گھروں میں غلامی کرتی پھر رہی ہے۔''

''رفعت!'' بے ساختہ عافی کے منہ سے نکلا۔ فوراً ہی پلٹ کر دیکھنے لگیں مگر یہاں وہاں کوئی بھی تو نہ تھا۔

بے شک یہ ایک محض واہمہ تھا جو کہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

''جس روز سے اپنے گھر سے باہر قدم نکالا ہے۔ مسلسل کام میں ہی جتی ہوئی ہوں۔ نعیم بھائی اور آپا کے گھروں کے درمیان گھن چکر بنی...... مجال ہے جو چند لمحوں کا آرام میسر آ جائے اور ادھر گھر میں رفعت اور میں...... دو لوگوں کے کام ہی کتنے تھے۔ فرصت ہی فرصت۔ میرا ہی راج تھا۔ آرام بھی کرتی اور اللہ اللہ بھی...... کوئی نماز قضا نہ ہوتی۔ مگر اب۔ بھلے وہ زبان کے تلخ تھے میری ضرورتیں تو بن کہے پوری کر دیتے...... عافی یہ تو نے کیا کیا؟ گھر کی دہلیز پار کر کے خود اپنے ہی پاؤں پہ کلہاڑی مار بیٹھی ہے۔''

خامیاں تو رفعت میں بہت تھیں ذرا غور کیا تو خوبیوں کا پلڑا بھاری نکلا۔

''تم ہوش میں تو ہو عافی! جو واپس اس انسان کے پاس جا رہی ہو اب تو وہ ظالم اور شیر ہو جائے گا کہ دیکھا بھائی چار دن نہ کھلا سکا۔''

نعیم بھائی ان کا فیصلہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''مگر بھائی! میرے جانے میں ہی بہتری ہے۔'' مختصر سا جواب دے کر وہ ہاتھ میں پکڑا برس جھاڑ کر سینے لگیں۔

''تو پھر خود ہی جاؤں گی میں ہرگز اس جھگڑالو کے منہ نہیں لگنے والا۔''

انہوں نے بھی دوٹوک فیصلہ سنایا۔

''عافی! میں نے تو تمہیں اپنی بہن سمجھ کر رکھا پھر بھی کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔''

اپنے آرام کے دن ختم ہوتے دیکھ کر زرین بھابھی کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

''اب جب تم جانے کا قصد کر ہی بیٹھی ہو تو ضرور جاؤ۔ اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے مگر اتنا یاد رکھنا کہ ایسے مرد بھی کبھی سدھرے ہیں بھلا۔''

بھابھی کو بھی جیسے پکا یقین تھا کہ عافیہ پھر واپس آئیں گی۔

''میں پوچھتی ہوں تجھے تکلیف کیا ہے ادھر جو واپسی کا سوچ بیٹھی ہے۔'' بڑی آپا کو بھی بہن کے جانے کی خبر ہو چکی تھی وہ انہیں روکنے کے لیے دوڑی چلی آئیں۔

''وہ اگر اتنا ہی اچھا ہوتا تو تجھے لینے آتا۔ ایک فون تک تو کر نہ سکا۔ کیوں نہیں اس کم بخت کے آگے نیچا دکھانے پہ تلی ہوئی ہے۔''

باہر گلی میں پھپھناتا ہوا ایک رکشہ بھی آن رکا تھا۔ عافی لپک کر اس میں جا بیٹھیں جب کہ آپا...... بڑی بے بسی سے بہن کو جاتا دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل رہی تھی جب عافی نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

''آ گئی ہو واپس؟'' انہیں باہر دروازے پہ کھڑا دیکھ کر رفعت نے قطعاً کسی اچنبھے کا اظہار نہ کیا۔ ان کے ہاتھ میں دھلے ہوئے موزے اور بنیان تھے واپس پلٹ کر وہ جنہیں تار پہ پھیلانے لگے۔

وہ سست قدموں سے چلتی صحن کے وسط میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔ دھول مٹی سے اٹے صحن میں پھول اور پودے، پانی اور مناسب توجہ نہ ملنے سے نہ جانے کب کے مرجھا چکے تھے۔ دیوار پہ ایک جانب پھیلی انگوروں کی بیل سوکھ کر ڈھلکی پڑی تھی۔ دڑبہ تو موجود تھا مگر اس میں مرغیاں غائب اور تو اور ان کی پالتو بلی بھی غائب تھی۔

صحن کی خستہ حالی پر ان کا دل رو اٹھا۔

''دیکھ رہی ہو عافی! تمہارے بغیر سب کچھ کیسے ویران ہو گیا۔''

کپڑے تار پر پھیلا کر رفعت نے بالٹی نل کے پاس لا رکھی اور انہیں دیکھ کر بولے جو ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔

''پگلی! ایسے بھی کوئی اپنا گھر چھوڑ کے جاتا ہے اک ذرا سا ڈانٹ ہی تو دیا تھا تمہیں۔''

وہ کروفر اور دبدبہ جو ان کا خاصا تھا سرے سے ہی غائب۔

''جاتے ہوئے اتنا بھی نہ سوچا کہ اس گھر کو اور مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے۔''

یہ رفعت ہی ہیں ناں...... ادھر تو کایا ہی پلٹ گئی ہے۔

عافیہ کو اپنی سماعتوں پر یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

''اگر ایسا ہی تھا تو آپ لینے آ جاتے۔''

زبان پہ ٹھہرا شکوہ لبوں سے آن پھسلا تھا۔

رفعت ان کی بات پر ہنس دیے اور ہنستے ہنستے قریب چلے آئے۔ عافیہ سہم کر انہیں دیکھنے لگیں۔ ہونٹوں پر پھیلی ہنسی کا بھرپور ساتھ دیتی سرمئی آنکھیں اور سامنے کے دو دانتوں کے درمیان بنا خلاء، وہ بے حد اچھے لگ رہے تھے۔

''یہ دیکھنے میں کوئی اتنے بھی برے نہیں۔''

چپ چاپ کھڑی ان کے چہرے پہ کھلی مسکراہٹ میں کھوئی تھیں اتنے سالوں میں شاید پہلی بار وہ انہیں غور سے دیکھنے کی جرات کر پائی تھیں۔

''تمہاری شکایت بجا ہے عافی! آج اگر تم نہ آتیں تو میں کل ضرور ہی تمہیں لینے پہنچ جاتا۔''

ان کا دھیما لہجہ اور لفظوں میں بھرا رس۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتیں۔

''اب یوں ہی کھڑی رہو گی یا اندر بھی چلو گی...... جاؤ برقع اتارو اور منہ ہاتھ دھو کر بیٹھو۔ میں کچھ کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

انہیں حیران و پریشان چھوڑ کر رفعت موٹر بائیک نکالنے لگے۔ ایک اونچا لمبا صحت مند وجود...... عافی میں سکون اور تحفظ کا احساس بھر آیا۔

وہ انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ گھر سے باہر نکل گئے تو وہ خود بھی آئندہ کبھی یوں روٹھ کر اپنے گھر کی دہلیز پار نہ کرنے کے ارادے کے ساتھ کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر چلی گئیں۔

☆☆

مکمل ناول

تھا مر ڈھلتے سورج کی سی کرنوں کا ہالا اب تک چہرے کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔

"رخشندہ!" شجاع احمد کو پہچاننے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی اور رخشندہ بیگم نے اپنی غلافی



نعیمہ ناز

منزلِ مراد

ڈرائنگ روم اجنبی تھا۔ پہلی بار وہ اس بنگلے کے عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھے خود کو بہت بے چین محسوس کر رہے تھے۔ بیٹھک کی سجاوٹ مکینوں کی امارت، نفاست اور اعلا ذوق کی ترجمان تھی اور شجاع احمد کی چھٹی حس پکار پکار کر کسی انہونی کی پیش گوئی کر رہی تھی۔

کمرے میں ایک مرد اور ایک خاتون اندر آئے تھے۔ مرد ادھیڑ عمر کا کھاتا پیتا، گورا چٹا، ذرا فربہ بدن کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ جو خاتون تھیں بڑی حد تک بڑی بی تھیں۔ اس مرد کی والدہ، مگر کھنڈرات بتا رہے تھے کہ عمارت کبھی بہت شان دار اور عالی شان تھی۔ دراز قامتی میں بڑھاپے نے ذرا سا خم ڈال دیا تھا۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں بجھ کر راکھ تو نہیں ہوئی تھیں ہاں اردگرد جھریوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ مگر آنکھوں کی شہد رنگت میں زیادہ تغیر نہیں آیا تھا۔ کھڑی مغرور سی ناک اور تراشیدہ لبوں کی بناوٹ اور کشادہ کتابی چہرے کا حسن پہلے کی طرح تاباں اور فروزاں تو نہیں



آنکھوں سے انہیں دیکھا یا گھورا تھا۔

"تو یہ آپ ہیں شجاع احمد؟"

"شکر ہے، جان پہچان نکل آئی۔" نروس بیٹھے ہوئے ابراہیم نے طمانیت کی سانس لی۔

"اب سارے کام آسان ہو جائیں گے؟"

بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ابراہیم خوش فہم ہوا۔ باوجود اس کے کہ ملاقات اور خاطر مدارت مختصر ہی تھی۔ شجاع احمد کو جانے کس بات کی جلدی تھی وہ بار بار اٹھنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اٹھتے وقت ابراہیم نے شانزے کو حسرت سے دیکھا۔

"دادا حضور! تھوڑی دیر اور بیٹھ جاتے تو شانزے سے چار باتیں ہو جاتیں یا چلو دو ہی سہی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے شجاع احمد کو دیکھا جن کی پیشانی پر ابھری ہوئی شکنیں پریشان ہونے کی غماز تھیں۔

"کیا ہوا دادا حضور؟" ابراہیم نے چابی گھمائی اور اسٹیئرنگ سنبھالا۔

"یہاں تمہاری دال گلنی مشکل ہے صاحبزادے!"

"ہائیں، وہ کیوں؟ اب تو ان سے جان پہچان بھی نکل آئی۔" ابراہیم کو دادا کی پیشن گوئی سے دھچکا لگا۔

"اسی لیے تو بتا رہا ہوں تمہیں، اس جان پہچان کی روشنی میں ہی تمہارا مستقبل نظر آ رہا ہے۔"

"پہیلیوں میں باتیں نہ کریں۔ صاف صاف بتائیں۔" ابراہیم نے اتنی سی دیر میں تیسرا موڑ کاٹا تھا۔

"زندگی اور راستوں میں اچانک ہی کتنے پر پیچ موڑ آ جاتے ہیں۔"

"اب میں کیا بتاؤں، لمبی کہانی ہے۔" شجاع احمد نے ایک آہ بھری۔

"کتنی لمبی؟ زندگی سے بھی لمبی؟"

"کہانی کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو، زندگی سے لمبی نہیں ہوتی۔ مگر کبھی تمام عمر کو اپنی لپیٹ میں ضرور لے لیتی ہے۔" شجاع احمد نے دل ہی دل میں سوچا۔

"کیا سوچنے لگے۔ بس جلدی سے شروع ہو جائیں۔ آخر آپ نے یہ کیوں کہا کہ یہاں میری دال گلنی مشکل ہے؟" ابراہیم نے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

"کیوں کہ......" شجاع احمد نے بولنا شروع کیا۔

☆☆☆

دہلی کے نواح میں وہ ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ پچیس، تیس کمرے، صحن، دالان، برآمدے، ورانڈے، پائیں باغ جس میں قسم قسم کے پھل دار اور غیر دوسرے درخت تھے۔ پیپل کے گھنے پیڑ کے قریب بڑا سا کنواں تھا جو اس بڑی سی حویلی میں رہنے والے قریباً درجن بھر کنبوں کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔

گھر کے سربراہ ابراہیم علی خان تھے اور باقی وسیع و عریض آبادی میں ان کی دو بیویاں، بچے، بہنوں اور بھائیوں کے کنبے اور چند ایک دور پرے کے رشتے دار بھی تھے جنہیں ان کی غربت، پس ماندگی اور بے مائیگی کی بدولت اس حویلی میں پناہ ملی ہوئی تھی۔

شجاع احمد اپنے بڑے بھائی اور والدہ کے ساتھ ابراہیم علی خان کے زیر کفالت تھے جو رشتے میں ان کے نانا یا دادا لگتے تھے۔ پندرہ سال پہلے قریباً چار، پانچ سال کی عمر میں وہ یہاں آئے تھے۔

بڑے بھیا تو آٹھ جماعتیں پڑھ کر منشی گیری کرنے لگ گئے تھے۔

شجاع شوق شوق میں کالج تک پہنچ گیا تھا۔ گھنگھریالے بالوں والا، دراز قد، خوش شکل اور صحت مند نوجوان، جس پر دل ہی دل میں کئی لڑکیاں مرتی تھیں مگر ان میں ایک تھی جو علی الاعلان اس پر فدا تھی۔ اور کم تو وہ بھی نہیں تھی۔ حسن کے ان سارے استعاروں اور تشبیہات پر پوری اترتی تھی جو شاعروں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں بیان کیے ہیں۔

اسے اپنی دلکشی کا پورا ادراک تھا اور یہ ادراک، مغروریت کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ وہ خوب صورت، خود پسند اور نازک مزاج رخشندہ، پروانہ وار، شجاع پر نثار ہو رہی تھی، چکور بن کر اس چاند کا طواف کرنے لگی تھی اور وہ چاند الفت کی اس پذیرائی سے اور اپنے گرد طواف عشق سے بے نیاز اپنی کتابوں، قلم اور صفحات میں کھویا رہتا۔

کھلی کھڑکی سے ہوا کے ساتھ ساتھ رات کی رانی اور موتیے کی مست مہک اندر آ رہی تھی۔ اور خوشبو دار جھونکے کی طرح وہ بھی اندر آئی اور اسی کھڑکی کے قریب کھڑی ہو گئی جہاں شجاع کی لکھنے پڑھنے کی میز بچھی ہوئی تھی۔

"کیا پڑھ رہے ہو؟ اس نے موٹی سی کتاب اٹھا کر دیکھی گزشت اسیر۔"

"میں لے جاؤں پڑھنے کے لیے؟" دو سنہری آنکھیں شجاع کے چہرے پر ٹھہریں۔

"ہرگز نہیں، اور تم جاؤ یہاں سے، اماں کسی بھی وقت آ سکتی ہیں۔" شجاع نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"ڈریں مت۔ پھوپھی اماں گول کمرے میں ہیں، ساری خواتین کی محفل وہیں جمی ہے۔"

"پھر بھی کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔ تمہارا اس طرح یہاں ہونا ٹھیک نہیں۔" شجاع کو اپنی ہی نہیں، رخشندہ کی عزت کا خیال بھی تھا اور حویلی میں اپنی اوقات اور حیثیت کا احساس بھی۔

"آپ صرف نام کے شجاع ہیں، شجاعت بہادری اور دلیری تو چھو کر نہیں گزری آپ کو۔" رخشندہ نے کھلی کھڑکی سے باہر نیم اندھیرے میں نگاہ کی۔ پورے چاند کی اجلی چاندنی افشاں بن کر بکھری ہوئی تھی۔

"تسلیم کہ میں بالکل بھی دلاور نہیں، بہت بزدل ہوں اب آپ تشریف لے جائیں گی؟"

اس حویلی میں کم از کم ایک درجن لڑکے ہیں۔ جن سے ہمارا قریبی رشتہ ہے۔ وہ ہماری نگاہ التفات کے لیے اور ہم سے بات کرنے کے لیے ترستے ہیں اور ہمیں کسی سے بولنا بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ سوائے تمہارے، کیوں؟

"کیوں کہ آپ کا بچپن ابھی تک رخصت نہیں ہوا۔" شجاع نے دانستہ اسے دیکھنے سے گریز کیا کیونکہ اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد پھر نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

"اگر آپ کبھی ہمیں غور سے دیکھیں شجاع صاحب! تو آپ کو علم ہو کہ ہمارا بچپن کب کا رخصت ہو گیا ہے۔"

رخشندہ کی آنکھوں اور دل کی بے باکی اس کے لفظوں اور لہجے سے جھلکنے لگی تھی۔ وہ بچپن سے ہی خودسر تھی۔ شاید وہ بے تحاشا لاڈ پیار کا اثر تھا یا فطرت میں ہی یہ عناصر تھے۔ ہر بات بے دھڑک زبان کی نوک پر آ جاتی اور سننے والوں کی سماعتوں تک منتقل ہو جاتی۔ اب کوئی ہائے کرے یا اوئی، واہ کرے یا آہ، ہنس کر ٹال دے یا خشمگیں نگاہوں سے گھورے، رخشندہ بیگم کی بلا سے انہیں کسی کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور جب سے دل اس کے کہنے اور بس سے باہر ہوا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ باغی ہو رہی تھی۔

"کیوں ہمیں عاجز کر رہی ہو رخشی! رحم کرو ہم پہ، پڑھنے دو ایگزام قریب ہیں۔"

"ساری دنیا سے ہنستے بولتے ہو، ہماری باری آتی ہے تو امتحان ہونے والے ہیں۔ اماں آنے والی ہیں، دنیا دیکھنے والی ہے۔" رخشندہ نے بولتے بولتے کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی کھول دیا۔

"کیا کر رہی ہو، سارے کاغذات اڑ جائیں گے۔" شجاع بوکھلایا۔

"ایک تو یہ باغ سے آنے والی خوشبوئیں؟ کیسی مست کر دینے والی مہک ہے۔ بالکل محبت کی طرح۔" رخشندہ نے خوشبوؤں سے بھیگی ہوا اپنے چہرے، اپنے وجود پہ محسوس کی اور اپنے اندر اتاری۔

"یہ خوشبو ہمیں مار ڈالے گی شجاع احمد! ختم کر ڈالے گی۔"

رخشی کی آواز بہت دھیمی تھی مگر شجاع کی سماعتوں

تک پہنچ گئی۔
"اور تمہارے یہ انداز ہمیں سولی پہ چڑھا دیں گے۔ مصلوب ہو ہیں گے کسی کو بھنک بھی پڑ گئی کہ ابراہیم علی خان کی بھتیجی بہو اور کریم علی خان کی لاڈلی بٹی، شجاع احمد کو دل دے بیٹھی ہے تو کم بختی سب سے زیادہ ہماری ہی آئے گی۔"
شجاع نے اپنے کاغذات اور کتابیں ترتیب سے رکھے ہوئے ایک بے بس نگاہ اس پر ڈالی۔
"فقط خوشبوئیں ہی مار ڈالنے کے لیے کافی نہیں ہوتیں۔ کبھی کسی کا نڈر اور البیلا پن بھی دوسرے کی جان لے لیتا ہے۔ درخشندہ بیگم!"

☆☆☆

لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

باہر سڑک پر سے جلوس گزر رہا تھا۔ مسلم لیگ کے ہر طرف جھنڈے لہراتے ہوئے پرجوش افراد، بچے، جوان، نوجوان، بوڑھے، ہر عمر کے لوگ اس جلوس میں شریک تھے۔ مختلف لہجوں اور آوازوں میں فلک شگاف نعرے فضا میں پھیلتے ہوئے لب سڑک اس کنگوروں اور محرابوں والی حویلی میں بھی پہنچ رہے تھے۔ جہاں کریم علی خان آج بڑے دنوں بعد فرصت اور اطمینان سے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔
ان کی سیدھی سادی اور نیم خواندہ شریک حیات قریب بیٹھی تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر نباری کھینچی تو نعروں اور حقے کی گڑگڑاہٹ میں پاندان کھینچنے کی آواز دب سی گئی۔ نباری سے پان نکال کر کتھا چونا لگاتے ہوئے اختر جہاں کی پیشانی پر تفکر بھری سلوٹ ابھر آئی۔
"کیا سچ مچ پاکستان بن رہا ہے؟" کتھے کی کلھیا میں چھوٹا سا چمچہ واپس رکھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔
"اونہہ بس یونہی شور شرابا ہے، بھلا ہندوستان کے ٹکڑے کیسے ہوں گے؟ کون کرے گا؟"
کریم علی خان نے حقے کی نے ایک طرف ہٹاتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

وہ پکے کانگریسی تھے، بٹوارے کے خلاف، اکھنڈ ہندوستان کے حامی، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ حویلی میں ان کے ہم خیال فقط ان کے والد اور بھائی ہی تھے۔ نوجوانوں کی اکثریت مسلم لیگ کی حامی اور قائداعظم کی معتقد تھی۔
خواتین گھریلو مزاج کی، سیاست، سیاسی شعور سے نابلد، ملک و قوم کی تاریخ و حالات سے بے خبر اپنے گھر، گرہستی میں مشغول، حویلی میں ہونے والے آئے دن کے بحث و مباحثے سنتی اور ہول کر رہ جاتیں۔
"سرور میاں اور ان کی جروا تو کہہ رہے تھے کہ بٹوارہ ہونا ہی ہونا ہے؟" بیگم نے کھٹ کھٹ سروتا چلا کر چھالیہ کاٹی۔
"ارے ان نوجوانوں کا کیا ہے، نیا خون، نیا جوش، علی گڑھ سے کیا پڑھ لیے۔ بس ہو گئے انقلابی، وہ کیا کہتے ہیں یہ نئی تانتی؟ علی گڑھ سے جو سڑک نکلتی ہے۔ وہ دہلی کے بجائے پاکستان جاتی ہے۔"
کریم علی خان اپنی نسل کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے خیالات اور جذبات سے خوب واقف تھے یہ الگ بات کہ وہ ان سے بالکل بھی متفق نہیں تھے۔ اور وہی کیا۔ ان جیسے بہت تھے۔ عوام میں بھی خواص میں بھی۔ جو پاکستان بننے کی مخالفت کر رہے تھے۔
ایسے مسلمانوں کے علاوہ، ہندو اور انگریز سامراج پوری طرح سرگرم عمل تھا کہ تحریک پاکستان کو پوری طاقت، قوت اور سازش کے ساتھ کچل دیا جائے مگر دیوانے تھے کہ سر پر کفن باندھ کر منزل کی جانب چل پڑے تھے اور اس حویلی میں بھی ایسے سرفروش تھے کہ وہیں نئی تانتی جو بڈھوں سے ڈانٹ بھی کھاتی، اعتراضات بھی سنتی اور انہیں قائل کرنے کی کوشش بھی کرتی۔ کبھی دیوان خانے میں، کبھی گول کمرے میں کبھی صحن میں، کبھی پائیں باغ میں جہاں محفل جم جاتی۔ کبھی معرکے زبانی و کلامی ہوتے۔
"میاں! تم کرو گے کیا علیحدہ بنا کر؟ ہماری طاقت ہی تقسیم ہوگی کم ہو کر چھوٹے ہو کر کمزور ہو جائیں گے۔ اتحاد میں برکت ہے۔ انگریز چلا جائے تو سب اتفاق سے رہیں گے۔ مل جل کر حکومت کریں گے اور دیش کو ترقی دیں گے۔"
بڑے تایا علیم علی خان ان سیدھے سادھے، پیارے انسانوں کی کیٹگری میں تھے جو خود اچھے ہوتے ہیں اور باقی ساری دنیا کو بھی اچھا ہی سمجھتے ہیں نہ خود کسی کے لیے برا سوچتے ہیں نہ دوسروں سے اس کی توقع رکھتے ہیں۔ ایسے سیدھے سادے انسان کی بھولی بھالی باتوں پہ نوجوان مسکراتے ہوئے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے اور بات کہیں سے کہیں نکل جاتی۔
"بڑے ابا، بصد احترام عرض کرتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں کا اتحاد، اتفاق سے رہنا اور مل جل کر حکومت کرنا محض خواب خیال کی باتیں ہیں۔ ہندو اکثریت میں ہے۔ اس کا اتنا ظرف نہیں ہے کہ اقتدار میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ شریک کرے۔ پھر پچھلے ہزار سال سے اسے حکومت ملی ہی کہاں ہے؟ انگریز نے اب جا کر اقتدار منصب اور جاہ کا مزا چکھایا ہے۔ شیر کے منہ کو خون لگ گیا ہے اور جس شیر کے منہ کو پہلے ہی خون لگا ہوا ہے۔ یعنی مسلمان جسے اس خطے پر حکومت کی عادت سی پڑ گئی ہے، وہ ہندو کا بحث اور دست نگر بن پر راضی ہوگا۔ مطمئن، انگریز کے جانے کے بعد یہاں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ کبھی غور کیا ہے آپ لوگوں نے؟" سجاد نئے نئے وکیل بنے تھے۔ ان کے پاس مختلف معاملات میں بہت سے دلائل تھے۔ خصوصاً قیام پاکستان کے حوالے سے وہ گھنٹوں تقریر کرتے نہ تھکتے تھے۔
"یہ سب انگریز کا کیا دھرا ہے۔ ہندو مسلم فساد کا بیج اسی نے بویا ہے تاکہ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہیں اور وہ خود مزے سے حکومت کرتا رہے۔" ابراہیم علی خان چچا ان کی نے منہ میں دبا کر کش لیا۔
"یہی تو بات ہے کہ بیج بو دیا گیا اور اس سے نکلنے والا جو پودا تھا وہ درخت بن گیا ہے اس کا زہریلا پھل سب کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"اچھا بھئی، تم لوگ یہاں بیٹھے بیٹھے نیا وطن بناتے رہو، بندہ تو اگلے ہفتے شکار پر جا رہا ہے۔ جس کو چلنا ہے تیاری کر لے۔" رضا ماموں نے اعلان کیا۔
انہیں نہ مسلم لیگ سے ہمدردی تھی نہ کانگریس سے عداوت، نہ گاندھی سے بیر تھا نہ قائداعظم سے عقیدت، وہ تو سمندر کے کنارے کھڑے لہروں کا تماشا دیکھنے والوں میں سے تھے۔
ان کی شخصیت بھی الگ تھی اور دنیا بھی، ادھیڑ عمری سے کچھ دور تھے۔ مجرد زندگی گزار رہے تھے۔ شادی بیاہ، بال بچوں، گھر گرہستی کے بکھیڑوں سے دور جنگل جنگل شکار کھیلتے، شہر شہر آوارہ گردی کرتے تھک جاتے تو تھکن اتارنے گھر آ جاتے۔
کچھ عرصہ گھر میں رہنے اور گھر کے پکوان اور خوان کھانے کے بعد جی اوب جاتا، انہیں جنگلوں کی داستانیں لگتی، قدموں سے لپٹی آوارگی، ہمراہی میں کہیں سے کہیں لے جاتی، جنگل کے جانور، پرندے، درخت جھاڑیاں، بیتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد روپ بہروپ بدلتی زمین اور رنگ بدلتا آسمان، انہیں بے طرح یاد آتے اور وہ اپنا جھولا اٹھائے۔ گھر سے نکل پڑتے۔
اور اس دنیا میں فقط پہاڑ ہی نہیں جو انسان کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ یہاں جنگل بھی صدائیں دیتے ہیں۔ صحرا بھی پکارتے ہیں۔ سمندر بھی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ جس کو جس مقام کا نشہ ہو جائے وہی کوہ ندا بن کر اسے پکارتا ہے۔
رضا ماموں کو صدائیں آ گئیں اور وہ لبیک کہہ اٹھتے۔ اٹھ کر چل پڑتے۔ اکثر نوجوان ٹولی ان کی معیت میں شکار ایڈونچر کرتی۔ نیل گائے کا بھنا گوشت، ہرن کے کباب کھاتی اور واپس آ جاتی۔
رضا ماموں نے باغ کا ایک چکر لگایا۔ جامن کے پیڑ کے نیچے جھکی شاخوں کو زور زور سے ہلایا۔ ٹپ ٹپ کالے کالے جامن نیچے گر پڑے۔ ایک جامن اٹھا کر کرتے کے دامن سے اسے صاف کیا اور اسے کھاتے ہوئے ذرا اور آگے بڑھے، جہاں آم

کے کچھ جھرمٹ کے نیچے شجاع چٹائی پر اپنی کتابیں سجائے بیٹھے تھے۔

"کیا شجاع میاں! تم بھی جب دیکھو کتابوں میں منہ دیے بیٹھے رہتے ہو۔ کبھی ان سے نظر اٹھا کر اپنے آس پاس بھی دیکھو اوپر نیچے، دائیں بائیں، کیا کیا حسن نظارے اور آوازیں بکھری ہیں۔ اماں، خدا کی قسم اگر یونہی گردو پیش سے بے نیاز اور لاپرواہ رہے تو یہ کوئل جو تمہارے سر کے عین اوپر اتنی دیر سے ملہار گا رہی ہے۔ ناراض ہو کر اڑ جائے گی۔" رضا ماموں نے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے اپنے مخصوص بے تکلف لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"جانتا ہوں ماموں جان! باغ میں کیا کیا بہاریں دھوم مچا رہی ہیں۔" شجاع نے کتاب بند کرتے ہوئے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"مگر یہ جو اگیزام کا جن سر پر سوار ہے نا، اس نے مت ماری ہے ہماری۔" اس نے گھنے گھنگریالے بالوں والا سر ہلایا، مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

"مت مارنے کے لیے جوانی دیوانی کافی ہوتی ہے۔ اس پر کہیں عشق کا آزار لگ جائے تو وہی بھیجا ہو جاتا ہے انسان کا اور اس کی مت مارنے کو، تم نے کہاں امتحانوں کے عجب کو سر چڑھا لیا؟" رضا ماموں نے کالے چیونٹوں کی قطار کو انگلی سے چھیڑا جو درخت کے تنے پر چڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک پٹ پٹ کر کے نیچے گرے۔

"تیاری کر لو، بندوق اور کارتوس کی ذمہ داری ہماری تمہارے پاس بندوق تو ہو گی نا؟"

"چاند بھیا نے دی تھی۔ اماں نے ایسی سنبھال کر رکھی کہ ہمیں بھی کانوں کان خبر نہیں کہاں ہے۔"

"بے فکر رہو۔ تمہاری اماں کو ہم سنبھال لیں گے؟" رضا ماموں کا لہجہ وہی ازلی لاپروائی لیے ہوئے تھا۔

"مگر ماموں میرے اگیزام؟"

"امتحان میں ابھی کئی ہفتے پڑے ہیں۔ میاں صاحبزادے۔ جب تک تو ہم واپس بھی آجائیں گے۔"

"اماں سے بات کر لیں۔" شجاع نے گویا مان لی۔ ویسے یہ الگ بات کہ شکاری ٹولے میں شامل ہونے کو خود اس کا دل بھی چاہ رہا تھا۔ یہی تو ایک موقع ہوتا تھا جب حویلی کی اس دنیا سے باہر کی دنیا دیکھنے کو ملتی تھی۔

رضا ماموں جیسے اچانک آکر بیٹھے تھے ویسے ہی اچانک اٹھ کر چل دیے۔ مولسری کے درخت پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ شجاع کی نظریں بلا ارادہ مولسری کی جانب اٹھ گئیں۔

"یہ چڑیاں بھی شور مچانے میں لڑکیوں بالیوں سے کم نہیں بس ایک بار شروع ہو جائیں خاموش ہونے کا نام نہیں لیتیں۔"

وہ سوچ کر یونہی مسکرایا اور پھر ایک خفیف سا ہو گیا۔ مولسری کے پیڑ سے ذرا پرے محرابی جھروکے میں رخشندہ کھڑی تھی۔ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"اب یہ ضرور میرا مذاق بنائے گی۔" شجاع نے سر جھکا کر کتابوں کی طرف متوجہ ہونا چاہا مگر ایک عجیب سے احساس اور الجھن نے اسے گھیر لیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دوبارہ سامنے دیکھا۔

رخشندہ کے چہرے پر خاموشی اور اداسی کا راج تھا۔ بغیر مسکرائے وہ یک ٹک شجاع کو دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا؟ کسی سے جھگڑا یا کوئی فرمائش، خواہش اور ضد پوری نہیں ہوئی ہوگی۔" شجاع نے کتاب کے کھلے صفحے پر نظریں جماتے ہوئے قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔ مگر دوبارہ نظر اٹھانے کی غلطی نہیں کی۔

☆☆☆

زنان خانے کے اس اونچی چھت والے کمرے میں ہل چل تھی جب اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں اور ذہن ماؤف تو وہ تخت پر بیٹھ گئی۔ اونچے اور موٹے پایوں کا تخت، جس پر سوزنی بچھا کر سفید اجلی چاندنی سی چادر بچھی تھی۔ گاؤ تکیے جن پہ لال ٹول کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ اس نے اضطراب کے عالم میں دوڑی کا پھندنا کھینچا پھر چھوڑ کر مٹھیاں بھینچ لیں۔

"کیا ہے ان میں! قسمت کی لکیروں میں تقدیر کے ستاروں میں وہ نام کہیں ہے کہ نہیں؟ وہ شخص جو زندگی بن گیا تھا مگر زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ یہ دل کے معاملات اتنے الجھے ہوئے کیوں ہوتے ہیں؟"

محبت کا ریشم، ایسے ہی یوں الجھ جاتا ہے کہ سلجھانے کی کوئی تدبیر سجھائی دیتی ہے نہ دکھائی دیتی ہے۔

اس کا دل چاہا ابھی جا کر شجاع کا گریبان پکڑ کر اتنی زور سے جھنجوڑے کہ وہ پتھر اپنی جگہ سے ہل کر رہ جائے۔

یہ آگ جس نے رخشی کا تن من جلا دیا تھا اس کی ذرا سی بھی آنچ اس تک نہیں پہنچی؟ کوئی اتنا پتھر کیسے ہو سکتا ہے، اتنا بے نیاز، اتنا لاپروا؟ التفات کی آنچ سے تو پتھر بھی موم بن جاتے ہیں، یہ شجاع احمد کون سی چٹان ہے جو اپنی جگہ ساکت ہے۔ بے جنبش، نہ حرکت نہ سانس۔ اپنی آگ میں جلتے ہوئے رخشندہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ گھنی سیاہ پلکیں لرزنے لگیں۔

"اوہ جناب! ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔ ابھی سے بیٹھنے دیکھنے شروع کر دیے؟" عفت دھم سے اس کے پاس بیٹھی اور شوخ بیانی کی۔

"جلتی پر تیل مت ڈالو عفت، جانتی ہو سب کچھ پھر بھی؟" رخشندہ نے اپنی سلگتی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ دراز بالوں کی موٹی چوٹی بےزاری سے پیچھے کی۔

"جانتی تو تم بھی ہو سب کچھ۔ پھر بھی......؟"

عفت نے اس کے الفاظ اسی کو لوٹائے۔

"ہمارا دل نہ کچھ جانتا ہے نہ جاننا چاہتا ہے۔" رخشندہ کے لہجے میں بغاوت کی آنچ اور آنکھوں میں اسی کی آگ تھی۔

"قیامت کو دعوت دے رہی ہو۔" عفت اس کے لفظوں اور الفاظ کی تپش سے سہم سی گئی۔

"وہ تو ہم کب کی دے چکے، جب سے اس آزار میں مبتلا ہوئے۔" رخشندہ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

"حیرت ہے، تم چاند بھائی پہ اسے ترجیح دے رہی ہو۔ جس کا مستقبل چڑھتا سورج ہے اور تم، اوندھی کھوپڑی، تمہیں وہ ٹمٹماتا ستارہ بھا گیا؟"

"بقول پھوپھی اماں، ہم پیدائشی سنکی ہیں۔ تمہارے نزدیک الٹی کھوپڑی ہے ہماری، پھر حیرت کیسی؟ اور بات سنو۔" اس نے پلٹ کر عفت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"یہ تو دل کی بات ہے۔ جہاں ٹھہر جائے۔ چڑھتا سورج ہو یا ٹمٹماتا ستارہ یہ اپنے بس میں نہیں ہوتا عفت جہاں بیگم۔"

"کچھ تو عقل سے کام لو۔ خالہ بیگم تلی بیٹھی ہیں رشتہ ڈالنے کو، بڑی اماں اور بڑے ابا بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو تیار ہیں۔ تم شجاع کے غم میں گھلی جا رہی ہو، خود تو مرو گی، اس بے چارے کو بھی مرواؤ گی۔" عفت کی ملامتی نگاہیں رخشندہ پر جم گئیں۔

"کم بخت ہے بھی تو بلا کی حسین، بقول چھوٹی چچی بیگم حسن اگر حد سے زیادہ ہو تو قسمت کو گہن لگا دیتا ہے۔"

"اے ہائے، اللہ نہ کرے جو رخشی کی قسمت کو گہن لگے۔" سوچتے سوچتے عفت ہول گئی۔ ایک جھرجھری لی اور سامنے ٹہلتی اس ماہ نور کے لیے دعا مانگی جس کا حسن سوگواری سے ہو کر دو آتشہ ہو گیا تھا۔

"وہ مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ ایسی باتیں مت کرو عفت۔" رخشی نے بہت دکھ اور یاسیت سے اسے دیکھا۔

"رخشی! واپس پلٹ آؤ، سوائے کانٹوں کے کچھ نہیں ہے اس رستے پر۔"

"کیا ایک انسان کے دل کی اس کے خوابوں کی، آرزوؤں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی؟" رخشندہ کے اندر بہت سے سوالات ادھم مچاتے رہتے تھے۔ ایسے

سوالات جو اُن کے ساتھ لڑکیاں سوچنے کی جرأت بھی نہیں کرتی تھیں۔

''ہم لڑکیوں کے لیے اتنی زنجیریں، اتنی دیواریں ہیں کہ سب کچھ ان میں دفن ہو جاتا ہے۔ ہم ہمارے دل، ہمارے خواب، خواہشات، سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔'' عفت کی شوخی، سنجیدگی میں بدل گئی، رخشی کے سوال نے اس کے زخموں کے ٹانکے ادھیڑ دیے تھے۔

اسے بیاہنے کو جو نواب زادہ آرہا تھا۔ اس کی بہت بڑی جاگیر تھی۔ عالی شان محلات اور سونے، ہیرے، سچے موتیوں کے زیورات تھے۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ تیسری بیوی بننے جارہی تھی یہ تو امراء و نوابین کی شان شوق اور مشاغل تھے۔ جنہیں برا کہنا بھی بہت برا تھا۔

''کیا ہماری کوئی مرضی نہیں ہوتی؟'' رخشی کے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔

''کٹھ پتلیوں کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ مگر تم تو خوش نصیب ہو، سجاد بھائی جیسا ہیرا مل رہا ہے تمہیں۔'' عفت کے لفظوں میں حسرت تو چھپی تھی مگر حسد نہیں تھا۔

''اس کم بخت الفت نے اس ہیرے کو میری بدنصیبی بنادیا ہے۔''

''کفرانِ نعمت کررہی ہو۔''

عفت اٹھ کھڑی ہوئی

''یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا''

☆☆☆

ہچکولے کھاتی ہوئی جیپ جس جگہ رکی، وہاں جنگل کا آغاز ہو چکا تھا۔ جیپ کی آواز سے ہرنوں کی ڈار قلانچیں مارتی ہوئی بھاگی۔

''صرف نر کا شکار کرنا ہے۔ مادہ کا نہیں اور گابھن پر تو بھول کر بھی گولی مت چلانا۔'' بندوق میں کارتوس بھرتے ہوئے رضا ماموں نے ہدایات جاری کیں۔

''ماموں! شیر کا شکار کب کریں گے؟'' رشید نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔

''میاں، بڑے تو ہو جاؤ پہلے۔'' ماموں نے اس کا نوخیز چہرہ اور بھیگتی ہوئی مسوں کو دیکھا۔ سب ہنس دیے رشید جھینپ گیا۔

''شیر کے شکار کا اہتمام ذرا الگ ہوتا ہے۔ ہمارے دوست ہیں کنور صاحب، ان کے ساتھ جب مہم پر جائیں گے۔ تم لوگوں کو بھی ساتھ لے لیں گے۔'' ماموں نے خوش خبری سناتے ہوئے مزید آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

وہاں ہر طرف قدرت کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ گہرے نیلے نیلم سے آسمان پر سفید بگلا سے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ نیچے مخملیں زمردی گھاس کا فرش دور تک پھیلا ہوا تھا جو جھیل کنارے کائی رنگ، کائی کی صورت میں جما ہوا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے۔ قدموں تلے گھاس کے بجائے پتوں کا فرش آگیا۔ سبز، بھورے، پیلے، نارنجی، جامنی، گہرے ہرے ایک دوسرے میں مدغم ہر موسم کے ان گنت پتوں کا دبیز فرش تاحد نگاہ تک بچھا ہوا تھا۔ کہیں کہیں چھدرے درختوں کے ہمراہ سپاٹ زمین تھی اور کہیں جنگل اتنا گھنا کہ بلند و بالا چھتنار پیڑوں نے سورج کی کرنوں کا رستہ بھی مسدود کر رکھا تھا۔

تھوڑی دیر کے سفر کے بعد ایک مقام پر ماموں نے جیپ رکوادی۔ سامان اتارا گیا خیمے اور چھولداری نصب ہو گئے۔ سامان قرینے سے لگ گیا۔

عصر کے وقت تک تین ہرن شکار ہو چکے تھے۔ انہیں ذبح کر کے کھال اتاری۔ اینٹوں کا چولہا بنا کر آگ جلادی گئی۔ امام بخش باورچی جو ہمراہ آیا تھا۔ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بھنتے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو فضا میں دور تک تیرتی چلی گئی۔

مغرب کے بعد گیس کے ہنڈولے روشن ہو گئے جو خیموں میں رکھ دیے گئے۔ باہر آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔ کھانے کے دوران خوش گپیاں بھی چلتی رہیں۔

کھانے کے بعد سب کے سب خیموں سے باہر آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔

''جب آتش جوان تھا یعنی کہ ہم تو والد صاحب کے ساتھ پورا کنبہ آتا تھا شکار کے لیے اور خصوصاً سردیوں میں، ایسے ہی الاؤ جلا کر اردگرد بیٹھ جاتے ہولے اور چنے بھون کے کھاتے جاتے اور آلہا اودل (راگ) سنتے جاتے، اب تو بہت کم رہ گئے جو اس فن میں ماہر ہوں۔''

رضا ماموں اپنے ماضی کو یاد کرنے لگے۔

''اب آپ کون سا بوڑھے ہو گئے ہیں ماموں جان! شباب اب بھی ہم رکاب ہے۔'' ساجد نے شوخی کا مظاہرہ کیا۔

عہد پیری میں شباب کی باتیں
ایسے ہیں جیسے خواب کی باتیں

رضا ماموں کوئی بہت زیادہ عمر کے بھی نہیں تھے مگر خود ساختہ بڑھاپا طاری کر رکھا تھا کہ لگا ہے اسے بیان کرتے رہتے خصوصاً اس وقت جب گھر والوں اور رشتے داروں کی طرف سے شادی کا تقاضا ہوتا تو وہ یونہی اپنی جان چھڑاتے تھے۔

''بولو! اس بڑھاپے میں کیا شادی بیاہ ہو گا؟''

انہیں اپنی یہ بنجاروں اور خانہ بدوش والی زندگی پسند تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس وقت تھی، جنگل ہو یا باغ، میدان ہو یا صحرا، پہاڑ ہو یا دریا، افراد کم ہوں۔ قدرت کے مظاہر اور خاموشی زیادہ ہو۔

جلتے ہوئے الاؤ میں چٹختی لکڑی کی آواز انہیں کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی اور ویسے تو اس وقت سارے لوگ اس رات اور خاموشی میں، کسی اور ہی دنیا میں تھے۔ آسمان کی گہری نیلی چادر پر شفاف چمکتے ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔

چاند ابھی پورا نہیں تھا مگر ایک دو روز میں پورا ہونے والا تھا۔ اپنے شباب پہ پہنچ کر ہر کوئی کیا قیامت ڈھاتا ہے۔

شجاع نے بدلیوں میں چھپتے، نکلتے چاند کو دیکھ کر سوچا اس لمحے رخشندہ کا خیال کس بپھرتی لہر کی طرح زور آور ہو کر دل کے ساحل پر آیا اور ساحل کو چوم کر دم توڑ گیا۔

☆☆☆

برصغیر میں وقت اور حالات قیامت کی کروٹ بدل رہے تھے۔ وہ قیامت جو آگ و خون میں لپٹی اس خطے کے باشندوں پر نازل ہونے والی تھی۔

3 جون 1947 کو ہونے والے تقسیم ہند کے اعلان نے ہر جگہ ہلچل مچادی تھی۔

ابراہیم علی خان کی حویلی میں بھی تشویش اور اندیشوں کی پرچھائیاں، بھوت بن کر منڈلا رہی تھیں۔

صابرہ بانو نے ماش کی پھریری دال میں تڑکا لگادیا تھا اب بھری ہوئی مرچیں کڑاہی میں تل رہی تھیں۔ شجاع کو مرچوں کے بغیر ماش کی دال کا لطف ہی نہیں آتا تھا۔

انہوں نے گرم گرم چپاتیاں بنا کر دستر خوان لگایا۔ شجاع کھانا کھا رہا تھا اور وہ عادت کے مطابق ہاتھ کا پنکھا جھل رہی تھیں۔ بڑے بھیا، کام کے سلسلے میں میرٹھ میں تھے۔

''اماں! آپ بھی کھانا کھالیں، چپاتیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔'' شجاع نے ان کی توجہ کھانے کی طرف دلائی مگر وہ کسی اور ہی ادھیڑ بن میں تھیں۔

''بنو، ایک بات تو بتاؤ؟ کیا سچ مچ پاکستان بن گیا ہے؟''

''جی اماں! فیصلہ تو ہو گیا ہے۔'' شجاع نے تلی ہوئی چٹخارے دار مرچ کا نوالہ لیا۔

''اب کیا ہو گا؟'' ان کے چہرے کی ہر جھری تشویش فکر اور پریشانی کی جھری بن گئی تھی۔

''ہم پاکستان جائیں گے۔'' صابرہ بیگم کے دونوں بیٹوں کا یہی فیصلہ تھا۔

''اپنے پرکھوں کی قبریں اور ہڈیاں چھوڑ کر کہیں اور کیسے جائیں گے۔'' اماں تو جیسے بلبلا اٹھیں۔

''ہجرت تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کی تھی۔

پاکستان بھی اسلام کے نام پر بنا ہے ماں جی! وہاں ہم اپنے معاملات میں آزاد ہوں گے۔ یہاں کیا کریں گے۔ ابھی انگریزوں کی غلامی ہے۔ پھر ہندوؤں کی غلامی میں آجائیں گے۔“

”سنا ہے بہت مارکاٹ ہو رہی ہے۔“ ماں کی خوف سے بھری آنکھوں نے بیٹے کے چہرے کا طواف کیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں ماں جی! اللہ سب خیر کرے گا۔“ شجاع نے انہیں تسلی دی مگر اسے اندازہ تھا کہ تسلی اور اطمینان کے یہ الفاظ کھوکھلے ہیں۔ بے چینی، بے اطمینانی، بدامنی اور شورش ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ تعصب، تشدد، خون ریزی اور فسادات کے زہر سے تمام خطہ نیلونیل ہو رہا تھا۔ یہ زہر کتنا اور کہاں تک مزید پھیلے گا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

رات پہلے ہی اندھیری اور گہری تھی اب مزید ہو گئی تھی۔ ماہِ رمضان شروع ہو چکا تھا مگر وہ روایتی رونق، گہما گہمی اور جوش مفقود تھا جو ہر سال فلک کی آنکھیں دیکھنے کی عادی تھیں۔ بازاروں، گھروں، راستوں کی چہل پہل، ایک محتاط اور دبی دبی چال میں بدل گئی تھی۔ عمومی حال یہی تھا کہ سحری کا وقت ہوتا تو خوف و ہراس کے چند نوالے کھا کر روزہ رکھ لیا جاتا۔ مغرب ہوتی تو ڈر اور اندیشوں کے گھونٹ پی کر روزہ افطار ہو جاتا۔

ہر برس کی طرح نہ وہ لمبے چوڑے دسترخوان تھے۔ نہ ہی قسم قسم کے پکوان اور مشروبات، دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھتے تو ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا وقت ہو جاتا۔ چہار اطراف سے بری خبروں کا نزول، گھٹاؤں کی طرح امڈا چلا آرہا تھا۔ آفات و بلیات، مصائب حوادث، انگریزوں کی طرح اس خطے پر قبضہ اور سکہ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ ”یا اللہ رحم“ کی ان گنت تسبیحیں زبانوں کے پل سے گزر کر قدرت کے توشہ خانہ میں جمع ہو چکی تھیں۔ عید کی آمد کے پلو میں وہ لرزہ حالات و واقعات بندھے چلے آرہے تھے جنہیں تاریخ کا خونچکاں حصہ بن جاتا تھا۔

☆☆☆

شب کی سیاہی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ سامنے تپائی پر لندن سے آیا ہوا خط رکھا تھا۔ جو سجاد نے بھیجا تھا۔ ولایت سے آیا یہ خط مختصر اور جامع تھا۔ سجاد نے لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بجائے مدعے کی بات کی تھی۔ خط کا ایک پیرا، ابراہیم علی خان نے بار بار پڑھوا کر سنا، اور اب وہ الفاظ ان کے ذہن کی تختی پر نقش ہو گئے تھے۔

”معذرت خواہ ہوں کہ ہمارے لیے آنا فی الوقت ناممکن سا ہے۔ ساری صورت حال آپ سب کے سامنے ہے۔ مستقبل میں، میرا پاکستان جانا کب ہو، میں نہیں جانتا۔ بہتر یہی ہے کہ رخشندہ میرے نام اور انتظار میں بیٹھی نہ رہیں۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ رخشندہ کے مستقبل کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔“

ابراہیم علی خان نے پیچوان کے دو گھونٹ لیے اور منہال منہ سے نکال کر بیٹے بہو کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ابراہیم علی خان نے اپنا جو فیصلہ سنایا تھا۔ اس کی حمایت میں مزید کچھ کہہ رہے تھے۔

”کنبہ غریب ہے مگر شریف ہے۔ ہڈی اور خون تو اپنا ہی ہے۔ پھر آگے کا کیا معلوم، انقلاب کا دور ہے۔ اور اس میں تو پھر زمین، آسمان بن جاتی ہے۔ آسمان، زمین ہو جاتا ہے۔ تو جانے کل کو کتنے شریف، رذیل ہو جائیں۔ کتنے رذیل شریف بن جائیں حویلیوں والے جھونپڑیوں میں آجائیں اور کٹیا والے کوٹھیوں کے مالک بن جائیں۔“

انہوں نے مستقبل کی جو تصویر کھینچی تھی وہ آنے والے وقت کی پیشن گوئی بن گئی۔

ابراہیم علی خان کے فیصلے سے شجاع تصویر حیرت بن گیا۔ اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ دو دن بعد بیٹے کے نکاح کے لیے کیا تیاریاں کریں؟ کیسے کریں؟ کچھ حاسد اپنے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے حق دق رہ گئے اور رخشندہ پر تو شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔

دعائیں یوں بھی مستجاب ہوتی ہیں
معجزے بھی اسی دنیا میں ہوتے ہیں

اس کی شربتی آنکھوں کے رنگ اور بھی تاباں ہو گئے تھے۔

دل کا کنول کھل کر فروزاں ہو گیا تھا۔

شجاع کی حیرانی، مسکراہٹ میں بدل گئی۔ دھوپ سی اجلی مسکراہٹ اس کرن کی چمک دار جو اماں، دلہن کے دوپٹے میں ٹانک رہی تھیں۔

”بھلے دن ہوتے تو شایانِ شان بری جوڑتی۔ اب ان حالات میں تو بس یہی ممکن ہے۔“ اماں نے نکاح کے سرخ دوپٹے پر بنے ریشم کے پھولوں کو انگلیوں سے چھوا۔ جہاں آرا، عفت، صفیہ اور سلامت بی بی نے راتوں رات ریشم کے پھول کاڑھ کر یہ دوپٹہ تیار کیا تھا۔ کمخواب کا غرارہ سل رہا تھا۔ چھوٹی چچی بیگم نے مہندی توڑ کر پسوالی تھی۔

عشاء کے بعد جب ساری خواتین اور لڑکیاں گول کمرے میں جمع تھیں۔ عفت نے اپنا آنچل سنبھالا اور دوسرے کمرے میں موجود رخشندہ کے پاس آئی۔

”چل رہی ہو؟“

”کہاں؟“ اپنی لانبی اور تھوڑی تھوڑی گھنگریالی زلفوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے رخشندہ نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں اس کے چہرے کی آب و تاب میں یکا یک ہی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

”اللہ قسم رخشی! اتنی حسین لگ رہی ہو کہ کیا بتاؤں ڈرتی ہوں، کہیں نظر نہ لگ جائے۔“ عفت نے بے ساختہ کہا۔

”بناؤ مت، میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں سوچ سوچ کر۔“ رخشی کے خوب صورت چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

”حالات بہت خراب ہیں۔ پتا نہیں کیا ہو، ڈر لگ رہا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ بیڑا پار لگائے گا۔ اچھی امید رکھو۔ چلو اوپر چلیں چھت پر۔“ عفت نے اس کے بالوں میں بل ڈالنے شروع کیے۔

”اس وقت؟“

”ہاں تو، چاند اسی وقت دیکھا جاتا ہے۔“

”کون سا چاند؟ ابھی تو آدھے روزے ہوئے ہیں۔“

”ماہ کامل دیکھ لینا۔“ عفت نے اس کی لانبی چوٹی میں ربن لگایا۔

”جہاں آرا کو بھی لے لیں۔“

”ہرگز نہیں، وہ تمہارے غرارے میں بیل ٹانک رہی ہے۔ پھر اسے اٹھایا تو سب کے علم میں آئے گا کہ ہم چھت پر جا رہے ہیں۔“ عفت نے اس کی تجویز رد کر دی۔

”بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چاند تو چھپا ہوا ہے۔“ چھت پر پہنچ کر رخشی نے آسمان کی سمت نگاہ دوڑا کر مایوسی سے کہا۔

”آسمان کا چاند، بادلوں میں چھپا ہے مگر تمہارا چاند تو یہیں ہے محترمہ!“ عفت شرارت سے مسکائی۔

رخشی کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔ سامنے شجاع کھڑا تھا۔ نہ جانے کس کونے سے نکل کر آیا تھا۔

”دیکھ لیجیے شجاع بھائی! وعدہ پورا کر دیا ہم نے۔“

”بندہ مقروض ہے آپ کا۔“ شجاع نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر جھکایا۔

”میں سیڑھیوں پر ہوں۔ زیادہ وقت نہیں ہے آپ کے پاس، دھیان رہے۔“ عفت سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

شجاع کی نگاہیں گستاخ تھیں نہ بے باک، بس ایک نرم میٹھی سی آنچ تھی مگر پھر بھی رخشی سے اپنا دل اور دھڑکن سنبھالنا محال ہو رہا تھا۔ اوپر سے غضب ہوا کہ بدلیاں ہٹ گئیں۔ چودھویں کا چاند اپنے مکمل نور کے ساتھ جگمگا رہا تھا اور اس کی روشنی میں رخشندہ کا کچھ گھبرایا۔ کچھ شرمایا سا چہرہ اتنا الگ اور انوکھا لگ

رہا تھا کہ شجاع مبہوت ہو گیا۔

"پہلے تو کبھی نہیں گھبرا ئیں تم، جب ذرا اور خطرہ زیادہ تھا آج کیا ہوا؟" شجاع کی نگاہیں بے ساختہ ہی اس کی آنکھوں سے الجھ رہی تھیں اور وہ بیر بہوٹی بنی جا رہی تھی۔

"کیوں بلایا ہے ہمیں؟"

"عادت سی پڑ گئی ہے۔ پہلے آپ خود آتی تھیں آج ہم نے بلالیا۔" شجاع کے چہرے پر اجلی کرن سی مسکراہٹ چمکی۔

"ہم باغی ہو گئے آج۔" رخشی کے لبوں پر شرارتی مسکراہٹ دبکی۔

"کسی کی جرأت نے بہادری سکھادی۔" شجاع نے بے جگری کا مظاہرہ کیا۔

"اور کسی کے جذبہ دل نے؟" رخشی اپنی سوچ پر خود ہی شرما گئی۔

"سجاد کی بدولت زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہمیں۔" بے خودی تھی یا وارفتگی تھی۔ انتہائے شوق تھا یا بے ساختگی۔ شجاع ایک قدم آگے بڑھا تھا اور رخشندہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ احتیاط تھی۔ گریز تھا۔ شرم تھی یا حیا، اپنی لرزتی انگلیوں سے سر پر آنچل درست کرتے ہوئے رخسار دہکنے لگے۔ شوخ ہوا کی اٹھکیلیاں، اوڑھنی بھی بے ترتیب کر رہی تھیں اور دل کی دھڑکنیں بھی۔

"اور سجاد کی بدولت ہمیں زندگی مل گئی۔ تمام کائنات مل گئی۔"

رخشندہ کی قاتل نگاہوں نے وسیع آسمان دیکھا۔ اپنی تقدیر کی طرح جگمگاتا چاند دیکھا۔ الفت کی طرح روشن شجاع کا چہرہ دیکھا۔ رات کی رانی سے مہکی ہوا کی مٹھیوں سے اپنا آنچل چھڑایا اور خود کو دیکھتی۔ بے خود نگاہوں سے آنکھیں چرا ئیں خوابوں کی کہکشاں تھی کہ یہاں سے وہاں تک جگمگا رہی تھی۔ ان کی چاندنی سی راہ گزر پر چند لمحوں میں صدیوں کا سفر طے ہو گیا۔

"رخشی، رخشندہ بیگم!"

عفت کی محتاط پکار سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ جو کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی، یکا یک اپنی دنیا میں واپس آ گئی۔

"جلدی کرو، اب چلو۔"

"آتے ہیں۔" رخشی نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"ذرا ٹھہرو۔" شجاع نے آگے بڑھ کر اس کا پلو تھاما "اتنی جلدی جا رہی ہو؟" اس کی بے تاب نگاہوں نے سوال کیا۔

"کوئی دیکھ نہ لے۔" رخشندہ کی ساری بہادری اس وقت ہوا ہو گئی تھی۔

"دیکھ تو لیا سب نے۔ زمین، آسمان، چاند، ستارے، ہوا، یہ رات، یہ وقت، اور میں اور تم سب نے سب کچھ دیکھ لیا۔ اب کس کا خوف ہے!" آج شجاع کی جرأت اور ہمت، ہمالیہ کی چوٹیوں پر تھی۔ اور رخشی کے لیے نظر اٹھا کر دیکھنا محال ہو رہا تھا۔

"جانے دو، عفی بلا رہی ہیں۔" رخشی نے آنچل چھڑایا۔

سیڑھی پہ قدم رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا شجاع یونہی کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے مگر اس کی نگاہیں اس کا دل، اور وہ مجسم خود رخشی کے ہمراہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

"ہائے اللہ!" کمرے میں جاتے ہی رخشی چھپر کھٹ پر گر پڑی۔

"تم نے تو آج مروا ہی دیا ہے۔" اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل پہ اس نے ہاتھ رکھا۔

"میں نے؟ آپ تو جانے کب سے مری ہی تھیں ان بے چارے پہ۔" عفت نے آنکھیں پھاڑیں۔ "احسان بھی کرو اور باتیں بھی سنو؟"

"ایسا لگ رہا ہے۔ دل ہاتھوں میں آ جائے گا۔"

"کس کے؟" عفت کی شوخی، اللہ رے۔

"ہشت، بے شرم!" رخشی کا تمتماتا چہرہ اور بھی گلگوں ہو گیا۔

"جی ہاں، اب تو ہم ہی ٹھہرے بے شرم بھی اور بدتمیز بھی۔" عفت مسلسل چٹکیاں لے رہی تھی۔

"کیسی خوشی ہے جس میں ہمارے بہت سے پیارے شامل ہی نہیں۔" رخشی آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔

حویلی کے آدھے سے زیادہ مکین تو پرندے بن اڑ چکے تھے۔ جس کنبے کو جیسے جیسے سہولت ملی چلا گیا۔ درجنوں لوگوں اور ڈھیروں ڈھیر آوازوں سے بھرے اس آشیانے میں اب فقط گنتی کے ہی دس بارہ مکین بچے تھے اور چند نفوس شاگرد پیشہ جو نمک حلالی کی مالا گلے میں ڈالے یہاں سے [illegible] جانے پر راضی نہ ہوئے۔

"جو رہ گئے ہیں، وہ بھی چلے جائیں گے۔"

عفت نے رخشی کی طرف دیکھا۔

"تم بہت نصیبوں والی ہو رخشی! دل کی مراد یوں پوری ہو گئی۔ جیسے چودھویں کا چاند بچے وقت پر پورا ہونا ہی ہے۔ تمہارے دل کی لگن سچی تھی۔"

"پتا نہیں، دل کی لگن سچی تھی یا تقدیر میں ہمارا ملن رقم تھا؟"

عفت چلی گئی تھی۔ رخشی کا دل فراخ زمین بن گیا تھا۔ جس پر سپنوں کی بارش چھما چھم برس رہی تھی۔ بیر خوشی کے عالم میں وہ بھیگتی جارہی تھی، جھومتی جارہی تھی۔ آنکھیں بند کیے، بارش کی بوند بوند میں شرابور، کچھ وقت کے لیے وہ بھول ہی گئی کہ اس حویلی کے باہر کی دنیا میں طوفان برپا ہے۔ فساد کا ہنگامہ ہے۔ آگ وخون کی ہولی ہے۔ وہی نہیں بلکہ حویلی کے سارے مکین ذرا دیر کے لیے ہی اپنی خوشی میں مگن ہو کر اردگرد سے غافل ہوئے تھے اور یہ خود فراموشی اور بھول ہی غضب ہو گئی۔ وہ غضب ناک بلوائی اسی رات آن پہنچے۔ آدھی رات ادھر، آدھی رات ادھر، آگ، دھواں، آہیں، کراہیں، چیخیں۔

شجاع کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف جھلسا دینے والی آگ تھی۔ دم گھونٹ دینے والا دھواں، دلوں کو لرزا دینے والی آوازیں تھیں۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں دم گھٹ رہا تھا۔ کثیف دھوئیں میں کچھ بھی دیکھنا محال تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا، اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔

"اماں ..... اماں!" اس نے بے چین ہو کر پھر صدا لگائی مگر آواز بند حلق سے نکلنے سے انکاری ہوئی۔ حلق کے ساتھ ساتھ سانس بھی بند ہو رہی تھی۔ اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنا سینہ مسلا اور تیورا کر گر پڑا۔

بہت سی آوازیں تھیں جو آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ رحم کی بھیک مانگتی آوازیں، التجا کرتی آوازیں۔ مدد کے لیے پکارتی آوازیں۔

"اٹھو، اٹھو بیٹا، آنکھیں کھولو۔" مختلف اور متعدد آوازوں میں ایک آواز اور شامل ہو گئی۔ کوئی اس کے رخساروں کو زور زور سے تھپتھپا رہا تھا۔

اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک جلن ہو رہی تھی۔ حلق اور سینے میں دھوئیں کی کڑواہٹ بھری ہوئی تھی۔

"کھڑے ہو جاؤ۔ جلدی کرو، نکلنا ہے یہاں سے" اس بار شجاع کے کچھ کچھ بیدار ہوتے دماغ نے رضا ماموں کی آواز پہچان لی اور ان کا چہرہ بھی جو اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں گھمائیں ان کے برابر میں رشید تھا اور احسن جو اسے سہارا دے کر اٹھا رہے تھے۔

"وقت نہیں ہے شجاع ہمت پکڑو، تیز چلو۔" جھومتے ہوئے شجاع کو انہوں نے پکڑ کر گھسیٹا۔ ان کی آوازیں خوف اور صدمے میں بھیگی ہوئی تھیں۔

وہ چل رہا تھا یا گھسٹ رہا تھا اس کا دماغ ابھی تک ایک سناٹے کے عالم میں تھا۔ جلتی ہوئی آنکھوں کو اس نے بے چینی سے مسل کر آگے دیکھا۔ وہ تین ہیولے تھے۔ چاند بادلوں میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اسی وقت وہ بدلی کی آغوش میں سمایا اور تاریکی کو اپنی دھاک بٹھانے کا موقع مل گیا۔

"اماں ..... اماں کہاں ہیں۔ باقی سب کہاں ہیں؟" شجاع نے یکدم ہی ایک انجانے خوف کے

ساتھ رضا ماموں کو دیکھا جو اپنی شکاری بندوق ہاتھ میں لیے بمشکل چل رہے تھے۔ اسی کی بدولت وہ ان بچے کھچے نفوس کو یہاں تک لائے تھے۔

"وہیں رہ گئے۔ حویلی میں ہی۔" رضا ماموں کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

"ہم سے بھی قیمت وصولی کر لی گئی پاکستان بنانے کی۔" رضا ماموں میں بہت ہمت، جرات اور حوصلہ تھا کہ وہ بول رہے تھے ورنہ وہ جو ابھی موت کو سامنے دیکھ کر اس کے جبڑوں سے نکل کر ایک بار پھر جان بچانے کو بھاگ رہے تھے۔ ان میں تو اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ کچھ بول کر اس پہاڑ جیسے غم کو بیان کر سکتے۔ بجھی بجھی آنکھوں میں دل دہلانے والی وحشت تھی۔ ایسی وحشت جس نے آنسوؤں پر بھی جیسے بند باندھا ہوا تھا۔

شجاع دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا مگر اس کی ساری حسیات کند ہوئی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفلوج ہو رہی تھی۔ ورنہ اتنا تو سوچ ہی لیتا کہ جنہیں پرکھوں کی قبریں اور ہڈیاں چھوڑ جانے کا ملال تھا۔ انہیں اپنے لیے دو گز زمین بھی نہ ملی۔ آگ اور موت نے مہلت ہی نہ دی۔

☆☆☆

رضا ماموں کے کوئی دوست تھے۔ کچھ وقت کے لیے وہاں پناہ مل گئی تھی مگر جائے پناہ وہاں تھی کہاں؟ یہاں بھی موت اور خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ پہلی اور آخری پناہ گاہ بس پاکستان تھی۔ جہاں جانے کے لیے وہ ریلوے اسٹیشن آ گئے تھے۔ یہاں ان جیسے ہزاروں تھے۔ جو ٹرین کے انتظار میں تھے۔ ہر ایک چہرے پر قربانیوں کی کوئی نہ کوئی داستان رقم تھی۔

ٹرین جیسے ہی آ کر رکی۔ انسانوں کا ایک سیلاب تھا جو اس میں سمانے کے لیے بے تحاشا آگے بڑھا۔ ان امنڈتی ہوئی موجوں کے درمیان راستہ بنانا اور ٹرین میں چڑھنا آسان نہ تھا مگر کسی نہ کسی طرح رضا ماموں اور شجاع نے ایک ایک کر کے چاروں کو دھکیل دیا۔ جہاں آرا، گوہر، رخشندہ، احسن اور رشید جس نے پیر جماتے ہی رضا ماموں کو بھی گھسیٹ لیا۔ ان کا دوسرا ہاتھ شجاع کے ہاتھ میں تھا۔

انہوں نے شجاع کو اوپر لینے کی کوشش کی مگر وہاں تو اب تو پیر رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ دھکم پیل، افراتفری ہر کوئی دوسرے کو دھکیل کر اپنے لیے راستہ اور جگہ بنا رہا تھا۔ ٹرین رینگتے رینگتے رفتار پکڑنے لگی تھی۔ ایک زوردار دھکا لگا اور شجاع تیورا کے منہ کے بل گرا۔ لوگوں کا ہجوم اسے کچلتا ہوا گزر رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار اور بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے انبوہ کثیر نے مسافروں کا اترنا تو درکنار اپنی جگہ سے ہلنا بھی مشکل کر دیا تھا۔

رخشندہ کی۔۔۔ خوف سے سہمی نگاہوں نے اپنے آس پاس دیکھا۔ ماموں، احسن، رشید، گوہر، جہاں آرا،

"شجاع کہاں ہے؟" مارے وحشت کے اس کی آواز پھٹ گئی۔

"ماموں...... ! احسن بھائی......!" رخشی کے لب کپکپائے۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپنے لگا۔

بے بسی اور غم کی شدت طوفان بن کر حملہ آور ہوئی تھی اس کا پورا وجود گھاس کا تنکا بن گیا۔

پلیٹ فارم پر پڑے شجاع کی دھندلائی نگاہوں نے جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھا۔ کچلے ہوئے بدن سے بری طرح ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

کرب اور صدمے کا سورج سوا نیزے پر آ گیا۔ وہ سر تا پا جھلس رہا تھا۔ جل رہا تھا۔

☆☆☆

پتا نہیں کتنے گھنٹے گزر گئے تھے، وہ سوئی جاگی سی کیفیت میں تھا۔ محسوس ہوا کہ وہ گھسیٹا جا رہا ہے پھر کسی نے اس کے چہرے پہ پانی ڈالا وہ دو تین افراد تھے جو تیز آواز میں بول رہے تھے۔ شجاع نے بند آنکھیں کھولنے کی سعی کی مگر ناکام رہا۔ پاؤں جیسے من من بھر کے ہو رہے تھے تمام بدن پھوڑا بنا دکھ رہا تھا۔

شعلے اگلتی آنکھوں اور ہتھیار لہراتے اور انسانوں پر اٹھاتے بلوائیوں کے بیچ وہ دو مہربان تھے جو کبھی جان بچا رہے تھے تو کبھی زخموں پہ مرہم رکھ رہے تھے۔ ہفتہ بھر اپنی جھونپڑی میں انہوں نے مہمان بنا کر رکھا جب اس کی حالت ذرا بہتر ہوئی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو رمضان کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا۔

شجاع نے لوٹے کی ٹونٹی سے پانی کی دھار ہتھیلی کی اوک میں گرائی اور منہ پر چھپاکا مارا اور کراہ کر رہ گیا۔ چہرے کی چوٹوں میں ابھی بھی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

شجاع نے خاک میں پڑے تنکے کو اٹھایا اور آسمان کی جانب نگاہ دوڑائی زمین بے رحم تھی آسمان نامہربان، فضاؤں میں نفرت اور تعصب گھلے تھے۔ ہواؤں میں بارود کی بو تھی۔ وہ مددگار فرشتے اس سے زیادہ سہارا نہیں دے سکتے تھے۔ اور ویسے بھی اسے جانا تو تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں ایک ہجوم کھڑا تھا۔ شجاع بھی ان ہی کا حصہ بن گیا۔ اسے چھوڑنے آئے ایک فرشتے نے ایک چھوٹی سی پوٹلی اس کے ہاتھوں میں تھمائی۔

"کیا ہے یہ؟" شجاع کی سوالیہ نظریں اٹھیں۔

"راستے میں بھوک لگے گی، کھا لینا۔"

شجاع کی انگلیوں نے پوٹلی میں بندھے چنے محسوس کیے۔ اور اس لمحے اسے ایک حقیقت کا ادراک ہوا کہ وقت، حالات اور افراد بھی کتنے ہی برے اور بدترین کیوں نہ ہوں، ان سب کے درمیان کہیں نہ کہیں اچھے لوگ ضرور ہوتے ہیں اور اچھا وقت بھی۔

خوف اور دہشت کے سائے تلے، آس و امید کے چراغ ہتھیلیوں پہ رکھے سفر شروع ہوا، دہلی سے لاہور ایک رات کا سفر دو دن دو راتوں پہ محیط ہو گیا۔ گھپ اندھیری راتوں میں گاڑی کئی کئی گھنٹے رکی رہتی۔ اللہ اللہ کر کے واہگہ بارڈر آیا مسافر منزل مراد پہ اترے تو پیشانیوں کے سجدے اس سرزمین کے حوالے کر دیے۔ جس کے لیے سب کچھ لٹا کر آئے تھے۔

شجاع والٹن ڈپو کیمپ پہنچ گیا تھا۔ جہاں جتنے لوگ تھے اتنی ہی کہانیاں تھیں، خانماں و برباد، لٹے پٹے، بے آسرا و بے سہارا یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ شجاع نے تمام کیمپ چھان مارا۔ اس کو کوئی نظر نہ آیا۔ نہ رضا ماموں، نہ احسن، رشید، گوہر، جہاں آرا اور رخشندہ کوئی نہ تھا، شجاع کا دل بیٹھ گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح ایک ایک فرد کو دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی چہرے میں کوئی شناسائی کی جھلک ہو، کسی اپنے، کسی پیارے کی شبیہ ہو مگر ناکام رہا۔ دو دن سے وہ دیوانوں کی طرح سب کو کھوج رہا تھا، مگر کسی کا کوئی نام و نشان تک نہ ملا۔ آج بھی تھک ہار کے وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ تاریکی زیادہ تھی۔ روشنی کم تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم باہر کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انگلی کے اشارے سے ایک دوسرے کو چاند دکھا رہے تھے جو نظر آ گیا تھا۔

آج چاند رات تھی کل عید۔ نئے وطن میں پہلی عید، لوگ ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔

شجاع نے آسمان کے ایک کنارے وہ باریک سا چاند دیکھا اور اسے وہ روشن، چمکتا بھرپور چاند اور آسمان یاد آئے، وہ رات، وہ چاندنی، وہ آنچل، وہ سحر انگیز جھکی ہوئی پلکیں۔

وہ سب خواب تھا؟ اس نے گردن گھما کر اپنے آس پاس دیکھا، بے مائیگی، کسمپرسی اور بے کسی کے سمندر میں غوطے کھاتے لوگ، پھر بھی حوصلے، ہمت اور امید کا دامن پکڑے ہوئے۔ ایک دوسرے کو چاند کی مبارک باد دیتے لوگ۔

وہ پھر سے گزرے وقت میں پہنچ گیا۔ چاند دیکھ کر سب دعا مانگتے، ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے، بڑوں کو سلام کر کے مبارک باد دیتے، عید گرمیوں میں آتی تو اماں اپنے ہاتھ سے دونوں بھائیوں کے لیے کرتے کاڑھتیں اور سیتیں، چاند رات کو تخت پر دونوں کے جوڑے رکھ دیے جاتے ان پر

سفید ٹوپیاں، نیچے جوتیاں، بھیا کے میرٹھ جانے کے بعد بھی وہ چاند رات میں بچوں کی طرح بار بار اپنے جوتے پہن کر دیکھتا، ٹوپی سر پہ رکھتا اور اماں ہنستیں۔

"شجاع میاں! اب بڑے ہوجاؤ، کب تک بچے رہو گے۔"

"اماں جان آپ اور بھیا بڑے ہیں نا ہمیں کیا ضرورت ہے بڑا ہونے کی، ہم چھوٹے ہی ٹھیک ہیں۔"

شجاع نے یادوں کی ڈور لپیٹ لی۔ آسمان کے کنارے خربوزے کی باریک پھانک سا چاند غائب ہوچکا تھا۔

"آپ دونوں کے بعد اب میں بڑا ہوگیا ہوں اماں جان! اتنا بڑا کہ پہاڑ سے غم بھی اپنے اوپر لادے جی رہا ہوں۔" شجاع کی آنکھوں کی نمی تمام وجود میں پھیلتی چلی گئی۔

☆☆☆

اداسی کی صبح کے ساتھ عید کا دن شروع ہوا اور مایوسی کی شام میں ختم ہوگیا۔ کچھ مخیر حضرات کی طرف سے آج کے دن پلاؤ اور زردے کی دیگیں آئی تھیں۔ ہر ایک کو، اس کے غموں نے جتنی اجازت دی، وہ اتنی ہی خوشی منا رہا تھا۔ شجاع کے سامنے پلاؤ کی پلیٹ رکھی تھی۔ اس نے نوالہ بنایا اور کھانے کی کوشش کی مگر چاولوں کے ساتھ آنسو اور نہ جانے کتنے ہی خیالات گلے میں اٹک رہے تھے۔ تب ہی عمر حامد اس کے پاس آکر بیٹھا۔ وہ یہاں رضاکار تھا۔

شجاع پہلے اپنے طور پر رضا ماموں اور باقی سارے افراد کو تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ناکام اور تھک ہار کے رضاکاروں کی مدد لی جو وہاں امدادی کام کررہے تھے، عمر ان ہی میں سے ایک تھا، جس سے شجاع نے مدد مانگی تھی۔

"کیسے ہیں شجاع بھائی، کھانا کھالیا آپ نے؟ ارے آپ کی پلیٹ تو یوں ہی رکھی ہے۔ جلدی جلدی کھائیں، ٹھنڈے ہوکر تو چاول مزا نہیں دیتے۔"

عمر تقریباً شجاع کا ہم عمر ہی تھا۔ ہر ایک کے نام کے ساتھ بھائی لگا کر مخاطب کرتا۔

"کھا رہا ہوں، تم بتاؤ کچھ پتا چلا؟" شجاع جو بے دلی سے لقمے لے رہا تھا، بے چین ہوکر سوال کرنے لگا۔

"معلومات کروا رہے ہیں ہم۔ دیکھیں، جلدی پتا چل جائے گا۔ ان شاء اللہ عمر۔" بولتے بولتے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں پانی لے کر آتا ہوں آپ کے لیے۔"

کچھ دیر بعد پانی کا گلاس لاکر اس نے شجاع کے قریب رکھا۔

شجاع نے بمشکل پلیٹ صاف کی اور پانی کا گلاس اٹھالیا۔

"شجاع بھائی! آپ نے کیمپ میں لوگوں کا حال دیکھا، لوگ کیسے آگ اور خون کے سمندر سے گزر کر آئے ہیں؟" عمر نے بات شروع کی۔

"ہر ایک کی اپنی ایک کہانی ہے۔" شجاع نے سامنے دیکھا جہاں ایک باریش شخص میلے کپڑوں میں ملبوس الجھے ہوئے بال، دیوانوں کی طرح ادھر سے ادھر پھرتا رہتا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ شجاع کو نہیں معلوم تھا۔ اس کی کہانی کیا ہے مگر عمر کی بات سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"یہ ایک روز کام سے گھر واپس آیا تو نہ گھر رہا نہ گھر والے، بلوائی آئے تو تین بیٹیوں اور بیوی نے گھر کے کنویں میں چھلانگ لگادی، چار بیٹے تھے، انہیں حملہ آوروں نے گھر کے ساتھ ہی آگ میں جھونک دیا، نہ جانے کیسے یہ یہاں آگیا مگر نہ زندوں میں نہ مردوں میں۔" عمر نے ایک آہ بھری اور شجاع کے چہرے پر نظر ڈالی، اس کی آنکھوں میں کچھ تھا، شجاع چونک گیا۔ اور اگلے ہی لمحے اسے ادراک ہوا کسی انہونی بات کا۔

"تمہارے پاس کچھ ہے مجھے بتانے کے لیے، اسی لیے تم تمہید باندھ رہے تھے؟" شجاع نے اس

"شجاع بھائی! آپ نے جس دن اور تاریخ کی ٹرین کے بارے میں بتایا تھا، اس کے تین روز بعد ایک ٹرین یہاں آئی تھی مگر......"

"مگر کیا؟" شجاع اس وقت زمین و آسمان کے درمیان معلق ایک تنے ہوئے رسے پر کھڑا تھا۔

اس میں کوئی نہیں تھا، فقط......لاشیں تھیں۔

☆☆☆

اتنی بڑی اور بھری دنیا میں وہ اکیلا ہے بالکل اکیلا، بے سروسامان۔ بے آسرا۔ نہ گھر تھا نہ گھر والے، یہ روح فرسا خیال ہی مار ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ جلا ہوا آشیانہ اور سوختہ لاشیں چھوڑ کر آتے ہوئے آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ زبان گنگ اور وجود سنگ ہوگیا تھا۔ آنسوؤں کی بارش اندر ہی اندر ہوتی رہتی وہ مگر اب نئے پرانے سارے دکھوں نے مل کر اسے نمک کا بنا ڈالا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، بلک بلک کر آنسو بہا رہا تھا۔ اس کا تمام وجود اپنے ہی آنسوؤں میں پگھل رہا تھا، پگھل رہا تھا۔

عمر سمیت کئی لوگ اس کے پاس جمع ہوگئے تھے دلاسے، تسلیاں، ہمدردی، صبر کی تلقین، جتنے ہی سکے اس کے کشکول میں گررہے تھے۔

راتوں میں اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ ادھر سے ادھر ٹہلتا رہتا۔ دن میں ایک پتھر پہ گھنٹوں خاموش بیٹھا رہتا۔ لوگ چلتے پھرتے اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے، اعلانات کی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکراتیں، مگر وہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا، نہ سن رہا تھا، کچھ سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ خالی الذہن فضا میں کسی غیر مرئی نکتے کو گھورتا رہتا۔

"وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو فقط اپنے ہی غموں کو سینے سے لگا کر گزاری جائے؟"

"شجاع بھائی، ہمیں رضاکاروں کی ضرورت ہے۔ ان گنت زخموں پہ مرہم رکھنے کے لیے، بے شمار بے سہاروں کا سہارا بننے کے لیے۔"

عمر سمیت کئی افراد جو اس کا دکھ بانٹنے روز اس کے پاس آتے اور ایک روز شجاع بھی ان ہی کا ایک حصہ بن گیا۔ اس نے زندگی کا ایک اہم سبق سیکھ لیا تھا کہ دوسروں کا درد بانٹنے سے اپنے درد کی شدت کم ہوتے ہوتے ختم ہوجاتی ہے۔

لٹے پٹے بدحال کھنڈروں، انسانوں اور لاشوں سے بھری ٹرینیں ابھی تک آرہی تھیں۔ کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈ کر ملانا، زخمیوں کے درد کا درماں بننا، بے سہاروں کو سہارا دینا، تسلی، تشفی، دلجوئی، اپنے کام کو شجاع نے محض کام نہیں بلکہ اپنا مشن اور جنون بنالیا تھا۔

☆☆☆

وہ شکل سے بائیس تئیس برس کا دبلا پتلا لڑکا تھا صاف رنگت کھڑے نقوش، کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور کرتا پہنے اکثر نظر آتا، کبھی تو بالکل درست دماغی حالت کے ساتھ ٹھیک ٹھاک باتیں کرتا، سلام دعا، حال احوال اور کبھی یکسر انجان بن جاتا کہ اپنے اردگرد سے بے خبر انگلیوں سے ہوا میں دائرے بناتا رہتا۔ بیٹھے بیٹھے بچوں کی طرح کھلکھلانے لگتا تو کبھی منہ بسورنے لگ جاتا۔ کبھی دیوانگی کبھی ہوش مندی، اس کے روز و شب کا چلن یہی تھا۔

پٹنے کے کوئی حکیم صاحب تھے۔ اپنی بیوی، بیٹے اور بھتیجی کے ساتھ کیمپ میں مقیم تھے۔

رات میں تھک ہار کے جب وہ لیٹتا تو اصولاً تو جسم کے تقاضے کے مطابق نیند کی آغوش میں چلے جانا چاہیے مگر دل و دماغ کے مطالبات کچھ اور تھے۔ اب بھی، جب کہ درد کی شدت اور غم کی حدت دھیرے دھیرے کم ہورہی تھی۔ وہ رات گئے تک کیمپ سے باہر بیٹھا رہتا یا ٹہلتا رہتا۔ یادوں کے اور چہروں کے چراغ ایک ایک کرکے روشن ہوجاتے۔ اس روشنی میں وہ ماضی کی ڈولتی پرچھائیاں دیکھتا رہتا۔ آج تو پورے چاند کی رات تھی۔ کیا کیا کچھ تھا جو اسے یاد آرہا تھا۔ ایسی ہی ایک رات میں جو بہت اندھیری نہیں تھی، جس میں چاندنی کا اچھا خاصا اجیارا تھا۔

اس رات میں وہ ابوالحسن کے ساتھ بیٹھا باتیں

کر رہا تھا۔ اس کا کالج فیلو، آج دن میں اس سے اچانک ملاقات ہوئی اور آج کئی ہفتوں بعد شجاع پہلی بار مسکرایا اور اس کے دل نے خوشی محسوس کی۔

ابوالحسن ان خوش نصیبوں میں تھا جو اپنے گھرانے کے ساتھ بخیر و عافیت پاکستان آ گئے۔ شجاع کے ساتھ وہ ڈھیروں باتیں بس آج ہی کر لینا چاہتا تھا۔ اپنے پُرخطر کی داستان سنانے کے بعد وہ مستقبل کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

"ماموں جان نے کراچی میں میری نوکری کا بندوبست کیا ہے ان کی اپنی رہائش بھی وہیں ہے ہم لوگ بھی وہیں شفٹ ہو رہے ہیں۔"

"اچھا!" شجاع کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ "اتنی سی دیر کے لیے ملے تھے دوست۔"

"تم بھی چلو ہمارے ساتھ، ماموں سے کہہ کر تمہاری جاب کا بندوبست کروا دوں گا۔" ابوالحسن نے آفر کی۔

"میرا تو کوئی بھی نہیں ہے، کہاں رہوں گا؟ کیسے؟"

"جہاں ہم رہیں گے، وہیں رہ لینا یار! ماموں نے خط میں لکھا تھا کہ کراچی بڑا غریب پرور شہر ہے ہر آنے والے کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہا ہے۔ ہم چلتے ہیں دوست دیکھتے ہیں وہاں زندگی کا کیا ڈھنگ ہے؟ دل لگ جائے تو ٹھیک، ورنہ واپس آ جانا، ٹھیک ہے؟"

ابوالحسن نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔ شجاع کے چہرے پہ آمادگی تھی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ ہوائیں خشک اور گرد آلود ہو گئی تھیں۔ شجاع کو عمر اپنے ساتھ لیے چل بھی رہا تھا اور بول بھی رہا تھا۔ اس کی بات سن کر شجاع نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

"اگر حکیم صاحب اپنے بیٹے اور بھتیجی کا نکاح کر رہے ہیں تو ہماری تمہاری مداخلت سے کیا وہ باز آ جائیں گے؟ وہ ہمیں سنا دیں گے کہ کیوں ان کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑا رہے ہیں۔"

"وہ دیکھو اس لڑکے کو، کیا یہ نکاح کے قابل ہے؟ اس بدنصیب لڑکی کی زندگی برباد ہو گی اور کچھ نہیں۔"

عمر نے سامنے اشارہ کیا جہاں حکیم صاحب کا بیٹا ہوا میں دائرے بناتا چلا جا رہا تھا۔

"وہ لڑکی بھی غالباً ان کی بھتیجی نہیں ہے۔" عمر نے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" شجاع اس انکشاف پر چونک گیا۔

"وہ جو فاطمہ بوا ہیں نا مراد آباد کی بڑی بی، وہ آئی تھیں میرے پاس، کہہ رہی تھیں کہ وہ لڑکی ان سے مدد مانگ رہی تھی میں نے بوا کو بلایا ہے تم خود ان سے پوچھ لینا۔ میں خواہ مخواہ ہی کسی کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑا رہا۔" عمر نے اپنی صفائی پیش کی۔

تھوڑی دیر بعد فاطمہ بوا اپنی سفید چادر سنبھالے وہاں آ گئیں اور شجاع کے کچھ دریافت کرنے سے پہلے ہی شروع ہو گئیں۔

"ارے میاں! مجھے تو کئی روز سے کھٹکا تھا کہ حکیم صاحب کے گھرانے میں ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اپنی بھتیجی کہوے ہیں اس لونڈیا کو اور جب دیکھو چیل کی طرح چوکنا، مرغی کی طرح اپنے پروں میں چھپا کر رکھیں۔ نہ وہ کسی سے بول سکے، نہ بات کر سکے، چپ چاپ چکنی مٹی کی سی مورت نظر آوے، جب غور سے دیکھو، آنکھیں گلابی، پلکیں گیلی جیسے دوئی ہو، ایک روز موقع پا کر میں نے لڑکی کو جا لیا، ذرا پیار سے پوچھا، وہ تو پھوٹ پھوٹ کر رو دی، کہوے تھی، بوا ہمیں بچا لو، اس دیوانے سے ہمارا بیاہ کر رہے ہیں یہ لوگ۔" بوا نے ذرا ٹھہر کر سانس لی جیسے دوبارہ رو پڑی ہوں۔

"سگی بھتیجی نا ہے، وہ مجھے بتا رہی تھی کہ حکیم جی کی بیوی آ گئیں۔ لونڈیا کو اپنی غضب ناک نگاہوں سے یوں گھورا کہ وہ تو بالکل گونگی ہو گئی۔

ارے میں کہتی ہوں، کوئی بچانے والا ہے اس معصوم چڑیا سی جان کو یا نہیں، کیا ہمارے پاکستان میں اب یہ ظلم ہو گا بے گناہوں پہ؟" بوا کی جذباتی تقریر پہ عمر نے تسلی کا ڈھکن لگایا۔

"ہم کل آ کر حکیم جی سے بات کرتے ہیں بوا! آپ فکر مت کریں۔"

"ہاں بیٹا! ارے جت کچھ کرو، ہمیں تو سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہے ہیں۔" بوا اپنی چادر سنبھالتی رخصت ہوئیں۔

اگلے روز عمر اور شجاع سمیت پانچ معززین کا وفد حکیم صاحب سے ملنے گیا۔ فاطمہ بوا اور ان کے شوہر بھی آ گئے۔

مولانا برکت اللہ نے بات کا آغاز کیا اور معقول انداز میں اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

حکیم جی سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔

"کون...... کہتا ہے کہ میرا بیٹا پاگل ہے؟ بس ذرا دماغی خلل ہے۔ علاج چل رہا ہے اس کا شادی کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اے لو، پاگل، دیوانے بھی کبھی ٹھیک ہوئے ہیں؟ وہ تو لونڈیا کو بھی سودائی کر دے گا۔" بوا نے مداخلت کی۔

"آپ مہربانی کر کے خاموش رہیں، آپ کو کوئی حق نہیں ہمارے گھریلو معاملے میں ٹانگ اڑانے کا۔" حکیم جی کی بیگم نے خشمگیں نگاہوں اور سخت انداز سے لفظوں کے کوڑے برسائے۔

"گھریلو معاملہ تب ہوتا جب وہ تمہاری سگی بھتیجی ہوتی، بلاؤ ذرا لونڈیا کو وہ بتائے سب کے سامنے، تمہاری سگی ہے یا نہیں؟" فاطمہ بوا خم ٹھوک کر میدان میں اتری تھیں۔

ایک لمحے کو حکیم جی کا رنگ متغیر ہوا مگر وہ دوبارہ شیر بن گئے۔

"ہاں ہاں بلا کے پوچھ لو، ہماری سگی ہے یا سوتیلی؟"

حکیم جی کی بیگم اپنی سخت گیر آنکھوں ور مہر النساء کے ہمراہ آن موجود ہوئیں۔ مہر النساء نے اپنا آپ چہرے سمیت چادر میں چھپایا ہوا تھا فقط آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن سے بے پناہ خوف و ہراس اور وحشت جھلک رہی تھی۔

"بیٹی! بغیر کسی جبر اور ڈر خوف کے سچ سچ بتاؤ، تم ان کی سگی بھتیجی ہو؟" مولوی برکت اللہ نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

مہر النساء کی گھائل غزال سی نگاہیں حکیم جی کی بیگم کی خشونت بھری نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں، وہ خاموش رہی۔

"جلدی سے بتاؤ بی بی! اور ان کی تسلی کرو جو چغل خور اور جاہل عورتوں کی باتوں میں آ کر شریف گھرانوں پہ تہمتیں لگاتے ہیں۔" حکیم جی پھر دھاڑے، مہر النساء پھر بھی چپ رہی۔

"انسانوں سے نہ ڈرنا بیٹی! بس اللہ سے ڈرو اور سچ بولو وہ مالک ہے، مسبب الاسباب ہے، کوئی نہ کوئی سبیل نکالے گا تمہارے لیے۔"

فاطمہ بوا نے زوجہ حکیم کے طنز کا جواب کسی اور وقت پہ ادھار کیا اور مہر النساء سے مخاطب ہوئیں، جس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں اور اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ آپ کے سگے رشتے دار نہیں؟" مولوی برکت اللہ نے تصدیق چاہی مہر النساء نے پھر نفی میں گردن ہلائی۔

حکیم جی کے چہرے پہ ذلت کی سیاہی بکھر گئی۔

"آپ کے پاس کوئی جواب ہے اس انکار کا؟" عمر کے سوال پہ وہ بری طرح بیٹھ گئے۔

"جواب تو ایسا ہے میرے پاس کہ تم سب بغلیں جھانکتے رہ جاؤ گے۔" انہوں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"سچ سننا ہے تو میرا سنو۔ یہ قطامہ ہمیں بے ہوش ملی تھی۔ خدا جانے کتنوں نے خراب کیا تھا۔ دو، چار یا چھ، میں نے علاج کیا، میری زوجہ نے دن رات اس کی خدمت کی دیکھ بھال کی، اسے کلیجے سے

لگیا۔ ہم تو پھر بھی اپنے بیٹے کے ساتھ جوڑ کرا رہے ہیں اور بھرم دے رہے ہیں ورنہ کیڑوں بھرے پھل کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ کچرے میں پھینک دیتے ہیں۔ ہماری نیکی کا یہ صلہ ملا ہے؟ جاؤ لے جاؤ تم لوگ۔ دیکھتا ہوں کون اپنی عزت بناتا ہے، کس میں اتنا جگرا ہے؟"

حکیم جی کی پاٹ دار آواز گونج رہی تھی اور سننے والے سکتے میں تھے۔

"اب تمہاری بولتی کیوں بند ہو گئی بوا؟ جاؤ بیٹے بیاہ دو اس داغ لگی جان کو۔" حکیم جی کی توپوں کا رخ بوا کی طرف ہوا وہ تلملا گئیں۔

"اوئی میرا بیٹا بال بچوں والا، اس کے باپ کی عمر کا، میں کیوں بچی کی زندگی خراب کروں، ہاں اس کے جوڑ کا کوئی لڑکا ہوتا تو بسم اللہ، میں پس و پیش نہ کرتی۔ ارے بے شمار لڑکیوں، عورتوں پہ قیامت گزر گئی۔ ہم سینے سے لگانے کے بجائے کیا اور قہر ڈھائیں ان پہ!" بوا آب دیدہ ہو گئیں۔

"مولوی صاحب آپ بسم اللہ کریں اور اس نیکی کا ثواب کمائیں آپ کے بیوی بچے ہیں تو کیا ہوا، شرع میں تو چار جائز ہیں۔" بہت ہی کائیاں حکیم جی بھگو بھگو کر جوتے مار رہے تھے اور مولوی صاحب کا جواب سنے بغیر شجاع اور عمر کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیوں میاں! تم تو چھڑے چھانٹ ہو کر لو نیکی اور لے لو ثواب۔"

"میرا تو رشتہ طے ہے خالہ کے گھر۔" عمر اک دم گڑبڑا گیا۔

شجاع بڑے صبر اور خاموشی سے حکیم جی کی ہرزہ سرائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ مہر النساء پہ ڈالی چادر میں لپٹا اس کا وجود سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ بہتے ہوئے آنسوؤں میں اس کی بے بسی اور بے کسی کی داستان پوشیدہ تھی۔ حکیم جی کے چہرے سے جھلکتی فرعونیت ان کے چہرے کو مزید کریہہ بنا رہی تھی۔

اللہ کو مخاطب کیا۔

"اگر آپ ہمارا نکاح پڑھا دیں تو ٹھیک ہے ورنہ قاضی صاحب کا بندوبست کر دیں، چھ ٹکٹ ہیں میرے پاس، دوپہر کی ٹرین سے کراچی روانگی ہے میری طرف سے ابوالحسن اور ان کا گھرانہ اس نکاح میں شریک ہوں گے۔"

عمر نے شجاع کا بازو پکڑا اور زور دار سے کہا۔

"جذباتی ہو کر فیصلہ مت کرو شجاع بھائی! لڑکیوں کی پناہ گاہ ہے شہر میں ہم وہاں بھیج سکتے ہیں اسے، ایسی بہت ہیں، کس کس کے زخموں پہ مرہم رکھیں گے؟ کل کو اپنا یہ فیصلہ آپ کو ہی ناگوار محسوس ہوا تو؟ سہارا دے کر چھوڑ دینا، اس سے بھی بڑا ظلم ہوگا، جو اس پہ ہوا ہے۔" عمر کا جواز معقول تھا مگر شجاع قائل نہ ہوا۔

"میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں عمر! جو فیصلہ کیا ہے اسے نبھاؤں گا۔" شجاع کے چہرے پہ یقین بکھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

بیاہ کیا تھا بس جیسے گڈے گڑیا کا سا کھیل، کانچ کی چینڈی گل خیرے کا پھول، کہو میاں گڈے، گڑیا قبول؟

نکاح ہو گیا تھا اور ٹرین کی روانگی کا وقت بھی۔

وہ عمر کے سامنے والی برتھ پر ابوالحسن کی والدہ کے ساتھ بیٹھی تھی، جس کا نام نکاح کے وقت شجاع کو معلوم ہوا تھا۔ مہر النساء سادہ سا جوڑا اور سفید چادر پہنے جس کے سر پر ابوالحسن کی والدہ نے گلابی کرن لگا دوپٹا ڈال دیا تھا۔ جو گھونگھٹ کی طرح اس کا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ ان ہی بھلی خاتون نے یا فاطمہ بوا نے مہندی اور چوڑیوں کا بندوبست بھی کر دیا۔

ریل کی سیٹی کب کی بج چکی تھی۔ ٹرین رینگتے رینگتے تیز رفتار ہو چکی تھی۔ چھک چھک اپنا سفر طے کرتی ریل میں بیٹھے شجاع کا دل عجیب ہو رہا تھا ایک نیا سفر درپیش تھا۔ زندگی کا سفر نیا ہم سفر، اس نے کبھی

پذیر ہوگا مگر پے در پے تقدیر نے وہ معاملات اور واقعات دکھائیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آئے تھے۔

"اور اب یہ ......" شجاع نے گلابی گھونگھٹ کی زرتار کرن کو ایک نظر دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جہاں کبھی نئے، کبھی پرانے جانے پہچانے سے مناظر گزرتے جا رہے تھے۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی آگے سفر کر رہی تھی، زندگی کی طرح۔

☆☆☆

نیا شہر کراچی جو ابھی عمارتوں اور انسانوں کا جنگل نہیں بنا تھا۔ سادہ دل اور مہمان نواز دیہاتی کی طرح دونوں بانہیں پھیلائے انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

ابوالحسن کے ماموں نے شجاع کی نوکری ایک اسکول میں لگوا دی تھی۔ شاہرہ فیصل تھا کرائے تو ہاں تھی، وہ جلد از جلد اپنا مکان حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ابوالحسن کے ماموں اگرچہ ایک بہت مہربان انسان تھے مگر کب تک ان کے زیر بار رہتا، جتنا احسان انہوں نے کیا تھا وہ بھی بہت تھا اپنا مکان خریدنا تو فی الحال ممکن نہیں تھا۔

وہ کرائے کے مکان کی تلاش میں تھا۔ اسی تگ و دو میں ایک روز ابوالحسن نے اسے ترغیب دی کہ وہ حویلی کا کلیم جمع کرا کر اس کے بدلے یہاں پراپرٹی حاصل کر لے۔

"ہم وہاں رہتے ضرور تھے مگر وہ حویلی نہ میری ملکیت تھی نہ میرے والد یا بھائی کی، میں اس کی ملکیت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں۔" شجاع نے حیرت سے ابوالحسن کی طرف دیکھا۔

"کر سکتے ہو کیونکہ بہت سے لوگ ہیں جو اس طرح کے جھوٹے کلیم داخل کر کے یہاں بڑی بڑی جائیدادیں حاصل کر رہے ہیں تمہارا دعویٰ پھر بھی کسی حد تک سچا ہوگا۔ حویلی تمہاری ملکیت تھی یا نہیں مگر تمہاری رہائش تو تھی وہاں۔" ابوالحسن نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"دوست، ابھی تو پاکستان کی بنیادوں میں ڈالا جانے والا لہو بالکل تازہ ہے، اس میں بے ایمانی کا تیزاب کیسے ملا دوں؟" غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

آنے والے دنوں میں شجاعت کے لیے دو اچھی خبریں تھیں، اسے نسبتاً بہتر نوکری مل گئی تھی، مشاہرہ معقول تھا کرائے کا گھر بھی مل گیا تھا، یہ بندر روڈ پر واقع ایک فلیٹ تھا، دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ، یہاں سے ملازمت کی جگہ بھی قریب تھی۔

اپنی مخصوص ٹن ٹن ٹن کے ساتھ سرخ رنگ کی ٹرام پٹری پہ دوڑتی ہوئی آ رہی تھی، جیسے ہی قریب آئی، شجاع سوار ہو گیا۔ مسافروں سے بھری ٹرام میں خوش قسمتی سے اسے بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ ابھی ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایک بہت مانوس آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور وہ ساکت رہ گیا۔ اس کا نام پکارنے والے کی آواز میں حیرت، خوشی اور ایک انجانی سی کسک تھی۔

"رضا ماموں؟" شجاع نے کھچڑی بالوں والے رضا ماموں کو یوں دیکھا جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

قریبی نشست میں بیٹھے دونوں ایک دوسرے کو اپنی داستان سنا رہے تھے۔

وہ کوئی اور بدقسمت ٹرین ہوگی جس کے بارے بتایا گیا۔ ہماری ٹرین سندھ کے راستے سے کھوکھرا پار (میرپور خاص) آئی تھی۔ وہاں سے ہم کراچی آ گئے۔ تمہارے ملنے کی آس تھی کہ شاید تم کراچی آ جاؤ۔ جمشید روڈ، مارٹن کوارٹرز۔

جہاں جہاں مہاجرین کے کیمپ اور جھونپڑیاں ہیں۔ ہر ہفتے جا کر دیکھتا رہتا ہوں کہ شاید تم آ گئے ہو۔" رضا ماموں کے چہرے پر تھکن کے ساتھ خوشی کی انوکھی چمک تھی۔

"باقی سب کیسے ہیں؟" شجاع نے ہولے سے سوال کیا۔

"سب ٹھیک ہیں۔ احسن میاں اور جہاں آرا کا بیاہ کر دیا ہے۔ ہم نے۔ رخشندہ کو تمہارے آنے کا یقین تھا۔ شکر ہے کہ تم مل گئے۔ چلو میں تمہیں گھر لے کر چلتا ہوں۔"

"ماموں! پہلے آپ میرے گھر چلیں۔ میں کل آجاؤں گا۔" شجاع نے دھیرے سے کہا۔

"تمہارے گھر بھی آئیں گے میاں جم جم آئیں گے۔ سب کو لے کر آؤں گا میں۔" رضا ماموں کے لہجے میں بڑی کھنک تھی۔

"گھر قریب ہے ماموں!" شجاع کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات تھے۔ رضا ماموں نے اپنی دھن میں دھیان نہیں دیا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ پرندے اپنی اپنی بولیاں سنانے درختوں کی شاخوں پر اتر آئے تھے۔ گھنے، سایہ دار درخت، پھل دار درخت سڑک کنارے گلیوں کے اطراف میں بکثرت موجود تھے۔ اپنی باتیں کرتے کرتے پرندوں کی چہچہاہٹ کے ہمراہ شجاع اپنے فلیٹ پہنچ گیا۔ دروازہ مہرالنساء نے کھولا تھا۔

"یہ کون ہے؟" رضا ماموں نے ٹھٹک کر شجاع کا چہرہ دیکھا جس پر وہ کہانی رقم تھی جو کچھ دیر بعد انہوں نے شجاع کی زبانی سنی۔

"تو کاتب تقدیر نے یہ داستان اسی طرح لکھی تھی جس طرح وقوع پذیر ہوئی۔" کمرے میں چھائے سناٹے کو رضا ماموں کی افسردہ آواز نے توڑا۔

مہرالنساء کھانا تیار کر رہی تھی۔ شجاع اور رضا ماموں کمرے میں بیٹھے تھے جہاں دونوں کی آوازوں اور باتوں کے درمیان گاہے گاہے خاموشی کا کہر چھا جاتا۔

دسترخوان پر آلو گوشت کا سالن اور چپاتیاں تھیں گڑ میں پکی سویاں، ہر شے میں ذائقہ بھی تھا اور مکینوں کے خلوص و محبت کی مہک بھی۔

رضا ماموں اپنا پتہ دے کر رخصت ہوئے۔ اور شجاع کے جاگنے اور سوچنے کے لیے ایک لمبی سیاہ رات چھوڑ گئے۔

مہرالنساء نے لالٹین کی لو بڑھا دی تھی۔ شجاع آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا سوچتا رہا۔ معمولی سی روشنی بھی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور ویسے آنکھوں میں تو نہ جانے کیا کیا چبھ رہا تھا؟

☆☆☆

اگلی شام جو بڑی ملگجی، سرمئی اور مٹیالی سی تھی شجاع اس گھر کے آنگن میں کھڑا تھا۔ جہاں نیم کا گھنا درخت تھا۔ امرود اور جامن کے پیڑ بھی تھے۔ جن پر پنچھی شور مچا رہے تھے۔ وہ سب جنہیں اپنی دانست میں شجاعت کھو چکا تھا۔ وہاں موجود تھے۔ برستی آنکھوں کے ساتھ، سب ملے تو اگلے پچھلے تمام دکھوں کی روشنی یکا یک بڑھ گئی۔

گوہر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ برآمدہ عبور کر کے ایک درمیانہ کمرہ، جس کی کھلی کھڑکی سے اداس شام جھانک رہی تھی۔ اسی کھڑکی کے ساتھ لگ کر رخشندہ کھڑی تھی ایسے لٹے پٹے، تھکے ماندے مسافر کی طرح جو اپنا سارا زادراہ کھو بیٹھا ہو اور آگے سفر کے لیے لق و دق صحرا موجود ہو۔

شجاع کی آنکھیں نیچے فرش کی درازیں کھوج رہی تھیں، رخشندہ پہ دوبارہ نگاہ ڈالنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ جبھی دو قدم آگے بڑھ آئی تھی۔

"تم اتنے خود غرض، اتنے ظالم کیسے ہو سکتے ہو؟" اس کی آواز کی بے یقینی نگاہوں کی کاٹ اور لفظوں کی برچھی زخم بن کر شجاع کے دل پہ لگے تھے وہ تڑپ گیا۔

انا نیوں کے لئے قافلے دیکھ کر آیا تھا دل کا لٹا قافلہ دیکھنا باقی تھا۔ سو وہ بھی دیکھ لیا۔

گردش دوراں نے راستے تبدیل کر دیے تھے۔ سفر بھی اور ہم سفر بھی۔ اب اسے قبول کرنے میں ہی نجات تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر شجاع نے یہ سب نہیں کہا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رخشندہ نہ سمجھے گی اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کرے گی۔

"تم اپنی ساری بھڑاس نکال لو، جو سزا دینی ہے دے دو، مجھے ہر سزا قبول ہے۔" شجاع نے اپنی ہی آواز سنی، اجنبی سی آواز۔

"بہت جلدی قبول کر لیتے ہو سب کچھ، جرم بھی، سزا بھی نئے حالات، مقام اور افراد بھی؟" رخشی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں آنسوؤں کے سمندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔

"میں تمہارے سامنے آنے کے لائق نہیں تھا۔ اتنی ہمت بس اس لیے کر پایا کہ تم سے کہہ سکوں، ایک لاحاصل انتظار میں خود کو ضائع مت کرو۔"

"انتظار رائیگاں ہوتا ہے اور محبت؟ کیا وہ بھی رائیگاں ہوگئی؟"

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ آگ و خون کے سمندر پار کرنے میں محبت کیسے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ ڈوب جاتی ہے۔" شجاع کے چہرے پر بے بسی رقم تھی۔ رخشندہ کی آنکھیں اس کا چہرہ اور تمام وجود ڈوبتا سورج بنا ہوئے تھے۔ جس کے بعد رات یقینی ہوتی ہے۔ سیاہ، طویل، اندھیری رات جس کی سحر کا کچھ پتہ نہ ہو۔

"رضا ماموں نے بتایا تو ہوگا کہ میں......" اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے شجاع کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"اقرار جرم کرنے سے اور صفائیاں پیش کرنے سے مقتول زندہ نہیں ہو جاتے۔" رخشندہ کی آواز لرز گئی۔ اس نے رخ موڑ لیا۔

"جاؤ، تمہیں نئی زندگی مبارک ہو اور ہمیں اپنی موت۔"

"رخشندہ!" شجاع بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا۔

"چلے جاؤ، ورنہ ہم یا تو تمہاری جان لے لیں گے یا اپنی۔" رخشندہ کی بھنچی ہوئی آواز میں وحشت تھی۔

سب روکتے ہی رہ گئے۔ شجاع سے اس صحن میں نیم تلے بچھی کرسیوں اور پلنگ پر بیٹھا نہ گیا۔ جہاں سے وہ کھڑکی نظر آرہی تھی۔ اس ہوا میں سانس لینا بھی گناہ لگ رہا تھا۔ جہاں چند قدموں کے فاصلے پر وہ موجود تھی۔

"میں پھر آجاؤں گا ماموں! اس وقت مجھے جانے دیں خدا کے لیے۔" شجاع کی آنکھوں میں درد کی تحریر دیکھ کر ماموں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

"خوش رہو میاں!" دروازے تک اسے رخصت کرنے آئے تو اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"ہم رخشندہ کو سمجھائیں گے۔ تم پریشان نہ ہونا۔" ماموں نے اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔

اسے نہیں معلوم کہ وہ گھر کیسے آیا۔ اور کیسے الٹا سیدھا کمرے میں بچھے تخت پر پڑ گیا۔

"کھانا تیار ہے۔" مہرالنساء نے یوں خلاف معمول اس وقت شجاع کو لیٹے دیکھا تو حیران ہوئی۔

"بھوک نہیں ہے۔" شجاع نے بھاری لہجے میں بولتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔ جیسے کھلی آنکھوں سے جھانکتی رخشندہ کی تصویر کو مہرالنساء دیکھ ہی لے گی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ سرد سی میں بولتی ہوئی مہرالنساء اپنے بے ڈول سراپے کو سنبھالتی ہوئی آگے آئی۔ اگلے ماہ وہ ماں بننے والی تھی۔ ہر گزرتا دن اسے مزید بوجھل اور بے ڈول بنا رہا تھا۔

"ہمارا سر دبا دوگی؟"

"کیوں نہیں۔" مہرالنساء نے سرہانے بیٹھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ کبوتر کے پروں جیسے نرم سپید ہاتھ، جس میں گرمائی بھی تھی اور شاید مسیحائی بھی اندر ہی اندر جلتے بھنتے شجاع پر گویا ٹھنڈا پانی پڑ رہا تھا۔

"ایک بات بتاؤ گی؟"

"جی۔"

"کیا ہم ظالم ہیں۔ خود غرض ہیں بہت برے ہیں؟"

"آپ؟" مہرالنساء کی آنکھیں اور منہ بے یقینی کے عالم میں کھل گئے۔ جیسے کوئی آب حیات کو کہہ دے کر یہ موت کا چشمہ ہے، یا روشن سورج کو

اندھیری، سیاہ رات بنا دے۔

"آپ تو......" مہرالنساء نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور انتہائی عقیدت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے لگایا۔

"آپ تو فرشتہ ہیں۔"

مہرالنساء کے انداز اور لفظوں میں سچائی اور سادگی تھی۔ شجاع کو یہ جاننا مشکل لگ رہا تھا کہ اس نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے؟

☆☆☆

کالی گھٹاؤں نے اُمڈ کر یکایک ہی زمین و آسمان دونوں کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں سمیٹ لیا تھا۔ موٹی موٹی بوندوں نے پیاسی دھرتی کی سیرابی کے لیے زمین کا رخ کیا۔ ذرا سی دیر میں سب جل تھل ہو گیا۔ ایک سیاہ چادر تھی جو فضا میں تنی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ جاری تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ کمرے میں بیٹھی مدحت نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، شجاع اور رضا ماموں بے اختیار ایک ساتھ مسکرائے۔

باورچی خانے سے پکوڑے تلنے کی خوشبو آ رہی تھی۔

"لو بھئی، دلہن بیگم نے ساون کا کڑھاؤ چڑھا دیا۔" رضا ماموں نے تبصرہ کیا۔

دوسرے کمرے میں موجود عباد نے ریڈیو چلا دیا تھا جہاں سے ساون کے گیت نشر ہو رہے تھے۔

اماں میرے باوا کو بھیجو دی، کہ ساون آیا۔

"شجاع میاں! تمہاری بیٹیا کیسی ہیں؟ ساون کے جھولے جھولنے کے بجائے کمرے کے اندر کانوں میں انگلیاں دیے بیٹھی ہیں۔"

"دادا جان! ہمیں بجلی کڑکنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"ارے بھئی یہ روشنی تو اللہ میاں، ہم لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔ تاکہ دیکھ لیں کہ پانی ٹخنوں تک ہے یا ٹخنوں تک؟"

"مدحت! ذرا یہاں آئیں گی آپ؟" باورچی خانے سے ماں نے آواز دی۔

"جی آ رہی ہوں۔" مدحت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماموں، شکار پر چلیے گا اگلے ہفتے؟"

"کیا وقت آ گیا ہے شیر، چیتا، ہاتھی، نیل گائے اور ہرن کے شکار سے اب مچھلی کے شکار پر آ گئے ہم۔"

"یہ بھی غنیمت ہے، کون جانے کل کو یہ بھی نہ ہو۔" شجاع کے لہجے میں اب تک کی عمر کا تجربہ اور مشاہدہ بول رہا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، وقت کی ریت ہاتھوں سے پھسل رہی ہے۔ کیا خبر آگے کیا ہو کیا نہ ہو۔" رضا ماموں کی بوڑھی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرائے۔

"افوہ، یہ دیکھیے، یہ تو میں بھول ہی گیا۔" شجاع کو اچانک کچھ یاد آیا وہ لپک کر اندر گئے واپس آئے تو ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی عطر کی شیشیاں تھیں۔

"آپ کے لیے حنا کا عطر لائے تھے۔" شجاع نے عطر ان کی جانب بڑھایا۔ رضا ماموں عطر کے شوقین تھے، موتیا اور خس بھی پسند کرتے تھے۔ اتری گرمیوں میں حنا کا عطر استعمال کرتے تھے۔ شجاع اکثر ان کے لیے یہ تحفہ لے آتے تھے۔

"پکوڑے اور میٹھے پوڑے نوش فرمائیے۔" مدیحہ نے میٹھے نمکین پکوان دسترخوان پہ سجائے۔ لگن میں آم بھی بھگوئے ہوئے تھے، عباس، قیص اور سعادت بھی آ کر دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے شجاع نے ریڈیو کی آواز بلند کی، خبروں کا وقت ہو گیا تھا۔

"حالات ٹھیک ہوتے نظر نہیں آ رہے۔" خبریں ختم ہوئیں تو ماموں نے تبصرہ کیا۔

"کل بائیس برس ہوئے ہیں پاکستان بنے، اور کیا کیا دیکھ لیا۔ ان آنکھوں نے، دو جنگیں غیر مستحکم سیاسی حالات، سیاست دانوں کی بازی گری، عوام و خواص کے جھوٹے کلیم داخل کر کے بڑی بڑی جائیدادیں، فیکٹریاں، کارخانے بنانے کے جتن

اگرچہ یہ اقلیت میں تھے، عوام کی اکثریت سادہ لوح مخلص اور ایماندار تھی۔

"رشید میاں لندن جا رہے ہیں۔" رضا ماموں نے تیسری بار بتایا تھا۔

"جی ماموں، آپ نے ذکر کیا تھا۔"

"کہہ رہے تھے کہ یہاں کیا رکھا ہے؟" ماموں اپنی دھن میں بولتے رہے۔

"پتہ جما کر محنت نہیں ہوتی، راتوں رات امیر بننا چاہتے ہیں صاحب زادے اسی لیے اب تک کچھ نہیں بن پائے۔

جو بیج بویا جاتا ہے وہی پھل ملتا ہے۔ نیت اور محنت میں کھوٹ ہو تو فصل کیسے اچھی ہو گی؟"

بارش تھمی تو وہ کمرے سے باہر آ گئے۔ چند سال پہلے انہوں نے یہ نیا گھر بنوایا تھا۔ چھوٹے سے لان میں سب سے پہلے مولسری کا پیڑ لگایا تھا اور بار سنگھار کا بھی، امرود، جامن اور پپیتا بھی لان میں عام تھے۔

شجاع برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گئے۔

درختوں کے پتوں سے ابھی پانی ٹپک رہا تھا۔

ماضی کے دامن سے کچھ اور نہیں لے سکے مگر پیڑ پودے ضرور سمیٹ لیے، انسان کے خمیر میں شاید باوا آدم سے ودیعت ہوا ہے، وہ ایک جنت سے نکلتا ہے تو اپنے لیے دوسری جنت کی تلاش یا تعمیر میں منہمک ہو جاتا ہے۔

شجاع نے ناظم آباد میں یہ جو پلاٹ خریدا تھا۔ اس میں اس کی ان تھک محنت بھی تھی اور مہرالنساء کی سلیقہ مندی و کفایت شعاری بھی تھی، پلاٹ پہ گھر بنوایا تو سب سے پہلے مولسری کا پیڑ لگایا تھا۔ رضا ماموں آرام کی غرض سے تھوڑی دیر لیٹ گئے تھے۔ وہ گاہے گاہے آتے رہتے تھے۔ ان کے ذریعے سب کی خیر خبر اور خیریت مل جاتی تھی۔ احسن اور جہاں آرا اپنے پانچ بچوں کے ساتھ خوش و خرم تھے۔ رشید لندن جا رہا تھا اور رخشندہ کے بیاہ کو بھی کئی برس گزر چکے تھے۔

شجاع کے ذہن کے افق پر کوئی اور ساون چھایا تھا جہاں لڑکیاں بالیاں آم کے درختوں پہ موٹی موٹی ٹہنیوں میں جھولا تیز جھلاتے ہوئے رنگوں کے دوپٹوں اور پیراہنوں کی بہار تھی۔ میٹھے، نمکین مہکتے ہوئے پکوانوں سے سجے دسترخوان، برف لگے ٹھنڈے، شیریں آم ان کی مٹھاس اور خوشبو، آج بھی ذہن اور زبان کی تمام حسیات میں زندہ تھی، زمین کے افق پر ایک دھانی آنچل لہرایا۔

شجاع نے غیر ارادی طور پر اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ زخم کب کا بھر چکا تھا بس ایک داغ سا رہ گیا تھا جو گھنگھور کالی گھٹاؤں اور برسات کی بھیگی راتوں میں چودھویں کا چاند بن کر چمک اٹھتا تھا۔

"ابو جی!" مدحت نے آ کر ان کا ارتکاز توڑا وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

"جی بیٹا؟" تین بیٹوں کے بعد مدحت سب سے چھوٹی، اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔

"ہماری سب سہیلیوں کے گھر ٹی وی آ گیا۔ ہمارے گھر کب آئے گا؟" مدحت نے کئی بار کی اپنی فرمائش پھر دہرائی۔

"آ جائے گا بیٹی! اس بار بونس ملے گا تو سب سے پہلے ٹی وی لے کر آئیں گے۔"

"پہلے ریڈیو چاہیے تھا۔ وہ آ گیا، اب ٹی وی چاہیے کل کو کوئی اور چیز چاہیے ہو گی" مہرالنساء نے برآمدے میں آتے ہوئے بیٹی کی فرمائش سن لی تھی، حسب عادت اسے ڈانٹا، شجاع تو بیٹی کے معاملے میں بالکل موم تھے۔ ماں تھوڑی سختی کرتی تھیں۔

"امی جی!" مدحت نے احتجاجاً واک آؤٹ کیا۔

"آپ نے بہت سر پہ چڑھایا ہوا ہے بیٹی کو، پرایا دھن ہے، کچھ تو کھینچ کر رکھیں، لڑکی ذات کی ہر ضد پوری کرنا اچھا نہیں ہوتا اب یہ ٹی وی کیا بلا ہے؟ خدا جانے کیا کیا نئی چیزیں آ رہی ہیں، بچوں کو بگاڑنے والی۔"

مہرالنساء غصے سے بولتی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"زمانہ کروٹیں بدلتا رہے گا۔ تبدیلیاں آتی

رہے گی۔ ہر نئی نسل پچھلی نسل سے تھوڑی مختلف اور ذرا آگے ہوتی ہے۔ اچھا برا سمجھاؤ لیکن زبردستی اور سختی کرنے سے معاملات بگڑتے ہیں۔" شجاع نے اپنے فطری تحمل اور بردباری کے ساتھ شریک حیات کو سمجھایا۔

"ریڈیو میں آواز ہی ہوتی ہے، ٹی وی میں تو تصویر بھی ہے خدا جانے کیا کیا دکھائیں اس میں؟" مہرالنساء کے لہجے میں تشویش تھی۔

شجاع بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرائے پھر بتانے لگے۔

"میں نے پہلی بار جب بھیا سے ریڈیو لانے کی ضد کی تو اماں نے خوب ڈانٹا، ان کا خیال تھا کہ اس آلے سے ہم یعنی نوجوان نسل بگڑ جائے گی۔ آج ہم ٹی وی کے لیے یہی سوچ رہے ہیں اور کون جانے ہماری تیسری نسل تک اور کون سا انقلاب آئے جس پر سب کو تشویش ہو؟"

☆☆☆

نہا کر وہ کپڑے پہن رہا تھا جب موبائل کی گھنٹی بجی تو بجتی ہی رہی۔ جلدی جلدی الٹے سیدھے کپڑے چڑھا کر باہر نکلا اور سب سے پہلے فون اٹینڈ کیا۔

"کہاں ہو تم؟ ایک گھنٹے سے ٹرائی کر رہی ہوں۔"

"اللہ کو مانو شانزے بی بی! فقط پانچ منٹ ہی سے بیل بج رہی تھی۔" ابراہیم نے کھینچ کر شرٹ سیدھی کی۔

"تم آ رہے ہو دادی جان سے ملنے؟"

"آج؟"

"نہیں اگلے سال۔" شانزے چڑ گئی۔

"بات یہ ہے شانو! آج میرے گرینڈ پیرنٹس کی پچاسویں اینیورسری ہے۔ وہ بھی گولڈن جوبلی، تو ہم سب آج اسے سیلی بریٹ کر رہے ہیں۔"

"سچ سچ پہیلی ہے یا بے وقوف بنا رہے ہو مجھے؟"

"ہماری حکومت اور اپوزیشن بھی ایک دوسرے پہ اتنا شک نہیں کرتی ہیں۔ جتنا تم مجھ غریب، معصوم جان پہ کرتی ہو۔" ابراہیم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھا کرنے لگا۔

"کیونکہ اس غریب اور معصوم جان نے پہلے اس پارٹی کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"تو مجھے تھوڑی معلوم تھا کہ پاکستان کے بعد اب دادا دادی کی بھی گولڈن جوبلی ہے، پھپھو نے بتایا تو بس ہم نے فٹافٹ ارینجمنٹ کر لی۔"

"دادی ناراض ہوں گی، وہ پہلے ہی کہہ رہی ہیں کہ لڑکا سنجیدہ بھی ہے یا یوں ہی کھیل مذاق کر رہا ہے؟"

"اب پتا چلا تمہارے اندر شک کرنے کے جراثیم کہاں سے آئے ہیں؟" ابراہیم کو آج ایک اہم راز کا علم ہوا۔

"فضول باتیں مت کرو، جب سے دادی جان نے تم سے ملنے کا کہا ہے۔ کبھی تمہیں بخار ہو جاتا ہے، کبھی کوئی فوت ہو جاتا ہے، کبھی کوئی گرینڈ پارٹی اچانک نکل آتی ہے۔" شانزے کی آواز سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"میری جان وشان، میں نے جھوٹ تو نہیں بولا تم سے۔ مجھے سچ مچ بخار ہی تھا، اس سے اگلی بار......"

"تم ٹو دی پوائنٹ بات کرو، صفائیاں مت پیش کرو۔" شانزے اکتا گئی۔

"نیکسٹ سنڈے ان شاء اللہ تعالیٰ بالکل پکا ہے میں ضرور آؤں گا۔ بلکہ دادا جان کو ساتھ لے آؤں گا۔ اخلاقی سپورٹ کے لیے۔"

"لے آنا، ویسے میری دادی تمہیں کھا نہیں جائیں گی۔"

"کیا خبر، تم سے بھی زیادہ شیرنی ہوں؟" ابراہیم شرارت سے باز نہ آئے۔

"تم آ تو ذرا، ہم نمٹ لیں گے تم سے۔"

"اچھا پیاری، مجھے اب اجازت دو، بیکری سے کیک بھی لانا ہے اور کچھ اور کام بھی ہیں۔"

"اگلا اتوار یاد رکھنا۔"

"میرے دل پہ نقش ہے یار......!" ابراہیم نے اپنا سیل فون آف کیا۔

☆☆☆

شجاع لاؤنج میں داخل ہوئے تو ٹھٹک گئے۔ تمام لاؤنج غباروں، رنگ برنگے ربن اور آرائشی چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ میز کے بیچوں بیچ قومی پرچم کے رنگوں کا کیک رکھا ہوا تھا جس پر 50 نمبر کی موم بتیاں لگی تھیں۔

"پچاس برس گزر گئے؟" شجاع صوفے پہ بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس تمام اہل خانہ مختلف سرگوشیوں یا خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اپنے اردگرد کے شور سے بے نیاز وہ اپنے خیالات میں گم تھے۔

وقت بھی کیسی عجیب اور حیرت انگیز شے ہے۔ کبھی یہی وقت تھا جو لگتا تھا کہ ٹھہر گیا ہے۔ منجمد ہو گیا ہے۔ گزارے نہیں گزرتا تھا اور آج یوں لگ رہا تھا کہ پر لگا کر گزر گیا۔

نصف صدی بیت گئی۔ اس سفر میں کیا کیا کھویا۔ کیا کیا پایا شجاع کی آنکھوں کے سامنے زندگی کی فلم کی ریل گزر رہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" مہرالنساء نے دھیرے سے ان کے بازو پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"گزرے وقت کو اور بچھڑے لوگوں کو۔" شجاع کی نگاہیں سامنے خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"نانو۔" ان کی سب سے چھوٹی نواسی فاطمہ آ کر گود میں چڑھ گئی۔

"نانو کی جان!" انہوں نے نواسی کا منہ چوما۔

"کیک کب کاٹیں گے؟"

بس، ابھی کاٹ لیتے ہیں چلیے۔

"مہرو آئیے۔" انہوں نے شریک حیات کو مخاطب کیا۔

"جی!" سفید اور سبز رنگ کے چکن کے جوڑے میں ملبوس مہرالنساء نے بالوں کو جوڑے کی شکل میں سمیٹا ہوا تھا۔ سفید موتیوں کی چھوٹی سی مالا اور ویسے ہی ٹاپس وہ بہت باوقار اور شان دار لگ رہی تھیں۔

"ایک منٹ ایک منٹ۔" ابراہیم نے آگے بڑھ کر انہیں روکا۔

"ایک فوٹو لے لوں میں آپ کا۔" اس نے کیمرہ سیدھا کیا اور تصویر کھینچنے لگا۔

"کتنے کیوٹ کپل لگ رہے ہیں آپ دونوں۔"

"آخر اماں، ابا کس کے ہیں۔" مدحت مسکرائیں۔

"اچھا؟" ابراہیم نے سوکھا سا منہ بنایا۔

"مجھے تو خوشی تھی کہ دادا جان اور دادی حضور مجھ پہ گئے ہیں۔"

شجاع اور مہرالنساء ایک ساتھ مسکرائے تھے اور ابراہیم نے وہ پل فوراً کیمرے میں قید کر لیا۔

اس رات ابراہیم نے دادا جان کو شانزے کے بارے میں بتایا تھا۔

"پلیز دادا آپ میرے ساتھ چلیں۔ پہلی بار جا رہا ہوں ان کے گھر، شانزے کی ہٹلر دادی نے ملنے کے لیے بلایا ہے بلکہ شاید میرے دانت، ناخن، سینگ اور دم وغیرہ چیک کریں گی۔" ابراہیم نے منہ بنایا۔

"بری بات، بزرگوں کو ایسے نہیں کہتے!" دادا جان نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوتے کو سرزنش کی۔ اور جب وہ ابراہیم کے ساتھ شانزے کے گھر گئے تو رخشندہ بیگم سے ملاقات نے ایک ایک کر کے ماضی کے سارے بند دروازے کھول دیے۔

☆☆☆

"اب کیا ہوگا دادا جی؟" ابراہیم نے گزرے وقتوں اور لوگوں کی ورق ورق داستان شجاع کی زبانی سنی اور بھونچکا رہ گیا۔

"زندگی کے رنگ ڈھنگ یوں بھی ہوتے ہیں؟"

"کیا رائے ہے تمہاری لیڈی ہٹلر کی؟" ابراہیم نے شانزے کو کال کی۔

"شٹ اپ ابراہیم!" شانزے کو اپنی پیاری دادی جان کی شان میں کی گئی گستاخی بالکل بھی نہیں بھائی۔

"ہٹلر کوئی اتنا برا نہیں تھا یار ایویں اسے اتنا بدنام کیا ہوا ہے۔"

"اگر تم کام کی بات نہیں کر سکتے تو فضول باتیں بھی مت کرو۔"

شانزے کا موڈ بے حد خراب تھا۔ دادی جان نے بالکل خاموشی اختیار کر کے بے حد سسپنس ڈالا ہوا تھا۔ اسے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ بس اتنا ہی علم ہوا تھا کہ ابراہیم کے دادا جان سے کوئی پرانی رشتے داری نکل آئی تھی۔

"یہ تو اچھی بات ہے کہ پہلے سے ہی رشتے داری نکل آئی۔" شانزے نے کہا۔

"ہاں بظاہر تو اچھی بات ہے مگر......" ابراہیم نے دل ہی دل میں جواب دیا۔ رشتے داری کے ساتھ ساتھ کچھ گڑے مردے بھی باہر نکل آئے ہیں۔

"اب کیا ہوا، چپ کیوں ہو۔ ویسے تو ہر بات کا جواب حاضر رہتا ہے۔ اب میں کچھ کہہ رہی ہوں تو گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھ گئے۔" شانزے مزید جھنجلائی۔

"میرے بولنے پر بھی اعتراض، چپ رہنے پر بھی غصہ، کہاں جاؤں میں؟" ابراہیم شہنشاہ جذبات بن گیا۔

"انکل نے کچھ بتایا نہیں تمہیں؟"

"انکل؟ کون دادا جان؟ نہیں کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں بتایا۔ بس یہی کہہ رہے تھے کہ انڈیا میں کوئی رشتے داری تھی۔ تمہارے آباؤ اجداد کے خاندان سے۔"

"پتا نہیں کیا مسٹری ہے، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"پریشان مت ہو، شانزے، میں ہوں نا۔" ابراہیم نے اسے پچکارا۔

"تم ہو نا، یہی تو پریشانی ہے۔"

"ہا آ...... آ......" ابراہیم نے ایک سرد آہ بھری۔ "محبت بڑی ظالم ہوتی ہے اور محبوب سب سے ستم گر، دل والے کہاں جائیں؟"

"اوٹ پٹانگ باتیں بہت ہوتی ہیں تمہارے پاس کرنے کے لیے مگر میری تسلی کے لیے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں۔"

"ڈھنگ کی بات یہ ہے شانزے علی خان، ہر ممکن کوشش کریں گے تمہیں کسی بھی ممکنہ دکھ اور غم سے بچانے کی۔ اب تم بے فکر ہو کر سو جاؤ، تمہاری ساری پریشانیاں میں نے گود لے لی ہیں۔" گمبھیرتا سے بولتا ہوا ابراہیم ایک بار پھر پٹری سے اتر گیا۔

"تم بس تم ہی ہو۔" شانزے کی بے اختیار ہنسی بڑی کھلکھلاتی ہوئی تھی۔ ابراہیم کے لفظوں کی لہریں شانزے کے سارے تفکرات بہا کر لے گئی تھیں۔

☆☆☆

شام کی چائے پی کر دوستوں کے ساتھ بیٹھک جمانے کے بعد عصر اور مغرب پڑھ کر بظاہر وہ اطمینان سے اب معمول کے مطابق لاؤنج میں صوفے پر براجمان تھے اور چھوٹے پوتے کے لاڈ اٹھا رہے تھے مگر سارے معمولات، اور مصروفیات کے دوران چہرے پہ ان کہی الجھنوں کی ایک تحریر تھی جو ہر کوئی تو نہیں پڑھ سکتا تھا مگر مہر النساء ان کے مزاج کے سارے موسموں سے واقف اور چہرے کے تمام رنگوں سے آشنا تھیں۔ ان سے یہ تحریر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

"کیا ہوا؟ شانزے کے گھر سے کوئی جواب نہیں ملا؟"

"فون آیا تھا، کل بلایا ہے مجھے۔" شجاع نے جواب دیا۔

"یہ تو اچھی بات ہے، جا کر دیکھیے، کیا کہتی ہیں وہ خاتون، ویسے آپ تو بتا رہے تھے کہ آپ کی کوئی رشتے داری نکلتی ہے ان سے؟"

"ذرا الگ مزاج کی خاتون ہیں، اسی لیے پریشان ہوں، کیا پتا، کیا جواب دیں؟"

"میرا خیال ہے کہ کچھ اچھا ہی ہوگا۔ ابراہیم ماشاءاللہ لائق فائق، سلجھے ہوئے نوجوان ہیں۔ انہیں ریجیکٹ کرنے کی کوئی وجہ بظاہر تو نظر نہیں آتی۔"

"اللہ آپ کا حسن گمان قائم رکھے۔" شجاع احمد زیر لب بولے۔

☆☆☆

اس بار وہ بالکل تنہا ہی گئے تھے۔ شانزے نے خوش آمدید کہہ کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس کے والد آفس میں تھے اور والدہ چند سال پہلے فوت ہو چکی تھیں۔ رخشندہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو شجاع احمد گہری سوچ میں گم تھے، آہٹ سن کر چونک پڑے اور سیدھے ہو گئے۔ ان کی فراخ پیشانی پر اب گھنگھریالے بالوں کے گچھے موجود نہیں تھے۔ گزرتے وقت نے چہرے، پیشانی، ہاتھوں پہ اور تمام وجود نے اپنے نقوش ثبت کیے تھے، مگر پھر بھی ان میں ایک وقار تھا۔ ان کے چاندی سر اور سونے کے دل نے انہیں اس عمر میں بھی شان دار بنایا ہوا تھا۔

"اتنے خوف زدہ اور ڈرے ہوئے کیوں لگ رہے ہیں شجاع احمد؟"

"ہمارے بچوں کے خواب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ان کے لیے شاید میں واقعی ڈر سا گیا تھا۔" شجاع احمد کی پیشانی پہ پریشانی کی سلوٹ نمایاں تھی۔

"بچوں کے خواب؟" رخشندہ بیگم نے ان کی بات دہرائی پھر مسکرا دیں۔ "کامیاب ہوں یا ناکام مگر ہر نسل خواب دیکھتی ہے یہ تسلسل خوابوں کا، کب سے چلا آ رہا ہے۔ اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ مگر اس میں دیواریں بھی بن جاتی ہیں۔"

"تقدیر آڑے آئے تو آئے مگر انسان کو کسی کے خوابوں کے بیچ دیوار نہیں بننا چاہیے۔" شجاع احمد کی بات پر دو مدہم سنہری آنکھیں ان پہ مرکوز ہوئیں۔

"آپ کا خیال ہے، ہم خود غرض اور منتقم مزاج ہیں؟" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئیں۔

"شاید، شاید ایسا بھی ہو جاتا۔ مگر شجاع احمد! ہمیں چاہا گیا، سراہا گیا۔ پلکوں پہ بٹھانے کی حد تک ہماری ناز برداری کی گئی۔ ایک اچھی زندگی اور شان دار ہم سفر، خود غرضی اور انتقام کے سارے اندھیرے دور کر دیتا ہے اور پھر شانزے ہمیں اتنی عزیز ہے کہ اس کی آنکھ میں آنسو تو کیا چہرے پہ ملال کا ہلکا سا سایہ بھی ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ تمہارا پوتا ویسے خاصا معقول نوجوان ہے، نہ بھی ہوتا تو شانزے کی خوشی کے لیے ہمیں قبول ہوتا۔"

رخشندہ بیگم مسکرائیں۔ اس مسکراہٹ میں ایک بہت مانوس سی جھلک تھی جو شجاع احمد کو دکھائی دی۔ ایک بے ساختہ مسکراہٹ نے ان کا احاطہ کیا۔ ایک بہت بڑا بوجھ تھا جو ان پر سے اتر گیا تھا۔

واپسی کا سفر بہت ہلکا اور آسودہ تھا۔ تمام عمر خود کو مجرم سمجھنے کی جو کسک اور چبھن ان کے ہمراہ رہی، آج اس سے بھی چھٹکارا مل گیا تھا۔

رخشندہ بیگم کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے ایک خوشیوں بھری، محبت کے ساتھ بھرپور زندگی گزاری ہے۔ شجاع احمد خوش تھے۔ مگر انہیں یہ کہاں معلوم تھا کہ عورت کے دل کے آسمان پر کتنی ہی محبتیں قریبی اور محترم رشتوں کی محبتیں، ستارے بن کر چمکتی ہیں مگر وہ جو پہلی محبت کا قطبی ستارہ ہوتا ہے وہ اپنی جگہ ہمیشہ قائم رہتا ہے نہ وہ دوسرے ستاروں کو ماند کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے ستارے اس کی چمک اور آب و تاب مدہم کرتے ہیں۔

رخشندہ بیگم نے سچ کہا تھا کہ انہیں چاہا گیا، سراہا گیا، سر آنکھوں اور پلکوں پہ بٹھایا گیا مگر ان کے دل کے آسمان پر جو ایک قطبی ستارہ تھا وہ آج بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ وہ ستارہ جو اپنی منزل مراد پر نہ پہنچا۔

☆☆

شازیہ الطاف ہاشمی



فرق

بینش عرف بنی کے ابا امیر نہیں تھے۔ بس اتنا تھا کہ شام کو گھر والوں کے لیے روٹی کا انتظام ہو جایا کرتا تھا بھلے روکھی سوکھی ہی کیوں نہ ہو، روٹی تو روٹی ہوتی ہے۔ صبح کبھی کبھی پراٹھے بن جاتے اور ساتھ آلو کا سالن، اس گاؤں میں آلو اتنے تھے جتنے نیلے آسمان پہ ستارے، بنی نے کئی بار گننے کی کوشش کی مگر ناکام ٹھہری۔ آلوؤں کا بھی شمار نہیں اور ستاروں کو گننا بھی ناممکن سی بات ہے، مٹی کے پیلے پیلے سونے جیسے آلو عام تھے لیکن کبھی خریدنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک کھیت چھوڑ دوسرا کھیت آلوؤں کا ہوتا۔ لوگ آلو چن چن کر تھک جاتے پر رزق ختم نہ ہوتا تھا اس گاؤں تھے بنی کے خیال سے پورے پاکستان کو آلو جاتے ہوں گے۔

آلوؤں کے ساتھ اپنے وطن کی مٹی، اس کی خوشبو اتنی پیاری دل موہ لینے والی ہوتی کہ جی چاہتا کہ بندہ مٹھیاں بھر بھر پھانک جائے۔ گاؤں کی مٹی بھی جو ہوتی ہے ملنسار محبت سے بھری پرخلوص اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، نیلا آسمان بنی پر جھکا ہوا تھا۔ فضاؤں پر تتلیاں اڑ رہی تھیں۔ اتنی ہریالی اس کے اردگرد تھی کہ اللہ کی محبت صاف سنائی دیتی تھی۔

"دنیا اتنی خوب صورت ہے تو جنت کیسی ہوگی۔ اے اللہ آپ میرے گاؤں کو بھی جنت میں لے جانا، مجھے اس سے محبت ہے۔"

بنی نے اتنے آلو چنے تھے جتنی انہیں ضرورت ہی نہیں تھی۔

"چلو کوئی مانگ ہی لیتا ہے ارے یہاں تو مانگتا بھی کوئی نہیں، یہ خزانہ ہر کسی کے گھر میں موجود ہے یہ آلو ہرا یا محبت ہے۔"

ایک دن بنی بیٹھی آلو کاٹ رہی تھی ساتھ ہری پیاز، ہری مرچ، ٹماٹر اور تھوڑا سا مسالا بھی رکھا تھا۔ ویسے تو وہ سبزیاں بھی کھیت سے لے آتے تھے۔ توری، بینگن، ہری مرچ، کدو۔

☆☆☆

اس آلوؤں کے دیس میں ایک شہزادہ آن نکلا تھا لاہور شہر کا باسی، سنا ہے آنے والا بھی بہت پیار سے باتیں کرتا تھا مگر لہجہ ان سے یکسر الگ بلکہ سب سے الگ۔

لاہور محبت ہے، محبتوں کا شہر ہے۔ اس کی بلیک چیک کی پینٹ شرٹ اور کالی بڑے بڑے شیشوں والی عینک، جیسے اس نے بتایا کہ یہ اتنی بھاری موٹر سائیکل اس کی ہے، تب کیاس چنتے گھاس کے گٹھڑ اٹھائے سب اسے دیکھتے رہ گئے تھے بالکل فلموں والا ہیرو، ذرا سا جھک کر بائیک پر بیٹھا تھا پھر نیچے اترا، ہر عورت نے اسے رک رک کر دیکھا تھا۔ لگتا ہے شہر سے آیا ہے آیا کس کے گھر ہے۔

ہر ایک نے ایک سے رک رک کر جھک جھک کر پوچھا تھا۔

"اتنی تیز دھوپ میں بھی چمکے مارتا ہے یہ لڑکا۔" خالہ نفیساں نے ناک پر انگلی دھری تھی۔

"خالہ کا بھتیجا ہے۔ ہائے بھتیجا ہے کہ چاند ہے۔ یہ چڑھا کدھر سے ہے۔ کاش یہ ہمارے آنگن میں طلوع ہوتا۔ میں اس کی ساری کرنیں سمیٹ کر اپنے صندوق میں بھر لیتی۔"

ہر لڑکی کا خواب تھا مگر بنی کا نہیں۔ ہم مٹی کے پالے ہوئے لوگ ہیں ہر وقت مٹی میں مٹی ہوتے رہتے ہیں، ہمارا ان کا کیا جوڑ۔ وہ شہر کا آزاد نہیں بندھا ہوا پرندہ ہے۔ گلی بندھی زندگی گزارنے والا۔ بنی کے لیے وہ صرف مہمان تھا جو شہر سے اس کا گاؤں دیکھنے اور اپنی پھوپھی عطیہ سے ملنے آیا تھا۔ سکندر نے دیکھا تھا۔ بغور دیکھا تھا کہ صرف گاؤں ہی دل کو نہیں لگا۔ لسی ہی اسے پسند نہیں آئی تنور سے نکلی گرم روٹیاں اور کھیت سے توڑی گئی سبزیاں ہی اسے اچھی نہیں لگیں بلکہ اسے بنی بھی بہت اچھی لگی ہے۔

میٹرک پاس اس کی پیاری سی پھوپھی زاد، ڈراموں میں جو الہڑ مٹیار دکھائی جاتی ہے، وہ تو ذرا مصنوعی پن ہے، اس نے تو ایک بھی فضول مسکراہٹ نہیں دکھائی نہ اس کے پاس کھڑا ہے نہ وہ ادائیں دکھائی ہے، اصل حقیقت گاؤں کی ہواؤں میں ہی خالص نہیں یہاں جذبے بھی سچے ہیں۔ یہ نہیں ڈراموں فلموں میں کون سا پھر دکھاتے ہیں۔

اس نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے لمبی سی سانس لی باغوں میں تو پاکیزگی ہوتی ہے۔

"ارے تم کہاں؟" وہ بنی کے خیال سے دل مسکرایا اور سر کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

کوئی مشکل نہیں۔ امی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ہمارا شہر میں اپنا گھر ہے زندگی اگر بنی کے ساتھ گزرے تو سمجھو، زندگی کے سارے رنگ اکٹھے کر لیے۔ کچھ باقی نہیں بچا۔

سکندر مقدر کا بھی سکندر رہا تھا ہمیشہ امی نے اس کے مضبوط ہاتھوں کو چوم لیا تھا۔

"جو میرے بیٹے کی پسند وہ میری پسند۔" امی ویسے ہی بہت اچھی تھیں۔ اب وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ دنیا کی بہترین ماں ہیں، اولاد کو سمجھنے والی، ظالم سماج کبھی نہیں تھا مگر ان دونوں کی مالی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا، مگر جب اللہ میاں مقدر کر دے تو سوائے شکر کے بندہ اور کیا کر سکتا ہے۔"

بنی نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں نے تو خواب بھی اپنی حیثیت کے حساب سے دیکھے تھے، مگر قدرت نے اسے زندگی کی ساری آسائشوں کے لیے چن لیا تھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

☆☆☆



وہ شہر آ گئی تھی اپنے گاؤں میں جو تنگی ترشی دیکھی تھی، اس کا یہاں نام و نشان نہیں تھا نہ بھینسوں کے گوبر، نہ چارہ کترنے والی مشین نہ لسی مکھن نکالنے کی مشقت اور گھر بھی پکی اینٹوں سے ایسا بنا ہوا تھا جیسے اسے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

ہر شے نفاست سے سجی صاف ستھری، سنک میں پڑے ان دھلے برتن بھی دھلے چمکتے لگتے، مگر ممانی کہتیں یہ دھونے والے ہیں، کام کاج کے لیے ماسی نہیں تھی۔ وہ اپنے کام خود کرتے تھے، بنی کو لگتا یہاں کرنے کو کوئی کام نہیں ہے ایک الگ ہی دنیا ہے۔

سکندر نے اسے اپنی قمیص استری کرنا سکھائیں۔ چپس بنوائے اور زندگی کی ہنستی مسکراتی ڈگر پر اس کا ہاتھ تھام کر چلنے لگا تھا آس پڑوس میں جیسے گاؤں میں ہر کوئی ہر کسی کا دکھ سکھ بانٹتے، بغیر کہے آ جاتا تھا وہاں ایسا کچھ نہیں تھا کبھی کبھی ہی کوئی اپنے ہمسائے کے گھر نہ جاتا کہ ڈسٹرب نہ کرو۔

زندگی یہاں اسے حیران کر رہی تھی۔ امی نے بٹنوں والے فون سے پہلی بار اسے فون کیا، تب اس کا جی چاہا کہ وہ چھلانگ لگا کر بذریعہ فون ہی اپنے گاؤں پہنچ جائے، لوگ مسکراتے بھی سوچ سمجھ کر اور کھاتے بھی تھوڑا سا وہ بھی چن چن کر اور رات دیر تک جاگنا مگر سکندر کے ساتھ ہر تبدیلی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔

وہ آلو چکن کا سالن اپنی پلیٹ میں نکال رہی تھی جب سکندر اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"امی! میں سائرہ سے مل کر آ رہا ہوں۔ بالکل ہی بدل گئی ہے۔ مڈل کلاس فیملی سے اٹھ کر محترمہ اسلام آباد کے پوش ایریا میں کیا پہنچیں، ہر ایک کی ہی خوب خبر لے رہی ہیں کہ یوں ہے، وہ کیوں ہے ابھی آنٹی سے کہہ رہی تھی کہ ہر کمرے میں اے سی لگوائیں، اے سی کے بغیر گزارہ نہیں ہے اور بھی بہت مہنگی مہنگی فرمائشیں کر رہی تھی آنٹی تو حیران تھیں ہی۔ میں بھی دیکھتا رہ گیا اس کے بدلے انداز۔ اف خدایا کیسے لوگ رنگ بدلتے ہیں۔ اپنی حیثیت ہی بھول جاتے ہیں۔ ہر ایک نے برا منایا ہے سائرہ کی حرکت کا مگر اسے پرواہ ہی نہیں۔"

ممانی بھی ہنس پڑیں اور بنی بھی۔ اس نے غور سے سارا قصہ سنا تھا۔ پتا نہیں کون تھی مگر ایسا [illegible] اندر کی بھوک تو مٹتی نہیں۔ باہر سے کھا بھی لیا تو کس کام کا۔ اس نے سوچا اور مسکراتے ہوئے، سکندر کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی، جہاں ہر طرح کا آرام اس کا منتظر تھا۔

آہستہ آہستہ وہ اس گھر کے سارے طور طریقے سیکھنے لگی تھی، بہت کچھ سیکھ بھی گئی تھی جو سیکھنا باقی تھا وہ پوری لگن سے تیار تھی۔

"دیکھو بنی! اس سائرہ والے قصے میں تمہارے لیے بھی ایک سبق ہے۔ کبھی بھی گاؤں جا کر اپنی ماں سے ایسی فرمائشیں نہ کرنے بیٹھ جانا کہ چکن کھانا ہے یا اے سی لگوا لیں یا پھر دوسری ضروریات یہاں سب ہونا ایک عام سی بات ہے مگر تمہارے یہاں نہیں معلوم ہی ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ سو پلیز جب بھی ہم گاؤں جائیں۔ ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تمہارے گھر والوں کو تکلیف پہنچے۔ تم نے میری بات سمجھ لی ہے ناں۔"

آخر میں وہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ کم سہولیات ہونا۔ گاؤں میں رہنا اور غریب ہونا اطمینان سے جینا کوئی برائی نہیں۔ سکندر ایسا نہیں سوچتا۔ ایسی باتیں بے معنی ہیں آج جب اس نے بنی کی پیشانی کو تکا تھا۔ اس پر محبت بھری نگاہ نہیں ڈالی بلکہ اس پر تھوک دیا تھا۔ بنی نے اپنا چہرہ دوپٹے سے صاف کیا تھا، سامنے بڑے سے آئینے میں اپنا آپ سنوارتا سکندر بھی عام انسان ہی تھا۔ جیسے سارے ہوتے ہیں، پسینے کی ننھی سی پہلی بوند گھر ٹھنڈا ہونے کے باوجود اس کا ماتھا چیر کر باہر آ گئی تھی۔

فرق ہفتے بھر میں ہی ظاہر ہو گیا تھا بس اس نے ہی دھیان نہیں دیا تھا۔

☆☆

نمرہ احمد



مکمل ناول

دسویں قسط

"یہ وہ ہوتا ہے ماہر جس کو جرم کا سب سے
زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ تمہارا دشمن وہ ہے جس کو...."
اس کی پلستر لگی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔"اس کا
سب سے زیادہ فائدہ ہوا ہے۔"
وہ یہ کہہ کے رکے نہیں۔ باہر نکلے اور اپنے

پیچھے دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

وہ الجھ کے اس کی بات پہ غور کرنے لگا۔ اسی پل دروازہ دوبارہ کھلا اور نرس ایک ٹرالی لیے اندر آئی۔

"آپ کے انجکشن کا وقت ہو گیا ہے۔" وہ

مسکرا کے کہتی آگے آئی۔ پھر مڑ کے اس لیپ کو دیکھا۔

"تار دوبارہ نیچے گرادوں؟" اس نے مسکرا کے سرگوشی کی۔

"کیا فائدہ؟ یہ لوگ پھر بھی آتے رہیں گے۔" تلخی سے سر جھٹکا۔ پھر میز پہ رکھی نوٹ بکس کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی لکیریں ابھر رہی تھیں۔

☆☆☆

شکور کا گھر ایک تنگ گلی میں تھا۔ کئی جگہوں سے نالیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور گٹر کا پانی باہر ابل رہا تھا۔ زیاد احتیاط سے کار آگے بڑھا رہا تھا۔ وہ بھی کچے کے راستے کو دیکھتی کبھی اس کے چہرے کو۔

"سوری۔ میری وجہ سے آپ کو کیسی کیسی جگہوں پہ جانا پڑ رہا ہے۔"

"کیا میں آپ کو اتنا نازک لگتا ہوں کہ ایسی جگہوں پہ جانے سے ناک بھوں چڑھاؤں گا؟" اس نے خفگی سے مالا کو دیکھا۔ "میں صرف آپ کے لیے فکر مند ہوں۔ آپ ایسی جگہوں پہ تنہا آتیں تو مجھے پریشانی رہتی۔"

"میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں۔" وہ زیر لب مسکرائی لیکن بظاہر لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"میری ماں بھی ہر وقت یہی کہتی ہیں۔ مانتا ہوں آپ خواتین بہت بہادر اور خود مختار ہیں لیکن ہر جگہ عورتوں کے اکیلے جانے والی نہیں ہوتی۔" اس نے کار ایک سبز گیٹ کے سامنے روکی۔

"کیا آپ کو شکور سے ملنے میں کوئی فائدہ نظر آ رہا ہے؟" وہ بغور اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ یہ کیوں کر رہا ہے؟"

"اول تو وہ مانے گا نہیں۔ اور اگر مان بھی گیا تو رکے گا نہیں۔ کہیں آپ کسی نئے خطرے میں نہ پڑ جائیں۔"

"اب پیچھے مڑنے کا وقت نہیں ہے۔" وہ سیٹ بیلٹ کھولنے لگی۔ نظریں سبز گیٹ پہ جمی تھیں۔

"اپنی لوکیشن ماہی اور معید کو بھیج دیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ اس وقت کہاں ہیں۔" وہ احتیاطاً بولا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔

"آپ کی حفاظت کے پیش نظر کہہ رہا ہوں۔"

"جانتی ہوں۔" وہ اسے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یونہی زبان سے پھسلا۔

"شادی کی تیاریاں کہاں پہنچیں؟" لہجے کو سرسری بنایا۔

"پھپھو نے کچھ شرائط رکھی ہوئی ہیں۔ پہلے وہ پوری ہوں گی۔ پھر معاملہ آگے بڑھے گا۔" اس کے لہجے میں تلخی سی تھی۔ مالا نے بغور اسے دیکھا۔

"کیا آپ خوش ہیں اس شادی سے؟"

زیاد سلطان نے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا اور زخمی سا مسکرایا۔

"خوش تو میں صرف ایک انسان کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اب تو بس زندگی گزارنی ہے۔ اپنے ماں باپ کی خوشی کے لیے۔" کچھ تھا اس کی آواز میں جو دل کو اداس کر دینے والا تھا۔ پھر وہ کہہ کے رکا نہیں۔ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

گیٹ دوسری گھنٹی پہ ہی کھل گیا۔ ایک منحنی سے نوجوان نے باہر جھانکا۔ اس کی سیاہ مونچھیں تھیں اور وہ زرد شلوار میں ملبوس تھا۔

"کیا یہ شکور کا گھر ہے؟" وہ جلدی سے بولی۔

وہ چند لمحے تعجب سے اسے دیکھتا رہا۔ "میں شکور کا بیٹا ہوں۔"

"ہم اندر آ کے کچھ بات کر سکتے ہیں؟"

اس نے تحیر سے ان دونوں کو دیکھا۔ ایک سویٹر میں ملبوس لڑکی جس کے بال آدھے کیچر میں بندھے تھے اور اس کے ساتھ کھڑا دراز قد آدمی۔ وہ دونوں منتظر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نوجوان نے ایک طرف ہٹ کے راستہ چھوڑ دیا۔

وہ اپنی نیوو ہیلز سے احتیاط سے اونچے نیچے فرش پہ قدم رکھتی آگے چلتی آئی۔ بدبو بہت شدید آ رہی تھی لیکن وہ ناک پہ ہاتھ رکھ کے بدتہذیبی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔

سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا اور اس کے آگے کمرے بنے تھے۔ باہر ایک طرف سنک لگا تھا جس کے نیچے بہت سا گٹر کا پانی کھڑا تھا۔ غالباً پیچھے کوئی باتھ روم تھا جس کا ڈرین انچ سسٹم بند پڑا تھا۔ اسے متلی سی ہونے لگی۔

نوجوان ان کو ایک بیٹھک نما کمرے میں لے آیا جہاں میلے کور والے صوفے رکھے تھے اور ساتھ ایک چارپائی بچھی تھی۔

زیاد اس کے برعکس آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے جانچتی نظروں سے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات کرنی ہے آپ کو؟"

کمرہ قدرے تاریک تھا۔ وہ دونوں سنگل صوفوں پہ ساتھ ساتھ بیٹھ گئے اور وہ ان کے سامنے چارپائی کے کنارے پہ بیٹھا۔

"شکور کہاں ہے؟" زیاد ہنوز مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

نوجوان نے ایک دفعہ پھر باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھے۔

"میرا باپ شکور؟" تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ اس کو بلاؤ۔ کہو اس کے اسکول سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔"

"اس کو تو مرے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے ہیں صاب جی۔"

وہ دونوں جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ ساکت۔ ششدر۔

"شکور مر چکا ہے؟" اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی سنائی دی۔

"کب کا۔ تسی لیٹ ہو گئے او۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔ ایسی ہنسی جس میں تمسخر تھا۔ تلخی تھی۔

"شکور کی موت کیسے ہوئی؟" پھر وہ جلدی سے بولی۔ "بہت بہت افسوس ہوا۔"

"اصل میں جب میرے ابو کو اسکول کی جاب سے نکالا گیا تو..."

"تو وہ مڈل ایسٹ چلا گیا تھا اور وہاں نوکری کرتا تھا۔ معلوم ہے۔" کشمالہ نے جلدی سے اس کا فقرہ مکمل کیا۔ لڑکے کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔

زیاد نے نگاہوں میں اس کو ریلیکس رہنے کا اشارہ کیا۔ ادھر نوجوان کہے جا رہا تھا۔

"جی۔ اس کی اسکول والی نوکری کے جانے کے بعد ہمارے حالات بہت خراب..."

"وہ سب مجھے معلوم ہے۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس واقعے کا دوبارہ ذکر کرے۔

"اس کی موت کیسے ہوئی؟"

"ہارٹ اٹیک ہوا تھا جی۔ لیکن آپ کیوں آئے ہو؟"

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سارے سوال اور جواب ختم ہو گئے تھے۔

"میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔" نوجوان خود ہی باہر نکل گیا۔

"اگر شکور مر چکا ہے تو..." اس کے جاتے ہی زیاد کے لبوں نے حرکت کی۔

"تو وہ عامل نہیں ہے۔ لیکن پھر مجھے اس کا چہرہ کیوں دکھائی دیا؟"

"شاید وہ آپ کا کوئی کانشنس ہے؟"

کشمالہ کی نظریں جھک گئیں۔ سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

نوجوان واپس آ کے بیٹھا تو ہاتھ میں چائے کی پیالیاں تھیں۔ ایک پیالی کا ہینڈل ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے ٹرے سامنے رکھی تو وہ بے اختیار چائے کو دیکھنے لگی۔ یہ کڑک چائے نہیں تھی۔ نہ ہی ساتھ نان خطائی

تھی۔ پھر بھی چارپائی "گاؤ تکیے" اور اندرون لاہور نے ایک ساتھ مجھے یاد کروایا تھا۔

"میں سکول کی طرف سے ایک رپورٹ لکھ رہی ہوں تو مجھے تمہاری مدد چاہیے۔" اس نے سویٹر کی جیب سے ننھی سی نوٹ بک اور پین نکالا اور سرسری سا سوال کیا۔

"شکور کوئی اور کام بھی کرتا تھا؟ یعنی دم درود... تعویذ کا کام۔"

"نہ جی۔ میرا باپ بڑا نیک تھا۔" لڑکا بدک کے بولا۔ "پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اور یہ دم درود تو سراسر جادو ہوتا ہے۔" اسے جیسے یہ بات بری لگی تھی۔

"تمہیں کیا معلوم؟ تم پردیس میں اس کے ساتھ ہوتے تھے کیا؟" زیاد نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تو نوجوان کے ماتھے کی تیوری چڑھ گئی۔

"وہ ہمیشہ اللہ رسول کا نام لیتا تھا۔ میرا باپ ایسے کاموں میں ملوث نہیں تھا۔ اور نہ وہ چور تھا۔ اس کو کسی نے غلط الزام میں اسکول سے نکلوایا تھا۔"

نوجوان اب تیز تیز بول رہا تھا۔ دکھ سے۔ احساس محرومی سے۔ وہ شکور کے ماضی کے بارے میں چند باتیں بتا رہا تھا۔ وہ سر جھکائے غائب دماغی سے انہیں لکھتی گئی۔ ناک ابھی تک بو کی عادی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"تم کیا کرتے ہو؟" زیاد کی مشتبہ نظریں نوجوان پہ جمی تھیں۔ دونوں نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

"محلے میں کریانے کی دکان پہ بیٹھتا ہوں۔ کسی سے بھی پوچھ لو۔"

اسی وقت باہر سے کسی نے آواز دی۔ "کمیٹی والے گٹر صاف کرنے آئے ہیں۔" نوجوان کے اٹھنے سے پہلے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں یہاں سے۔ شکور وہ آدمی نہیں ہے۔" بدبو ایک دم شدید ہوگئی تھی۔ اس نے ناک پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"چند سوال اور پوچھ لیتے ہیں۔" زیاد ابھی تفتیش جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کو ابکائی آتی محسوس ہوئی تھی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ میرا خواب جھوٹا تھا۔" اس نے تلخی سے کہتے ہوئے ڈائری اسی صفحے سے موڑ کے جیب میں گھسا دی۔ ڈائری جیب سے بڑی تھی۔ اس کا صفحہ باہر سے جھلکنے لگا۔ وہاں مالا کی لکھائی میں کورڈ کے بیچ کوئی بات دکھائی دے رہی تھی۔

"خاندان والے ہمیشہ میرے باپ کا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ..." اگلے الفاظ جیب کے اندر ہونے کے باعث چھپ گئے تھے۔

☆☆☆

بیرل فرید مسکراتے ہوئے ہسپتال کا ریڈور میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک پھولوں کا گلدستہ تھا۔ چوکھٹ پہ رک کے اس نے چہرہ جھکا کے گلدستہ سونگھا۔ پھر مسکرا کے دروازہ کھولا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آج اس کی وجہ وہ تار نہیں تھا۔

کمرے کی وہ دیوار جو ماہر کے بیڈ کے سامنے تھی اور شیشے کی اونچی کھڑکی دونوں اس وقت کاغذوں سے بھری نظر آ رہی تھیں۔ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا ماہر فرید کئی روز بعد ہشاش بشاش نظر آیا تھا۔ اس کی نوٹ بکس پھیلی تھیں اور وہ صفحے پھاڑ پھاڑ کے شبنم کو پکڑا رہا تھا۔

"اس کو وہاں لگاؤ۔ نہیں اس کے اوپر۔ ہاں ادھر۔" وہ اس کی ہدایت کے مطابق صفحات چسپاں کر رہی تھی۔

بیرل کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے وہ آگے آیا۔ گردن دائیں بائیں موڑ کے ایک ایک کاغذ کو دیکھا۔ پھر اسے جو اب ایک دوسری نوٹ بک کھول رہا تھا۔

"یہ کیا ہے ماہر؟"

ماہر نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ اسپتال کی سفید اور نیلی شرٹ پہنے، بال ماتھے پہ بکھیرے بڑھی شیو والا آدمی مسکرایا۔ گال پہ لگے زخم کا نشان ویسا ہی تھا۔ البتہ آنکھوں کے گرد نیل مندمل ہو رہے تھے۔

"وہی جو تم نے کہا تھا۔"

"میں نے کہا تھا مسٹری حل کرو۔ یہ نہیں کہا تھا کہ تم اسپتال کا کمرہ خراب کر دو۔ جرمانہ کر دیں گے وہ۔" اس نے پھول میز پہ رکھے اور خفگی سے کہتا بیڈ کی پائنتی کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

"کیا میں نے تم سے رائے مانگی ہے؟" وہ اب قلم سے ایک نوٹ پہ نشان لگا رہا تھا۔

"مانگی ہوتی تو آج یہ حال نہ ہوتا۔" بیرل نے پریشانی سے اسے دیکھا اور پھر دیوار پہ لگے کاغذوں کو۔

"ماہر تم ٹھیک ہو؟"

جواباً شبنم نے تھوڑا جھک کے اسے دیکھا۔ "ماہر بے ٹھیک ہیں۔ بس میری ہمت جواب دینے والی ہے۔"

"جانتی ہو نئی سیکرٹری ڈھونڈنا کتنا آسان ہوتا ہے؟" سر جھکائے بولا تو شبنم نے ناک سکوڑ لی۔

"آج آپ ڈھونڈ ہی لیں نئی سیکرٹری۔ کیونکہ میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔"

"تمہارے کانٹریکٹ کے مطابق تم دو ماہ کا نوٹس دیے بغیر استعفیٰ نہیں دے سکتیں۔ اس لیے یہ لو..." ایک اور کاغذ پھاڑ کے اس کی طرف بڑھایا۔ "اور اسے اوپر لگاؤ۔ ہاں شاباش۔"

"یہ سب ہے کیا؟" بیرل نے اس کے قریب اسٹول کھینچا اور اس پہ بیٹھتے ہوئے ناسمجھی سے ان کاغذوں کو دیکھا۔

"یہ ایک اسٹوری عجیب سی ہے۔ ہر وہ پیرانارمل ایکٹیویٹی جو آج تک میرے ساتھ ہوئی ہے، وہ میں نے ان نوٹ بکس میں لکھ کے رکھی تھی۔" کر تکیوں سے لگائے وہ ان کاغذوں سے بھری دیواروں کو دیکھتے ہوئے بتا رہا تھا۔ انداز بالکل نارمل تھا۔

"میں ان سب کو اپنے سامنے رکھ کے وہ ڈھونڈنا چاہ رہا ہوں جو ہمیشہ نگاہ سے اوجھل ہوتا رہا ہے۔"

"مجھے بھی سناؤ یہ اسٹوری۔ اور شبنم..." بیرل پیچھے ہو کے بیٹھا اور ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ "میری ریگولر کافی پلیز۔"

اس نے خلاف توقع جلدی سے "تمام" "تمام" کاغذ اور ٹیپ رکھی۔ اور پرس اٹھائے باہر کی طرف بھاگی۔

"کشمالہ اور میری کہانی اوشن کی فروخت سے ایک ہفتہ پہلے شروع ہوئی تھی۔ جب ہم چاروں اس ہوٹل سویٹ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت میں اس عامل کو ڈھونڈ رہا تھا جو کشمالہ کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔"

اس نے دیوار پہ سب سے اوپر کر کے لگائے گئے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر؟"

"لیکن وہ بہت شاطر تھا۔ وہ پہلے دن سے میری ہر حرکت سے آگاہ تھا۔ اس نے کشمالہ پہ لفٹ میں حملہ کروایا اور میرا الزام اسے دیا۔ تاکہ وہ ماہر فرید تک پہنچ جائے اور یوں وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال دے۔ وہ ہمیشہ سے مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔"

"ہوں... آگے؟" اب کے بیرل نے جمائی روکی۔ وہ یہ سب پہلے سے جانتا تھا۔

"میں کشمالہ کے قریب کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ رہا تھا جو جادو میں ملوث ہو۔ اور تب مجھے کبیرہ سادان کے بارے میں علم ہوا۔"

"اور پھر تم اس کے عامل سے ملے اور اسے کہا کہ اب وہ کبیرہ کے لیے کسی پر جادو نہیں کرے گا۔" بیرل نے جلدی سے بات مکمل کی۔ پھر وہ

چونکا۔ "لیکن یقیناً وہ کسی نئے عامل کے پاس چلی گئی ہوگی۔ مارکیٹ میں عامل کم ہیں کیا؟"

"ہاں... واہگہ بارڈر کے پاس ایک عامل کے پاس جاتی ہے۔" وہ کاغذوں کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟"

ماہر نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بے نیازی تھی۔

"کیونکہ اسے اس نئے عامل کے پاس میں نے بھیجا تھا۔"

بیریل فرید کے چہرے پہ حیرت بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک در آئی۔

"ایک منٹ ایک منٹ... یہ تم نے کیسے کیا؟" وہ بالکل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ساری بوریت غائب ہو گئی۔

ماہر نے گہری سانس لی۔ اور ہلکے سے شانے اچکائے۔

"میں اس کے عامل پیٹر مسیح سے ملا اور..."

☆☆☆

"دیکھو میرے ساتھ بدتمیزی مت کرنا۔ ورنہ میرے موکل..."

پیٹر مسیح نے ایک خوفزدہ نظر اس شخص پہ ڈالی جو خود کو کیف کہلاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ میز کے کونے پہ آگے ہو کے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تم سے جو پوچھنے جا رہا ہوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔" وہ پستول ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔ اس تقاضا تانی تیاری سے آیا تھا۔

"پ... پوچھو..."

ماہر نے موبائل اسکرین اس کے سامنے کی۔ اس پہ ایک گھنگھریالے بالوں والی بچی مسکرا رہی تھی۔

"یہ کہاں ہے؟"

پیٹر مسیح کی نظریں بچی پہ جھکیں۔ پھر اس نے واپس ماہر کو دیکھا تو آنکھوں میں لاعلمی تھی۔

"میں اسے نہیں جانتا۔"

وہ چند لمحے بالکل خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھے گیا۔

"میں واقعی نہیں جانتا۔ مجھ سے قسم لے لو۔"

"تم واقعی نہیں جانتے۔" اس کے چہرے پہ مایوسی پھیلی۔ وہ جانتا تھا وہ سچ کہہ رہا ہے۔

"تم اسے ڈھونڈ رہے ہو؟" صوفے میں دھنسے بیٹھے پیٹر مسیح نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "اگر تم کہو تو میں..." آواز دھیمی کی... "اس کا پتہ کروا سکتا ہوں۔"

"مجھے اپنے کاموں کے لیے تمہارے جنات کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے پستول پیٹر کے گھٹنے پہ رکھا۔ اس کے آگے سائلنسر لگا ہوا تھا۔

"کیا... کیا کر رہے ہو؟"

"میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ صرف گھٹنوں میں گولی ماروں گا۔ تم زخمی ہو گے۔ اور چند ماہ ہسپتال میں رہو گے۔" وہ اس کے اوپر جھک کے دھیرے سے بولا۔ "اور زخمی عامل کسی کام کا نہیں رہتا۔ کوئی جادو ٹوٹی ہڈی نہیں جوڑ سکتا۔ نہ جادوگر اپنا دھندا چلا سکتا ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔

"کبیرہ تمہارے پاس کیوں آتی ہے؟"

"ایسے پوچھو نا۔" پیٹر نے چند گہرے گہرے سانس لیے۔ "اس کو اپنی بیٹی کا رشتہ ایک زیاد نام کے لڑکے سے کروانا ہے۔ اور اسے اپنی ایک نند کی بیٹی ماہ بینہ کا بچہ ضائع کروانا ہے۔"

"اور؟"

"اور ہاں..." وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ "ماہ بینہ کی ماں حورِ جہاں کی حالت کا بھی پوچھتی ہے کہ ٹیومر کتنا پھیل گیا ہے۔ وہ بیمار ہے نا تو...."

ماہر کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔

"پوچھتی ہے؟"

"ہاں۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ بچے گی یا

نہیں۔" اس نے آواز مزید دھیمی کی۔ "کسی نے حورِ جہاں پہ بہت سخت جادو کر رکھا ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں۔

"کسی نے؟ کیا کبیرہ تمہارے پاس حورِ جہاں پہ جادو کروانے نہیں آئی؟"

پیٹر مسیح نے پہلے ناسمجھی سے اسے دیکھا، پھر تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں نہیں۔ حورِ جہاں کو میں نے بیمار نہیں کیا۔ نہ ہی کبیرہ نے ایسا کروایا ہے۔ اسے کسی اور نے بیمار کیا ہے۔ ناسود کا سخت ترین جادو ہے۔ وہ نہیں بچ پائے گی۔ کبیرہ تو بس اس کی حالت پوچھ کے مزہ لیتی ہے۔"

"اور کشمالہ؟" اس نے بغور اس کو دیکھا۔ "اس پہ کون عمل کر رہا ہے۔"

"ہم نہیں کر رہے۔ کوئی اور کر رہا ہے۔ ہم دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کرتے ورنہ ہم پہ اثر آسکتا ہے۔ دیکھو، جو میں کرتا ہوں وہ بتا دیا ہے۔ جو نہیں کرتا اس کا الزام مجھے نہ دو۔ وہ صرف ماہ بینہ کے بچے اور اپنی بیٹی کے رشتے کا جادو چاہتی ہے۔"

"انٹرسٹنگ۔ یعنی کبیرہ وہ نہیں ہے جو ہم سمجھ رہے تھے۔" وہ بڑبڑایا۔ پھر سر جھٹک کے مایوسی سے اسے دیکھا۔ "تم سرکار نہیں ہو۔ اپنی ویڈیو..." اس نے اگلا لائحہ عمل بتانا شروع کیا۔

"تم اب کبیرہ کے کہنے پہ کسی پہ جادو نہیں کرو گے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟ وہ مجھے چھوڑ کے کسی اور کے پاس چلی جائے گی۔"

"ہاں۔ اور اس کسی اور کے پاس اسے تم بھیجو گے۔" وہ اب دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "تم یقیناً اس کی کسی دوست یا قریبی شخص سے واقف ہو گے۔"

"ہاں ہاں۔ اس کا آدھا سوشل سرکل میرے پاس آتا ہے۔" پیٹر مسیح نے پہلی دفعہ دانت نکالے۔ پھر اس کے تاثرات دیکھ کے اندر کر لیے۔

"تم کسی کے ذریعے اس تک ایک کہانی پہنچواؤ گے۔ واہگہ بارڈر پہ بیٹھے ایک بہت شاطر عامل کی کہانی جس کا کوئی عمل ناکام نہیں ہوتا۔"

"واہگہ بارڈر پہ کون بیٹھا ہے؟" وہ چونکا۔

"جو بیٹھا ہے وہ جادوگر نہیں ہے۔ میرا دوست ہے۔ اور تم کبیرہ کو اسی کے پاس بھیجو گے۔ میں تمہیں اس کے لیے پیسے بھی دوں گا۔ اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو..." اس نے پستول کی نال اس کے گھٹنے پہ دبائی۔ پیٹر مسیح نے ہاتھ جلدی سے اٹھا دیے۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اگر وہ جادوگر نہیں ہے تو وہ چند ماہ میں اسے چھوڑ کے کسی اصلی عامل کے پاس چلی جائے گی۔"

"مجھے بس چند ماہ تک اسے مصروف رکھنا ہے۔ سمجھ گئے؟"

پیٹر مسیح نے سر ہلا دیا۔ پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا۔

"میں اس لڑکی کو ڈھونڈ سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو۔"

"کہا نا۔ مجھے تمہارے جنات سے کام نہیں کروانے۔ میں اسے خود ڈھونڈ لوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

"تم کہہ رہے ہو کہ کبیرہ ہماری ولن نہیں ہے؟ نو وے۔" بیریل بدمزہ ہو کے پیچھے ہو بیٹھا۔

"وہ ایک گناہ گار عورت ہے۔ لوگوں پہ جادو کرواتی ہے۔ لیکن یہ جادو اس نے نہیں کیا۔ یہ سرکار نے کیا ہے۔" وہ پھر سے سر اٹھا کے اپنے کاغذوں کو دیکھنے لگا۔

"تم نے یہ بات کسی اور کو بتائی ہے؟"

"نہیں۔ اس کی بہن ہمیشہ کبیرہ پہ شک کرتی ہے۔ لیکن وہ جذباتی سی لڑکی ہے۔ میں ایسی بات اس کو نہیں بتا سکتا تھا۔"

"لیکن تم نے مجھے بتا دیا۔" بیریل فرید طمانیت

سے مسکرایا۔ ماہر نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔

"کیونکہ مجھے اس وقت صرف تم دستیاب ہو۔"

لیکن بیربل کی مسکراہٹ کم نہیں ہوئی۔ وہ دلچسپی سے اب دیوار پہ لگے کاغذوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اگر کبیرہ سرکار کی کلائنٹ نہیں ہے تو پھر وہ یہ کیوں کر رہا ہے؟"

"یہی میں نہیں سمجھ پایا۔ وہ کشمالہ کو کیوں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔"

"تم مزید کیا جانتے ہو سرکار کے بارے میں؟"

"یہی کہ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔" وہ سوچ سوچ کے بتانے لگا۔ "سر پہ نارنجی رومال پہنتا ہے۔ اور اس کے بازو پہ ایک نشان ہے۔"

ماہر نے اپنے بازو پہ کہنی سے اوپر انگلی رکھی۔

"اس جگہ پہ۔"

"مزید کچھ؟"

"یہی کہ وہ بہت طاقتور ہے۔ بہت اثر و رسوخ ہے اس کے پاس۔ کسی وجہ سے وہ اپنی شناخت چھپاتا ہے۔ جیسے اپنے سامنے آنے پہ اس کو بہت کچھ کھونے کا ڈر ہو۔"

اتنے دن سے چھائی اکتاہٹ اور بے زاری اب عنقا ہو چکی تھی۔ وہ بس خاموشی سے سامنے لگے کاغذوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان پہ مختلف تاریخیں اور الفاظ لکھے تھے۔ جیسے نوٹس لیے گئے ہوں۔ عربی اور انگریزی کے ملے جلے الفاظ جنہیں صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔

"تم اسے ڈھونڈ لو گے ماہر۔ صرف تم ہو جو اسے ڈھونڈ سکتے ہو۔" بیربل نے بہت مان سے کہا تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"تمہیں لگتا ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گا؟"

"نہیں۔ صرف تمہیں خوش کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں تا کہ کمرے کا ماحول اچھا رہے۔"

وہ دھیرے سے ہنسا تو بیربل بھی ہنس دیا۔

"میں نے [illegible]"

چند ثانیے بعد وہ بولا تو آواز ہلکی اور نظریں کمزور تھیں۔ "میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت [illegible] ہو سکتے۔ لیکن میں نے کبھی تمہاری بیکری کے لیے کوئی بڑا آرڈر نہیں بھیجا نہ کسی کارپوریٹ دوست سے تمہاری سفارش کی ہے۔ تم ایک اچھے بیکر ہو۔ اگر تمہیں کوئی آرڈر ملتا ہے تو تمہارے اپنے ٹیلنٹ کی وجہ سے ملتا ہے۔"

بیربل مسکرا کے اسے دیکھے گیا۔

"اوکے۔ کر لیا میں نے یقین۔" ساتھ ہی ہنس کے سر جھٹکا۔ جیسے وہ ماہر کو جانتا نہیں تھا۔

☆☆☆

مبین منزل کے سارے کمرے دھلے دھلائے لگ رہے تھے۔ کئی جگہوں پہ گیلا پانی نظر آ رہا تھا جو سردی کے باعث سوکھا نہیں تھا۔

آج گھاس پہ ہلکی سی دھوپ نکلی تھی اور ماہی اس دھوپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی کئی روز سے جاری صفائی مہم کا اختتام کر رہی تھی۔

وہ باہر آئی تو لان میں چیئر پہ بیٹھی زیر لب مسلسل لاحول پڑھتی ماہی نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ روہانسا ہو گیا۔

"اتنے عرصے سے ہم ان چیزوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ دیکھو ذرا۔"

ماہی کے قدموں کے پاس ایک شیٹ بچھی تھی جس پہ بخت بی اور بانو چند چیزیں رکھ رہی تھیں۔ وہ انہیں ڈرڈر کے کپڑے سے ہاتھ لگا رہی تھیں جیسے ان میں چھوت کا مرض ہو۔

بکرے کا سر۔ کسی جانور کے کٹے ہوئے سینگ۔ مرا ہوا الو۔ چند تعویذ۔ ایک گڑیا۔ یہ چیزیں ایسی جگہوں سے ملی تھیں جہاں سے روز صفائی ہوتی تھی۔

"باجی یہ جنات ڈال جاتے ہیں۔ یہ نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔" بخت بی نے اپنا حصہ ڈالا۔

"آپ نے کبھی ڈھنگ سے صفائی کی ہوتی تو [illegible]"

ہو گئیں۔"

بخت بی کو تین دن سے ماہی سے ڈانٹ ہی پڑ رہی تھی۔ وہ پہلو بدل کے رہ گئیں اندر ہی اندر اپنا خواب سنانے پہ شدید پچھتا رہی تھیں۔ شکر ہے وہ دوسری بات نہیں بتا دی۔ ماہی نے تو اس کی جان نکال دینی تھی۔

"ان کا اب کیا کریں بی بی؟" ایک طرف کھڑے سلیم نے خائف انداز میں پوچھا۔

"ان کو پانی میں ڈالنا ہو گا۔" وہ لان کی گھاس پہ چلتی ہوئی آگے آئی۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا اور آنکھوں میں جیسے مایوسی سی تھی۔

"پانی میں؟" ماہی نے ابرو اٹھایا۔

"ہاں۔ کیونکہ جادوئی چیزیں آگ کی تاثیر رکھتی ہیں۔ ان کو ہمیشہ پانی میں ڈال کے ٹھنڈا کرتے ہیں تا کہ ان کا اثر ختم ہو جائے۔ اور پھر بہا دیتے ہیں۔ یہ بے اثر ہو جائیں گی۔"

وہ اس کے ساتھ ایک لان چیئر پہ بیٹھی۔ چہرے پہ فکر تھا اور آنکھیں دھوپ کے باعث چندھیا رہی تھیں۔

"کچھ معلوم ہوا؟" ماہی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ زندگی ایک دفعہ پھر بند گلی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"باجی...... ویسے ہمارے علاقے میں ایک بابا رہتا ہے۔ بابا چھڑی والا۔ اس سے پوچھو تو چند منٹوں میں بتا دیتا ہے کہ جادو کب اور کس نے کیا۔ اگر آپ کہیں تو میں اس سے بات کروں؟" بانو نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

ماہی نے ایک بے بسی بھری نظر ان چیزوں پہ ڈالی۔ اور مالا کو دیکھا۔

"کیا ہم کسی سے پتہ نہیں کروا سکتے کہ یہ جادو کون کر رہا ہے؟"

"ہمیں ہماری ماں نے نہیں سکھایا ماہی۔" وہ اس کو نرمی سے دیکھ رہی تھی۔ "ہمیں انہوں نے دین اور دنیا کی سمجھ اس لیے نہیں دی تھی کہ ہم کسی عامل کی چوکھٹ پہ چلے جائیں۔"

"لیکن مالا......" وہ ہچکچائی۔ "ہمیں اپنے دشمن کو کسی طرح تو ڈھونڈنا ہے نا۔ سخت مجبوری میں اگر ہم کسی عامل کے پاس چلے جائیں اور اس سے صرف اتنا پوچھ لیں کہ... یہ کس نے کیا ہے تو کیا برائی ہے؟ ہم اپنے دشمن پہ جادو نہیں کروا رہے۔ صرف اس کا پوچھ رہے ہیں۔"

"عامل کیسے معلوم کرے گا؟ جادو کے ذریعے۔ اور یوں ہم اس جادو کا حصہ بن جائیں گے۔"

"لیکن..."

"تمہارے خیال میں کبیرہ تائی ان کاموں میں کیسے پڑی ہوں گی؟"

ماہی ایک دم چپ ہو گئی۔

"کیا وہ پہلے دن ہی کسی عامل کے پاس گئی ہوں گی اور کہا ہو گا کہ ماہ بینہ کے بچے پہ جادو کر دو؟ نہیں ماہی۔ یہ سب ایسے شروع نہیں ہوتا۔" وہ اب خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب شروع ہوتا ہے سوالوں سے۔ کسی کے بارے میں کچھ ذرا سا معلوم کروانے سے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بے ضرر سا سوال ان کا ایمان خراب نہیں کرے گا۔ لیکن یہ آغاز ہوتا ہے۔ عاملوں کے دروازے پہ جانے والے قدم پھر کبھی واپس نہیں پلٹ سکتے۔ ہم وہ نہیں کریں گے جو کبیرہ تائی نے کیا۔ ہم اسے اپنی عقل سے ڈھونڈیں گے۔" سختی سے کہہ کے وہ اٹھ گئی۔ ماہی نے سر جھکا دیا لیکن وہ مطمئن نہیں لگ رہی تھی۔

وہ اسے وہیں چھوڑ کے گھر کے پچھلے حصے میں آ گئی۔ وہاں اجڑے ہوئے کچن گارڈن میں وہ قطع صاف دکھائی دیتا تھا جہاں سے گھاس ہٹا کے فاختہ کو دفن کیا گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس بے نام قبر تک آئی اور یونہی گردن جھکائے اسے دیکھے گئی۔

کچن گارڈن میں اُگی خودرو جڑی بوٹیاں

دھوپ میں سنہری لگ رہی تھیں۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کا رنگ بدلنے لگا۔ یہاں تک کہ بہار کی گھاس بن گئیں اور اس گھاس کے پیچھے ایک سرخ اینٹوں والی عمارت دکھائی دینے لگی۔

اونچی پونی والی لڑکی تیز تیز قدموں سے چلتی ایک راہداری کا موڑ مڑ رہی تھی۔ آگے ایک دروازہ تھا جسے کھول کے وہ اندر آئی تو سامنے باتھ رومز کی قطار نظر آئی۔ ایک طرف بڑا سا آئینہ بھی لگا تھا جس کے سامنے سنک بنے تھے۔

دفعتاً مالا ٹھہری۔ سنک کی طرف دیکھا جہاں گلابی ہیئر بینڈ والی لڑکی کھڑی تھی۔ آہٹ پہ وہ ایک دم ڈر کے مڑی۔ ہاتھ سے کچھ نیچے گرا۔ مالا کی نظریں جھکیں۔

اس کے پیروں کے قریب ایک سنہری گھڑی گری پڑی تھی۔ اس میں لگے ننھے ڈائمنڈ دور سے چمکتے دکھائی دیتے تھے۔

"یہ تو سر ستار کی گھڑی ہے۔" وہ چونکی۔ گلابی ہیئر بینڈ والی لڑکی جلدی سے جھکی اور گھڑی مٹھی میں دباتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

"ہاں ہے۔ پھر؟" اس کو دیکھ کے کندھے جھٹکے۔

"سر ستار صبح سے اسے سارے اسکول میں ڈھونڈ رہے ہیں۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ تمہارے پاس کیوں ہے؟"

وہ ہلکا سا مسکرائی۔ پہلے واچ بیگ میں ڈالی اور زپ زور سے بند کی۔ پھر سینے پہ بازو لپیٹے اور کندھے دوبارہ اچکائے۔

"کیونکہ اب یہ میری ہے۔"

"ایسے مت کرو۔ وہ پریشان ہیں۔ ان کو واپس کردو۔"

"ورنہ تم کیا کرو گی؟ ان کو جا کے بتاؤ گی؟" وہ ہلکا سا ہنسی۔ پھر دائیں بائیں ہلایا۔ "سر ستار کی اگلے ماہ پوسٹنگ ہو رہی ہے لیکن میں اگلے کئی سال تمہارے ساتھ اسی اسکول میں رہوں گی۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ ویسے بھی کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا pimples." اسی بے پرواہی سے ابرو اچکائے۔ "اور اگر کسی نے میری تلاشی لینے کی کوشش کی تو میرے پاپا اس اسکول کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

وہ چند قدم آگے آئی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے چہرے کے بالکل قریب تھی۔

"تمہیں کیا معلوم کسی کے پاپا کیا ہوتے ہیں؟" وہ اس کے کندھے سے زور سے کندھا ٹکرا کے آگے بڑھ گئی۔ اس کا سارا وجود ہل کے رہ گیا۔ اس نے بے اختیار مڑ کے اسے جاتے دیکھا۔ پہلو میں گرے ہاتھ کی مٹھی بھینچ رکھی تھی اور چہرے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

"تمہیں کیا معلوم کسی کے پاپا کیا ہوتے ہیں؟" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

منظر بدلا اور اس کے چلتے ہوئے قدم ایک دوسری راہداری کے سامنے سے گزرے۔ سر ستار آفس کے باہر کھڑے زور زور سے چلا رہے تھے۔

"وہ ڈائمنڈ واچ تھی۔ میرے مرحوم بھائی کا گفٹ۔ اور تمہارے علاوہ اسے کوئی نہیں اٹھا سکتا، شکور۔"

سفید بالوں اور پکی رنگت والا شکور نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

"نہیں سر....

"میں نے اسے وضو کے لیے اتارا تھا۔ میری غیر موجودگی میں صرف تم میرے آفس میں آئے تھے۔"

"سر جی قسم لے لیں میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑے۔

"تم لوگ اور تمہاری جھوٹی قسمیں...."

کاریڈور کے ستون سے سر نکال کے وہ منظر دیکھتی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شکور اب ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ تھوڑی سے گرتے آنسو قمیص کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

منظر بدلا اور وہ اب اپنا بیگ کندھے پہ ڈالے روش پہ چلتی جا رہی تھی۔ سامنے سیدھ میں ایک گیٹ بنا تھا۔ اسے دیکھ کے وہ رکی۔ شکور اپنی سائیکل کو ہینڈل سے پکڑے گیٹ سے باہر نکال رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ قمیص کے دامن سے صاف کر رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

"شکور چاچا...."

اس نے پلٹ کے سامنے سے آتی لڑکی کو دیکھا۔

"مجھے پتہ ہے آپ نے چوری نہیں کی۔ کسی اور نے کی ہے۔" اس نے پھولی سانسوں کے درمیان خود کو کہتے سنا۔

شکور آنسوؤں بھری آنکھیں لیے اسے دیکھتا رہا۔

"میں آپ کو اس کا نام بتا سکتی ہوں۔ آپ سر ستار سے کہیں کہ اس کا بیگ چیک کروالیں لیکن میرا نام مت لیجیے گا۔"

"جانتا ہوں.... تمہاری کلاس کی لڑکی نے چوری کی ہے۔ وہی لڑکیاں دفتر آئی تھیں۔ لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ غریب کی کوئی نہیں سنتا۔" وہ غصے میں ایک دم غرایا تو وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تم سب امیر لڑکیاں آپس میں ملی ہوئی ہو۔ اللہ عذاب نازل کرے گا تم سب پہ۔"

"مم میں نے چوری نہیں کی۔ میں صرف...."

"تم سب ایک جیسے ہو۔ ہمیشہ میرا مذاق اڑاتے تھے۔ آج مجھے چور بھی بنا دیا۔ تم سب سے اللہ پوچھے گا۔" نفرت سے پھنکارتا ہوا وہ انگلی اٹھا کے کہہ رہا تھا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں اس اسکول اور اس کی نوکری پہ۔" سرخ چہرے کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے سائیکل باہر نکال لیا۔ وہ بالکل ساکت ہوئی اسے دور جاتے دیکھ رہی تھی۔

اس کے قدموں میں بچھی بے نام قبر سرما کی دھوپ میں روشن دکھائی دیتی تھی۔ مالا جھکی اور پنجوں کے بل وہاں بیٹھ کر نرمی سے مٹی پہ ہاتھ پھیرا۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں؟" وہ اداس مسکراہٹ سے کہہ رہی تھی۔ "اسی لیے مجھے معاف کرنا نہیں آتا۔ کیونکہ مجھے بھی کسی نے معاف نہیں کیا تھا۔"

اس کا مرمریں ہاتھ دھوپ سے گرم ہوئی مٹی پہ برابر چل رہا تھا۔

☆☆☆

"کسی سے اپنے اوپر جادو کروانے والے کا معلوم کروانا گناہ کیوں ہے؟"

اس شام چڑچڑی سی ہوئی ماہی لیپ ٹاپ اسکرین کے سامنے بیٹھی تھی۔ اسکرین پہ ڈاکٹر رائد نظر آ رہے تھے جو غالباً اپنے آفس کی کرسی پہ بیٹھے تھے۔

"آپ پریشان لگ رہی ہیں۔" اس سوال پہ گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"میرے گھر سے اتنی جادوئی چیزیں نکلی ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میں صرف جاننا چاہتی ہوں کہ یہ عامل کون ہے؟"

"آپ کو یہ جان کہ کیا ملے گا کہ جادو کون کروا رہا ہے؟"

"ہم اپنے دشمن سے دور رہیں گے۔"

"وہ پھر بھی جادو کرتا رہے گا۔ اس کو کیا فرق پڑے گا؟ البتہ آپ کا ایمان چلا جائے گا۔ ہم مسلمانوں کے پاس ایمان کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے؟"

وہ خاموش ہوگئی۔ تھوڑی ندامت سے جھک گئی۔

"سوری۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ مگر.... ہم اس عامل کو ڈھونڈنے کے بہت قریب تھے۔ میری بہن کو خواب میں ایک چہرہ نظر آیا لیکن وہ جس آدمی کا تھا وہ کئی برس پہلے مر چکا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ انسانی دماغ خواب میں کوئی ایسا چہرہ نہیں دیکھ سکتا جو اس نے حقیقت میں نہ دیکھا ہو۔ یہاں تک کہ شیاطین بھی جب خواب میں ڈرانے آتے ہیں تو وہ کوئی ایسا چہرہ بنا کے آتے ہیں جو ہم نے حقیقت میں دیکھ رکھا ہو۔"

"کیا واقعی؟" اس کا منہ کھل گیا۔ "لیکن جو لوگ خواب میں انبیا کو دیکھتے ہیں' ان کا کیا؟"

"چونکہ آج کے لوگوں نے انبیا کو نہیں دیکھ رکھا اسی لیے علما کہتے ہیں کہ ایسے خوابوں پہ یقین نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ البتہ یہ ایک روحانی پہلو ہے۔ میں سائنسی پہلو کی بات کر رہا ہوں۔"

"یعنی اگر میں نے کسی کا اصلی چہرہ نہیں دیکھا تو وہ خواب میں بھی دکھائی نہیں دے گا۔"

"بالکل۔ انسانی دماغ کے لیے نیا چہرہ دیکھنا ناممکن ہے۔"

وہ چند لمحے کے لیے بالکل حیرت زدہ سی بیٹھی رہ گئی۔

"مطلب... وہ عامل نہیں تھا۔ عامل کوئی اور ہے... لیکن پھر وہ خواب میں کیوں نظر آیا؟"

"کیونکہ دوسری وجہ یہ ہے کہ عامل کبھی خوابوں میں نظر نہیں آتے۔ میں اپنی بات دہراتا ہوں آپ پہ جادو کرنے والا کبھی خوابوں میں نظر نہیں آئے گا۔ یہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ خود عامل کا پردہ رکھتا ہے تاکہ انسان آپس میں فساد نہ کریں۔"

"یعنی شکور والا خواب بے معنی ہے؟"

"نہیں۔ خواب صرف نشانیاں ہوتے ہیں۔ ہنٹ۔ اشارے۔ وہ کبھی پیس آف کیک نہیں ہوتے کہ آپ دیکھتے ہی جان لیں کہ آپ کا مجرم کون ہے۔ وہ آدمی کسی اشارے کے طور پہ نظر آیا ہوگا۔"

"ایسے خواب جس میں جادو کرنے والے کی طرف اشارہ ہو یا کوئی چہرہ نظر آئے اس پہ فوراً یقین نہیں کرنا چاہیے۔"

"بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ علماء کہتے ہیں کہ ایسی چیزوں میں شیاطین کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ خود عاملوں کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کون جادو کر رہا ہے۔ اسی لیے ان چیزوں کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھنا چاہیے کیونکہ جنات جھوٹ بھی بہت بولتے ہیں۔ کسی غلط بندے کا نام بھی لے سکتے ہیں۔"

"اور اسی طرح خاندانی دشمنی اور فساد شروع ہوتا ہے۔" اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اگر ہم خوابوں سے جاننے لگیں کہ ہم پہ جادو کون کروا رہا ہے تو ہم اپنے قریبی لوگوں کی جان ہی لے لیں۔"

"مجھے معلوم ہے میری ایک آنٹی ہم پہ جادو کرواتی ہیں۔ لیکن کس سے کرواتی ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں۔"

"پھر آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ اس کا چہرہ سامنے لے آئے۔ اگر آپ کی دعا اس کے جادو سے بڑی ہوئی تو وہ ضرور سامنے آ جائے گا۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ جادوگر کے تجسس میں نہیں رہنا چاہیے۔ اپنا دفاع مضبوط کرنا چاہیے۔"

ماہی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ فولڈ کر کے رکھ دیا۔

اس کے سر پہ بنی چھت کے اوپر مالا کا اسٹوڈیو تھا۔ وہ وہاں تنہا کھڑی بڑبڑاتے ہوئے دیواروں پہ لگے کاغذ اتار رہی تھی۔

"میرے خواب جھوٹے تھے۔ سب جھوٹ تھا۔" وہ بے بسی سے ایک ایک کاغذ نوچ کے اتار رہی تھی۔ سامنے ایک کھلا کارٹن رکھا تھا جس کے اندر ان کاغذوں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔

اس سے اوپر اس کی وہ چھوٹی نوٹ بک تھی جسے وہ شکور کے گھر لے کر گئی تھی۔ اس پہ لکھی تحریر واضح نظر آ رہی تھی۔

"خاندان والے ہمیشہ میرے باپ کا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ..."

مالا نے جھٹکے سے کارٹن بند کر دیا۔ اس کی تلاش ناکام گئی تھی۔ شکور اس کا مجرم نہیں تھا۔ وہ صرف اس کے ضمیر کی ایک پھانس تھا۔

دفعتاً فون کی ٹون بجی تو اس نے اسی بے زاری سے موبائل نکالا۔ پھر زیاد کا نام پڑھ کے ماتھے کی شکنیں سیدھی ہونے لگیں۔ لبوں پہ ایک مسکراہٹ خود بخود اترنے لگی۔

☆☆☆

زیاد اسے میسج بھیجنے سے چند منٹ قبل اپنے آفس میں بیٹھا لیپ ٹاپ پہ کام کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پہ چل رہی تھیں اور آنکھوں پہ اسکرین گلاسز لگے تھے۔ ساتھ ایک گرم کافی مگ رکھا تھا جس سے اڑتی بھاپ آفس کیبن کی دھندلی دیواروں تک کا سفر کر رہی تھی۔

دفعتاً ساتھ رکھا موبائل زوں زوں کرنے لگا۔ اس نے اسکرین سے نگاہیں ہٹا کے دیکھا۔ نام دیکھ کے انگلیاں ٹھہر گئیں۔

ابو کالنگ۔

ایک گہری سانس لے کر زیاد نے عینک اتاری۔ تھوڑی کھجائی۔ جیسے ہمت مجتمع کی ہو۔ پھر فون کان سے لگایا۔

"جی ابو۔" بشاشت سے پوچھا لیکن دوسری طرف کہے جانے والے الفاظ سن کے اس کی تھوڑی جھک گئی۔ چند لمحے وہ سنتا رہا۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"جی ابو... میں ابھی تک پھپھو سے ملنے نہیں جا سکا۔ جب سے آیا ہوں مصروف رہا ہوں۔ کبھی امی کو اسپتال لے کر جاتا ہوں۔ کبھی آفس کے کام دیکھتا ہوں۔" وہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

دوسری جانب کچھ سخت کہا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تھکاوٹ بڑھنے لگی۔

"ابو میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔" اس نے بدقت کہنا شروع کیا۔

"اور میں اب جو کہنے جا رہا ہوں وہ آپ کو دکھ دے گا۔ لیکن..." ناک کی ہڈی کو انگلیوں میں مسلتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔ "ابو میں علیشبہ سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ میں یہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کو کبھی خوش نہیں رکھ سکوں گا۔"

دوسری جانب سناٹا چھا گیا۔ وہ ہمت کر کے کہتا گیا۔

"میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں' ابو.." اس کی آواز بھیگ گئی۔ سر جھک گیا۔ "اور میں ساری عمر آپ کا دل جیتنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن اب میں تھک گیا ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں کسی لڑکی کی زندگی نہیں خراب کر سکتا۔ میرے دل میں کوئی اور ہے۔"

دوسری طرف سے ایک دم زور زور سے کچھ کہا جانے لگا۔ زیاد نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

"آپ جو بھی کہیں' ابو۔ میں صرف آپ کو خوش کرنے کے لیے یہ شادی نہیں کر سکتا۔ میں بچپن سے آپ کو ہی خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔" اس نے رک کے کہا۔ چہرے پہ تکلیف پھیلی۔

"امی کو بیچ میں مت لائیں' ابو۔ ان کا کیا قصور ہے؟ یہ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے کہہ رہا ہوں۔"

لیکن اس کے الفاظ درمیان میں ٹوٹ گئے۔ دوسری جانب سے مسلسل ابو کی تیز آواز گونجتی سنائی دے رہی تھی۔

"جی۔ میں جانتا ہوں' کشمالہ نے انکار کر دیا تھا لیکن میں ایک دفعہ پھر اس سے بات کروں گا۔ کیا معلوم اب کی دفعہ وہ مان جائے۔ بالفرض وہ نہ مانی تب بھی میں علیشبہ سے شادی نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں آپ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔"

موبائل میں سلطان صاحب کے زور زور سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "تم تمہاری ماں"

کے الفاظ سب سے واضح تھے۔

وہ تحمل لیکن کرب سے سنے گیا یہاں تک کہ وہ خاموش ہوئے تو وہ دھیرے سے بولا۔

"امی کو آپ پہ مسلط کیا گیا تھا اور آپ کبھی خوش نہیں رہے۔ میں علیشبہ کے ساتھ وہ سب نہیں کرنا چاہتا جو میری ماں کے ساتھ ہوا۔ سوری ابو۔ میں دبئی آکے آپ سے پھر سے معافی مانگوں گا۔ لیکن ابھی مجھے اپنے لیے فیصلہ کرنا ہے۔" اس نے فون رکھ دیا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی جسے اس نے ہتھیلی کی پشت سے رگڑا۔

پھر موبائل پہ میسج ٹائپ کرنے لگا۔

"کشمالہ... کیا ہم کل مل سکتے ہیں؟ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" میسج بھیج کے اس نے گہری سانس لی۔ ہونٹوں پہ بالآخر ایک امید بھری مسکراہٹ ابھری۔ اس نے فون رکھ کے واپس عینک لگالی اور انگلیاں کی بورڈ پہ جمادیں۔

☆☆☆

"شکور کے معاملے میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا' کشمالہ۔"

"You were just a little girl."

وہ گلابی اور سفید رنگ سے سجی ایک بوتیک بیکری تھی جس کے ایک کونے میں ریستوران ایریا بنایا گیا تھا۔ چھت سے اونچے نیچے سفید رنگ کے سجاوٹی پرندے لٹک رہے تھے۔ دوسرے کونے میں گلابی چیری بلاسم کا نقلی درخت کھڑا تھا۔ غرض وہ ایک فیری ٹیل سی بیکری تھی۔

"کیا واقعی میرا قصور نہیں تھا؟" وہ قائل نہیں ہو رہی تھی۔

وہ دونوں ایک کونے والی میز پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ درمیان میں کافی کے دو کپ رکھے تھے۔ زیاد کے قریب ایک پلیٹ میں براؤنیز نظر آرہی تھیں۔

"پہلے بتائیں...... آپ واقعی براؤنیز نہیں کھانا چاہتیں؟" زیاد نے چمچ سے ٹکڑا توڑتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرادی اور سرنفی میں ہلایا۔ اس کے کھلے بال ـــــ چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے اور اس نے سفید ہائی نیک سویٹر پہن رکھا تھا جس کے گریبان پہ ایک لمبا سنہرا لاکٹ جھول رہا تھا۔ اس پہ سیاہ رنگ کی فاختہ بنی تھی۔

"میں میٹھا نہیں کھاتی۔" مسکرانے کے باوجود البتہ اس کی آواز اداس تھی۔

"کشمالہ آپ ایک چھوٹی سی بچی تھیں جب آپ نے وہ کیا۔" وہ آگے ہو کے بیٹھا اور فکرمندی سے اسے دیکھا۔

"آپ آج جیسی پراعتماد ورکنگ وومن نہیں تھیں۔ آپ کلاس میں ـــ بلی ہوتی تھیں اور آپ کی ذات میں باپ کی محرومی کا ایک خلا تھا جس کی وجہ سے آپ کسی کو ناراض کرنے سے ڈرتی تھیں۔ الزام آپ نے نہیں لگایا تھا۔ آپ بس خاموش رہی تھیں۔ بچپن میں بہت سے بچے ایسے کرتے ہیں۔"

"ٹین ایج میں۔" اس نے تصحیح کی۔

"ٹین ایج میں بھی کرتے ہیں۔ شکور کی نوکری آپ کی وجہ سے نہیں' سرستار کی وجہ سے گئی تھی۔ کیا اتنا عرصہ اس نے اپنی ایمانداری ثابت نہیں کی ہوگی کہ انہوں نے یوں اس پہ الزام لگادیا؟ سرستار بڑے تھے' ان کو اس پہ بھروسہ ہونا چاہیے تھا۔"

"میں اس واقعے کو جسٹفائی نہیں کرسکتی۔ میں نے غلط کیا تھا۔ اور میں اس غلط کو ٹھیک نہیں کرسکتی۔ میں نے اسے ذہن کے کسی کونے میں دھکیل کے بھلادیا۔"

"اور پھر؟"

"پھر میں نے اپنا سیکشن بدلوالیا۔ میں اپنے لیے کھڑی نہیں ہوتی لیکن میں اس جگہ سے خود کو ہی بو ـــ کرلیتی ہوں۔ یہی میرا ڈیفنس میکنزم ہے۔ شاید اس لیے کہ میرا باپ نہیں تھا۔" اس نے کافی کا کپ اٹھا کے لبوں سے لگایا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کڑوی تھی۔

"باپ کے ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ہم میں سے کچھ ساری عمر باپ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ خوش نہیں ہوتے۔" اس نے چونک کے زیاد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پہ زمانے بھر کی اداسی تھی۔

"آپ کے ابو...."

"میں نے علیشبہ سے شادی سے انکار کردیا ہے۔ اور وہ اب سخت ناراض ہیں۔ لیکن میں اس کے ساتھ زیادتی نہیں کرسکتا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔"

اوپر سے لٹکتے سفید پرندے ہلکے ہلکے جھول رہے تھے۔ ان کی کانچ کی بنی آنکھیں ان دونوں پہ جمی تھیں۔

"میں بھی تھک گئی ہوں۔" مالا نے کپ رکھا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرالیا۔ "ان جادوؤں سے۔ ان تعویذوں سے۔"

"کیا آپ مزید اس جال کو نہیں ڈھونڈنا چاہتیں؟"

اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹاکے نفی میں سر ہلایا۔

"میں اب لاہور میں نہیں رہنا چاہتی۔ میں اس سب سے دور جانا چاہتی ہوں۔"

"پھر وہ کریں جو آپ کا دل کہتا ہے۔ چلی جائیں اس سب سے دور۔" وہ رکا اور پھر جیسے ہمت جمع کر کے کھنکھارا۔

"میں بھی اس سب سے دور جانا چاہتا ہوں۔ میں بھی زخمی ہوں اور اپنی ہیلنگ ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے بھی اپنی ذات کو درست کرنا ہے۔ اور آپ کو بھی۔"

اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کے نا سمجھی سے زیاد کو دیکھا۔ لیکن وہ سمجھ رہی تھی۔

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہم ایک ساتھ خود کو ہیل کریں؟"

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ایسے ہی اس پل کوئی یاد آیا تھا۔ لیکن اس نے حلق میں آئے بہت سے آنسو نیچے دھکیلے۔ اس کو زیاد سے اس سوال کی توقع تھی۔

"کیا آپ اپنے والد کو ناراض کر کے خوش رہ سکیں گے؟"

"وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔ لیکن آپ بتائیں...... آپ کیا چاہتی ہیں؟"

ساتھ ہی اس نے جیب سے کچھ نکالا تو وہ چونکی۔ وہ ایک مخملیں ڈبی تھی۔

"میں آج آپ سے ایک دفعہ پھر پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ دنیا کے کسی دوسرے کونے میں جا کے اپنی نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہیں؟"

زیاد بہ جبھی اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"مجھے نہیں معلوم زیاد۔ میں بس اس سب سے دور جانا چاہتی ہوں۔"

"تو میرے ساتھ چلیں۔ میں اور آپ مل کے ایک دوسرے کو ہیل کرسکتے ہیں۔ ہم دونوں اپنی اپنی ذات کے ٹکڑوں سے لڑتے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم پرفیکٹ نہیں ہیں۔ ہم دونوں کو اپنے اپنے باپ کی طرف سے چوٹ لگی ہے۔ لیکن جانتی ہیں... محبت سب سے بڑا مرہم ہوتی ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا اور وہ اسے بھیگی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کی محبت میرے زخموں کو بھرے اور میں آپ کو آپ کے ٹراما سے نکالوں۔ کیونکہ محبت سب سے بڑا مرہم ہے اور یہی ہیل کرسکتی ہے۔"

وہ ہلکا سا مسکرادی۔ پھر اس نے ڈبی اٹھا کے کھولی۔ اس کے اندر ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی۔

مالا نے دھیرے سے ڈبی بند کی۔ زیاد سلطان کا سانس رک گیا۔

اس نے ڈبی اس کی طرف واپس دھکیلی۔ اور نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"ہمارے ہاں منگنیاں ایسے نہیں ہوتیں۔ آپ

کو اسے لے کر میرے گھر آتا ہوگا۔ وہ بھی اپنے والد کے ساتھ۔ میں کسی کو ناراض کر کے نیا رشتہ نہیں بنا سکتی۔" وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں تکان بھی تھی اور امید بھی۔

"میرے دل میں آپ کی عزت اس بات سے مزید بڑھ گئی ہے۔ میں ابو کو لے کر آؤں گا۔"

پھر پلیٹ کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ "شیور آپ براؤنیز نہیں کھانا چاہتیں؟"

اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلا دیا اور کافی کا مگ اٹھا لیا۔ اوپر جھولتے نازک پرندے خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

☆☆☆

نیند میں اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ چند لمحے کے لیے بیربل کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ پھر پلکیں جھپکائیں تو منظر اس پہ واضح ہوا۔

سامنے بستر پہ ماہر لیٹا تھا۔ تکیے اوپر کر کے رکھنے کی وجہ سے اس کا سر قدرے اونچا تھا۔ وہ خاموشی سے سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ بیربل نے آنکھیں مسلیں اور اٹھ کے بیٹھا۔ وہ کب کاؤچ پہ بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا اسے یاد نہ تھا۔ وال کلاک پہ نظر پڑی تو دیکھا رات کے پونے تین بج رہے تھے۔

"ماہر... ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہوں؟" وہ دور خلاء میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" وہ اٹھا اور روم فریج کی طرف آیا۔ "پتہ نہیں کب ڈسچارج کریں گے یہ لوگ تمہیں۔" بڑبڑاتے ہوئے فریج کا دروازہ کھولا۔ پھر پانی نکال کے پلٹا تو دیکھا وہ اسی طرح کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

"اس کو کال کر لو یار۔" وہ جیسے تھک ہار کے کہتا واپس کاؤچ پہ بیٹھا تو ماہر چونکا۔

"کیا؟"

"اس کو کال کر لو۔ دوبارہ سے معافی مانگ لو۔ وہ تمہیں معاف کر دے گی۔"

ماہر دھیرے سے مسکرایا۔ "میں اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔"

"تم ایکسیڈنٹ سے پہلے اسی سے ملنے جا رہے تھے۔"

"وہ اور معاملہ تھا۔ میں اس کی ماں کا افسوس..."

"تو اسی کے لیے کال کر لو۔ ورنہ چند دن بعد معلوم ہوگا کہ اس نے کسی اور سے شادی کر لی ہے۔ کتنا انتظار کرے گی وہ تمہارا؟"

وہ ہلکے سے ہنس دیا اور سر جھٹکا۔

"کم از کم اس ٹال اور ڈارک سے نہیں کرے گی۔ وہ اپنی کسی کزن سے شادی کر رہا ہے۔" ماہی کی بتائی بات کو بہت سکون سے آگے بتایا۔ بیربل نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"کیا وہ واقعی ہینڈسم نہیں ہے یا تم صرف اپنے جذبات کی وجہ سے کہتے ہو۔"

"واقعی نہیں ہے۔"

"وہ ہینڈسم ہو یا نہ ہو اسے وہ ہینڈسم لگتا ہے اور تم اسے کچھ نہیں لگتے۔"

بیربل تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو ماہر نے بڑبڑا کے رہ گیا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوا اس سب کا؟" وہ چند ثانیے خاموش رہ کے تھک گیا تو دوبارہ اسے مخاطب کیا۔ اشارہ دیوار پہ لگے کاغذوں کی طرف تھا۔

ماہر نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔

"میں اسے کبھی نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔ نہ تین ملکوں میں۔ نہ اپنے دماغ سے ایک کمرے میں۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔"

"پھر ان کاغذوں کو اتار دیتے ہیں ماہر۔ یہ تمہیں صرف ڈسٹرب کر رہے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ماہر نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی جیسے تنگ آ گیا تھا۔

بیربل دیوار تک گیا اور آہستہ آہستہ پیپر ٹیپ سے چپکے کاغذ اتارنے لگا۔

"شکر کرو میں نے زارا کو یہاں نہیں آنے دیا۔ وہ یہ کاغذ دیکھ لیتی تو اس کے سوال بھی ختم نہ ہوتے۔" وہ ایک ایک کاغذ کھینچ رہا تھا۔ "ویسے مالک نے اسے کبھی تمہارے اور کشمالہ کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟"

"مالک اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس کے ہر کام کی کوئی پیچیدہ سی وجہ ہوتی ہے۔" اس نے بے زاری سے شانے اچکائے۔ پھر ایک دم وہ ٹھہر گیا۔

"مالک..."

"کیا؟" بیربل نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ تھا۔

"مالک..." ماہر نے لیٹے لیٹے بیڈ کے ریموٹ کا بٹن دبایا۔ بیڈ سرہانے والی طرف سے اوپر اٹھنے لگا۔

"تم نے اس دن کہا تھا کہ میں سرکار کو اس لیے نہیں ڈھونڈ سکا کیونکہ میں اسے بہت دور ڈھونڈ رہا تھا۔ کیا معلوم وہ بہت قریب ہو؟" خودکار بیڈ ایک طرف سے اونچا ہو گیا تو وہ اس پہ بیٹھا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پہ چونک جانے کا تاثر تھا۔

"ہمارے قریب ایسا کون ہے؟" بیربل نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

وہ بڑبڑایا۔ "مالک..."

"مالک؟" بیربل کے چہرے پہ بے یقینی ابھری۔ "ہرگز نہیں۔ تمہارا دماغ خراب ہے؟ وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ تم سے بہت محبت...."

"مالک نے کہا تھا کہ مجرم وہ ہوتا ہے جس کو جرم کا سب سے زیادہ فائدہ ہو۔" اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ بیربل جوش سے بولتے بولتے رک گیا۔

"مالک نے کہا تھا کہ میں اس کو اس لیے نہیں ڈھونڈ سکا کیونکہ میرے جذبات درمیان میں آ گئے۔ مالک ٹھیک کہہ رہا تھا۔" وہ بے یقینی سے جیسے خود سے بول رہا تھا۔

بیربل آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھتا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ماہر... کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں درست تھا لیکن میں خود بھی یہ سمجھنے لگا کہ میں اپنے جذبات کی وجہ سے ایسے کہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"یہ کہ زیاد سلطان ہینڈسم نہیں ہے۔" وہ جیسے خود بھی چونک گیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے بیربل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"تم... چلیز... تم سب میرا مذاق اڑاتے تھے۔ تم سمجھتے تھے کہ میں جیلسی میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ لیکن نہیں بیربل۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بالکل بھی ہینڈسم نہیں ہے۔ مگر کشمالہ کو وہ ہینڈسم کیوں لگتا ہے؟"

بیربل نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔

"رات کے تین بج رہے ہیں ماہر.... تمہیں اب سو جانا چاہیے۔"

"شمس بھی ہینڈسم نہیں تھا۔"

بیربل فریز جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ساکت۔ جامد۔

"لیکن ہماری خوبصورت ماں نے ہمارے وجیہہ باپ کو چھوڑ کے اس سے شادی کی۔ یاد ہے وہ کیسے کہتی تھیں کہ شمس بہت خوبصورت انسان ہے؟ اور ہم حیران ہوتے تھے؟"

کاغذ بیربل کے ہاتھ سے نیچے پھسل گئے۔

"شمس سرکار کا کلائنٹ تھا۔ ہم سمجھتے رہے کہ اس نے ابا پہ جادو کیا ہے۔ ان کو بیمار کیا ہے۔ لیکن نہیں۔ شمس نے ہماری ماں پہ جادو کیا تھا۔ ابا کی بیماری اس جادو کا نتیجہ تھی۔"

"جیسے کشمالہ کی ماں کی بیماری۔" بیربل یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم نے کہا بیربل کہ وہ کشمالہ کو ہینڈسم لگتا

ہے۔ایسا صرف دو صورتوں میں ہوتا ہے۔" اس نے نوٹ بک اٹھائی اور تیزی سے صفحے پلٹنے لگا۔" پہلی صورت محبت ہے۔ اور کشمالہ کو اس سے محبت نہیں ہے۔ اور دوسری صورت....."

ایک صفحہ کھول کے اس نے سامنے کیا۔

"سحر عشق...."

چند ثانیے کے لیے روم نمبر ۵۵۵ میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"سرکار زیاد اور کشمالہ کی تصویروں پہ جادو ان کو جدا کرنے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ وہ ان کو ملانے کا جادو کر رہا تھا۔ کشمالہ نے اپنی ماں کی وجہ سے زیاد سے شادی سے انکار کیا تھا۔ اس کی ماں کی موت کا فائدہ صرف زیاد کو ہوتا ہے۔ وہ پاکستان اپنی کزن سے شادی کے لیے نہیں، کشمالہ کے لیے گیا ہے۔"

اس نے نوٹ بک بیر بل کی طرف بڑھائی۔ وہ بالکل گنگ ہو گیا تھا۔

"سرکار کا کلائنٹ کوئی اور نہیں ... زیاد سلطان ہے۔"

اس کو اپنی آواز دور کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ ایک طویل عرصے سے سحر عشق کر رہا تھا۔"

بیر بل نے نوٹ بک پہ چہرہ جھکایا۔

"سحر عشق کیا ہوتا ہے؟"

☆☆☆

(سحر عشق کی ابتدا کب ہوئی، کوئی نہیں جانتا لیکن اس کی انتہا ہزاروں سال قبل سلیمان علیہ السلام کے دور میں ہوئی تھی۔)

زیاد سلطان باتھ روم سے نکلا تو گیلے تولیا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنے بال رگڑتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

(دور سلیمان میں عموماً یہود کے جادوگر اس جادو میں ملوث ہوتے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ جادو اتنا عام ہوتا گیا کہ بہت سے مردوں نے اسے سیکھ لیا تھا۔)

زیاد نے پولو شرٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

(ہم عموماً سمجھتے ہیں کہ جادو عورتیں کرتی ہیں۔ لیکن سحر عشق وہ جادو ہے جسے تاریخ میں سب سے زیادہ مردوں نے استعمال کیا ہے۔)

اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرایا۔

(یہ جادو عموماً وہ مرد کرتے تھے جو شکل و صورت میں بہت عام یا بدصورت ہوتے تھے۔ اور جب ان کا دل کسی ایسی خوبصورت عورت پہ آ جاتا جس کو وہ کسی جائز طریقے سے پا نہیں سکتے تھے تو یہ اس عورت کے اوپر سحر عشق شروع کر دیتے تھے۔)

اس کا عکس واپس اس کی طرف جھانک رہا تھا۔

وہ ایک ایسا چہرہ تھا جو معاشرے کے خوبصورتی کے معیار پہ پورا نہیں اترتا تھا۔ وجہ اس کی رنگت نہیں، اس کے بے کشش نقوش تھے۔ چہرے پہ چھائی سنجیدگی اور کرختگی اس کو مزید ناپسندیدہ صورت بناتی تھی۔

(سحر عشق ہمیشہ حسین اور شادی شدہ عورتوں پہ کیا جاتا تھا۔ حسین عورتیں زیادہ دیر تنہا نہیں رہتیں، ان کی شادیاں جلد ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں یہ سحر عشق کی ابتدا اپنی محبوب عورت کو کسی میٹھے کھانے کا تحفہ بھیج کے کرتے تھے جس میں جادو ملا ہوتا تھا۔)

ٹیرس پہ کھڑی لڑکی نے براؤنی کھاتے ہوئے نیچے دیکھا۔ اور پورچ میں کھڑے دراز قد آدمی نے سر اٹھایا۔

(جادو کا پہلا اثر عورت اور اس کے شوہر کے تعلق پہ پڑتا تھا۔ عورت کو اپنا شوہر یا محبوب بدصورت یا جانور نما نظر آنے لگتا۔)

اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے زیاد نے پرفیوم اٹھایا اور خود پہ چھڑکا۔

(عموماً ایسے مرد یہ جادو کرتے تھے جو اس حسین عورت کے ہاتھوں مسترد ہو چکے ہوتے تھے۔ ایسے میں ان کا دوسرا قدم اس عورت کے ذہن سے جادو کے ذریعے اپنا پرانا تاثر مٹانا ہوتا تھا۔)

"ہم سہیل کی شادی پہ ملے تھے زیاد سے۔" ماہی کہہ رہی تھی۔ مالا نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔

"اچھا؟ مجھے یاد نہیں۔"

(جادو کا اثر ہونے کے کچھ دن بعد سحر کرنے والا جب محبوب عورت سے ملتا تو وہ اس عورت کو دنیا کا حسین ترین مرد دکھائی دیتا۔ جسے وہ کشش سمجھتی، وہ دراصل جادو کا اثر ہوتا تھا۔ یوں وہ مسلسل میٹھے تحفے دے کر اس جادو کو مزید راسخ کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔)

"شیور آپ براؤنیز نہیں کھانا چاہتیں؟"

"میں آپ کے لیے چاکلیٹس لایا تھا۔"

"میں نے خواب میں دیکھا کہ....." بخت بی بانو کو کان میں بتا رہی تھی۔ "بڑی بی بی جی مجھے ایک دوسری بات بھی کہتی ہیں۔ کہ ماہی سے کہو اپنا خیال کرے۔ اتنا میٹھا نہ کھایا کرے۔"

"توبہ یہ بات نہ بتانا ماہی بی بی کو۔ پہلے ہی وہ اپنے بڑھتے وزن کے بارے میں پریشان ہیں۔ اس بات پہ خوب برا منائیں گی۔"

زیاد نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے پرفیوم کی بوتل واپس رکھی۔

سنگھار میز پہ رکھا اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا اور فون کان سے لگایا۔

"جی سرکار.." اس کا لہجہ کسی مرید کی طرح معتقد سا تھا۔

"کیا وہ مان گئی؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا

"جی سرکار۔ بالکل ایسا ہوا جیسا آپ نے کہا تھا۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

(لیکن سحر عشق کرنے والے جادوگر کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ بہت بھاری قیمت۔)

زیاد سلطان نے موبائل رکھا اور سنگھار میز پہ رکھے کاغذ اٹھائے۔ وہ نگینہ بیگم کی رپورٹس تھیں۔

"قیمت تو میں ادا کر رہا ہوں۔" وہ خود سے بڑبڑایا۔ "لیکن کشمالہ مبین کے لیے کچھ بھی۔"

اس نے رپورٹس دراز میں ڈال دیں۔ اور خود کار کی چابی اٹھائے باہر نکل گیا۔

مالا کے اسٹوڈیو میں رکھے ادھ کھلے کارٹن کے اوپر رکھی نوٹ بک پھڑپھڑا رہی تھی۔

"سب میرے باپ کا مذاق اڑاتے تھے۔" شکور کے بیٹے کے الفاظ وہاں خاموشی سے رقم کیے گئے تھے۔ "میرے باپ کا رنگ بہت کالا تھا۔ اور اسی وجہ سے سب اس کو بدصورت کہتے تھے۔ نوکری جانے کے بعد وہ دبئی چلا گیا اور سب رشتے داروں سے کٹتا گیا..."

☆☆☆

اس اندھیرے کمرے میں چوکڑی مارے بیٹھے جادوگر نے موبائل نیچے رکھا اور زیاد نام کی کال بند کی۔ پھر اپنے سامنے رکھی چیزوں کو دیکھا۔ گڑیا۔ تعویذ۔ زعفرانی روشنائی۔ اس نے مسکرا کے ان چیزوں کو ایک طرف کیا۔ اور پھر اپنی ٹانگیں دھیرے سے سیدھی کیں۔ اب اٹھنے کا وقت تھا۔

اس کے بوڑھے ہاتھوں نے کھڑے ہوتے ہوئے سر سے نارنجی رومال اتارا اور اسے ایک طرف ڈال دیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے اس نے کمرہ عبور کیا۔ ایک کونے میں کھونٹی لگی تھی جہاں ایک سفید لباس لٹکتا دکھائی دے رہا تھا۔

سرکار نے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے اپنا میلا، گدلا لباس اتارا اور وہ براق سفید لباس پہنا۔ پھر لمبے سفید بالوں کو آہستہ آہستہ چوٹی میں گوندھنے لگی۔ جب چوٹی بن گئی تو اس نے سفید دوپٹہ اٹھا کے سر پہ لپیٹا، تسبیح ہاتھ میں پکڑی اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ سیڑھیوں کا اختتام ایک دروازے پہ ہوا۔

سرکار عرف نگینہ بیگم نے دروازہ کھولا تو باہر

سے ڈھیر ساری روشنی اندر آئی۔ انہوں نے مسکرا کے دروازہ بند کیا اور اوپر آئیں۔

وہاں ایک صاف ستھرا سا لاؤنج بنا تھا۔ ایک کونے میں سلطان صاحب بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ عینک کے پیچھے سے انہیں آتے دیکھا۔ آنکھوں میں تنفر ابھر آیا۔

"اپنے کالے کاموں سے فرصت لے کر آ گئی ہو نگینہ بیگم؟"

وہ صرف مسکرائیں۔ کہا کچھ نہیں۔ اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ وہاں بنگالی ملازمہ کھڑی ان کی منتظر تھی۔

وہ سنک تک آئیں تو زور کی کھانسی آئی۔ جھک کے سنک میں کھانسیں تو خون کے چند قطرے نیچے گرے۔

انہوں نے نل کھول لیا اور منہ پہ چند چھینٹے مارے۔

"زیاد کے لیے کچھ بھی..." وہ بڑبڑائیں اور آگے بڑھ گئیں۔

☆☆☆

استنبول شہر سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو پہ وہ ایک جنگل نما علاقہ تھا۔ صبح کا وقت تھا اور ابھی روشنی ہوئے زیادہ دیر نہیں بیتی تھی۔

درختوں کے درمیان ایک طرف چند نوجوان باربی کیو کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری طرف دو افراد بندوقیں اٹھائے باری باری اڑتے ہوئے مٹی کے کبوتروں کا نشانہ لے رہے تھے۔

ان میں سے ایک مالک فرید بھی تھے۔

گولی کی آواز کے ساتھ ہی ایک کبوتر چھنا کے سے ٹوٹا تو مالک نے بندوق نیچے کی۔ اور ساتھ کھڑے ادھیڑ عمر آدمی کو دیکھا جو اپنی بندوق کی نال سے ایک آنکھ بند کیے کچھ دیکھ رہا تھا۔

"میرے بھتیجے پہ حملہ کرنے والی کار کا سراغ ابھی تک نہیں ملا۔" انہوں نے ناخوشی سے اپنی بات دہرائی۔

"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میں تمہیں جلد اچھی خبر سناؤں گا۔" اس نے بندوق نیچے کی اور مالک کے کندھے کو دھیرے سے تھپکا۔

"میں خود باش کومسار چنگیز سے رپورٹ لے رہا ہوں۔ ہم حملہ آور کو جلد پکڑ لیں گے۔" وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ باربی کیو اسٹینڈ سے اٹھتی دھوئیں کی خوشبو سردی کا لطف دوبالا کر رہی تھی۔

"ہاں وہ ماہر کا دوست ہے۔ اس لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔" مالک کے تاثرات ہمیشہ کی طرح برف تھے۔ "لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس معاملے کو حل کرنے میں اس سے بھی زیادہ قوت صرف کرو۔"

"میں نے کہا نا، ہم تمہیں جلد اچھی خبر سنا دیں گے۔" وہ تسلی دے رہا تھا۔ ان کے جوگرز خزاں رسیدہ پتوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

"تم بتا رہے تھے تمہاری بیٹی کی سالگرہ ہے؟"

"ہاں۔ اگلے ہفتے۔ تم آسکو گے؟" ڈی جی صاحب نے مسکرا کے پوچھا۔

"نہیں۔ میں لندن واپس جا رہا ہوں۔ زارا ضرور آئے گی۔" وہ رکے اور آواز کو مزید سرسری بنایا۔ "لیکن اگر تم نے کیک آرڈر نہیں کیا تو نشانتاشی میں ایک بیکری ہے۔ میرے بھتیجے کی۔ تم اس کو ٹرائی کر سکتے ہو۔"

"اچھا؟" ڈی جی صاحب نے مسکرا کے انہیں دیکھا۔

"یعنی تمہاری مرضی ہے۔ آزما کے دیکھ لو۔ لیکن میرا نام مت لینا۔ وہ سمجھے گا کہ میں...."

وہ دونوں اب خشک پتوں پہ چلتے دور جا رہے تھے۔ آوازیں مدھم ہو گئی تھیں۔

مبین منزل میں بنے بیڈ رومز میں واحد ماہی کا کمرہ تھا جس کی کھڑکی عقبی صحن میں کچن گارڈن کی طرف کھلتی تھی۔ چند روز قبل وداع ہوئی فاختہ کی قبر بھی وہیں تھی۔ اب کی مٹی کا رنگ اطراف جیسا ہو گیا تھا اور اس پہ ننھی سی گھاس اگ رہی تھی۔ مالا کھڑکی سے نظر آتی اس قبر کو دیکھ رہی تھی جب معید کھنکھارا۔

"تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟" اس نے چہرہ موڑ کے اپنے بھائی کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ ساتھ براجمان ماہی گود میں رکھی چاولوں کی پلیٹ میں سے کھاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ تھی۔ وہ تینوں اس وقت ماہی کے کمرے میں تھے جس میں جگہ جگہ بے بی فیڈرز، فارمولا ملک کے ٹن اور ایسی دیگر اشیاء بکھری تھیں۔

"زیاد اور میں نے مل کر فیصلہ کیا ہے۔ ہم دونوں کو اپنی آئندہ زندگی کے لیے یہ بہترین لگا ہے۔" وہ پراعتماد تھی۔ معید نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور دھیرے سے مسکرا دیا۔

"مجھے زیاد ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ ویل مینرڈ۔ اچھی جاب کرتا ہے۔ ڈیسنٹ ہے۔"

"ڈیسنٹ ہے لیکن......" ماہی نے چاولوں کا چمچہ منہ میں رکھا۔ وہ دونوں اس کے کہنے پہ چونک کے اسے دیکھنے لگے۔ وہ گڑبڑائی اور جلدی جلدی چاولوں کو حلق سے نیچے اتارا۔ پھر پانی کا گھونٹ بھرا اور کھنکھاری۔

"لیکن تمہیں زیاد سے بہتر بھی کوئی مل سکتا ہے۔"

"تمہیں زیاد میں کیا برائی نظر آتی ہے؟" وہ چونکی۔ ماتھے پہ لکیریں ابھریں۔ اسے ماہی کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

"زیاد ذرا......" ماہی الجھ کے رک گئی۔ جیسے کچھ حلق میں اٹک جاتا تھا۔ جیسے کوئی سوچ جکڑ لیتی تھی۔ "مجھے نہیں معلوم۔ بس سوچ لو۔"

"تم بھی سوچ لو ماہی! سفید چاول کھائے جا رہی ہو۔ جانتی ہو، یہ صحت کے لیے کتنے نقصان دہ ہوتے ہیں؟" معید نے اس کی پلیٹ کو افسوس سے دیکھا۔ ماہی کے ماتھے پہ بل پڑے۔ زور سے چمچ پلیٹ میں رکھا۔

"سب میرے کھانے کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟" وہ مزید کچھ کہتی لیکن فون بجنے لگا۔ ایک خفا نظر دونوں پہ ڈال کے پلیٹ اور فون اٹھائے وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

"خالہ کی کال ہے۔ میں سن کے آتی ہوں۔" جاتے جاتے بھی معید کو شدید بری طرح گھورا تھا۔

"کون سی خالہ؟" معید نے غائب دماغی سے پوچھا۔ مالا نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"ہماری کتنی خالائیں ہیں معید؟ ایک ہی تو ہیں۔ ماں اور نور جہاں خالہ کی سب سے بڑی بہن۔ ثمر جہاں۔"

"ایسے کہو ثمر خالہ۔ ماہی کی خالہ۔ تم لوگ بھی ہر پڑوسن کو خالہ بنا لیتی ہو۔ مجھے کیا پتا۔" وہ ہنس دیا اور مالا افسوس سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔

"خالہ کا طرز تخاطب ہم صرف ثمر خالہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں سگی خالہ اور پڑوسنوں میں فرق معلوم ہونا چاہیے۔ رشتے داریاں یاد رکھنا صرف لڑکیوں کا فرض نہیں ہوتا۔"

وہ دونوں اب آپس میں الجھ رہے تھے۔

اور کچن میں کھڑی ماہی موبائل کان سے لگائے سادگی سے اپنی ساس کو بریفنگ دے رہی تھی۔

"ابھی نگینہ آنٹی نے صرف فون پہ معید اور مجھ سے بات کی ہے۔ اگلے ہفتے وہ انکل کے ساتھ پاکستان آئیں گی تو ہم بات پکی کریں گے۔"

"نگینہ کے گھر رشتہ کیوں کر رہے ہو تم لوگ؟" خالہ جھنجھلائیں۔ ماہی چونکی۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"وہ لوگ مالا کے قابل نہیں ہیں۔ اتنی جلدی مت کرو۔"

"مگر خالہ... زیاد میں کیا برائی ہے؟" ماہی الجھ سی گئی۔

"مالا کو اس سے بہتر بر مل سکتا تھا۔" وہ افسوس

سے بولیں۔ ماہی نے بے اختیار لاؤنج کے پار اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ ابھی یہی تو اس نے بھی کہا تھا۔

"آپ مالا سے بات کر کے دیکھیں۔"

"میں خود آ کے اس سے بات کروں گی۔"

"مگر آپ نے دو ماہ بعد آنا ہے۔ فون پہ بات کر لیں۔" وہ بے چین ہوئی۔

"یہ باتیں فون پہ نہیں ہوتیں۔ اور تم لوگ فوراً جواب نہ دو۔ تھوڑا وقت مانگو۔ دو تین ماہ تو لڑکی والوں کی چوکھٹ پہ لوگ جوتے گھساتے ہی ہیں۔" وہ آرام سے بولیں۔ ماہی نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔

وہ واپس آئی تو قدرے غائب دماغ سی لگ رہی تھی۔

"خالہ کیا کہہ رہی تھیں؟" مالا نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سوچ میں گم دھپ سے صوفے پہ بیٹھی۔

"خالہ چاہتی ہیں کہ ہم ان کے آنے کا انتظار کریں اور رشتہ ان کی موجودگی میں طے ہو۔ ہماری طرف سے کسی بڑے کا ہونا بھی ضروری ہے۔" اس نے الفاظ جوڑے۔

"میں ہوں نا۔" معید کو کچھ برا لگا۔ "اور ماموں بھی آ جائیں گے۔ مسئلہ کیا ہے؟"

"خالہ ابھی لمبا سفر نہیں کر سکتیں۔ ان کے گھٹنے کی سرجری ہوئی ہے نا۔ ماں کی ڈیتھ پہ بھی اسی لیے نہیں آ سکیں۔ ہم ان کا انتظار کر سکتے ہیں۔ جنوری کے آخر تک وہ آ جائیں گی اور میں تو مارچ تک یہیں ہوں۔" بظاہر اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے البتہ کمرے میں پھیلا تناؤ سب محسوس کر سکتے تھے۔

"نگینہ آنٹی کینسر پیشنٹ ہیں۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ دو ماہ میں شادی کی بات کر رہی تھیں۔ اور تم کہہ رہی ہو ہم رشتہ تک طے نہ کریں۔" معید خفا ہوا۔ ماہی نے شانے اچکا دیے۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے تم لوگ کہو۔" کمرے میں چند لمحے کے لیے تناؤ بھری خاموشی چھا گئی۔ پھر ماہی کو جیسے کچھ یاد آیا۔

"ویسے نگینہ آنٹی چند دن پہلے پاکستان تھیں نا۔ جب انہوں نے حور کو گھٹی دی تھی۔ پھر وہ کیوں چلی گئیں؟"

"وہ ہر مہینے صرف پانچ دن کے لیے پاکستان آتی ہیں۔ یہ ان کی پرانی روٹین ہے۔"

"تھکتی نہیں ہیں اتنے ٹریول سے؟ وہ بیمار بھی ہیں۔"

"میں نے بھی زیاد سے یہی پوچھا تھا۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ تین گھنٹے کی تو فلائٹ ہے۔ اور نگینہ آنٹی کو اپنا لاہور والا گھر بہت عزیز ہے۔ یہاں آ کے وہ بہتر محسوس کرتی ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور نرمی سے ماہی کو دیکھا۔

"خالہ جب بھی آئیں' موسٹ ویلکم۔ لیکن میں اپنی زندگی کے فیصلے اپنے رشتے داروں کے فلائٹ شیڈول کے مطابق نہیں کر سکتی' ماہی۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں" اس کا انداز نرم مگر دو ٹوک تھا۔ ماہی کا سر اثبات میں ہل گیا۔ جب مالا فیصلہ کر لے تو کوئی چیز اس کو اس فیصلے سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

☆☆☆

"کیا میں نے درست فیصلہ کیا ہے؟"

اس دوپہر صفورا اور وہ ایک ریستوران میں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے اوپر شیشے کی چھت بنی تھی جس پہ جگہ جگہ بوگن ویلیا کے گلابی پھول نظر آ رہے تھے۔ دیواریں بھی شیشے کی تھیں جو کہیں سے اونچے پودوں سے ڈھکی تھیں۔ اور کہیں سے سرما کی نرم دھوپ کو اندر آنے کا راستہ دے رہی تھیں۔

اس نے صفورا سے یہ سوال اپنے لنچ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جو اس کے سامنے ان چھوا رکھا تھا۔ صفورا اپنے لنچ کی تصویر کھینچ رہی تھی کیونکہ وہ اپنا کھانا انسٹاگرام کے اجنبیوں کو دکھانا فرض سمجھتی تھی۔ اس سوال پہ چونک کے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ مالا کی آنکھیں پلیٹ پہ جھکی تھیں۔ سیاہ بال چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے۔ سبز کارڈیگن کے اندر جھانکتے سفید کرتے کے گریبان پہ سیاہ فاختہ والا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ پھر تھا کشمالہ کے چہرے پہ۔ جو اداس کر دینے والا تھا۔

"بہترین فیصلہ ہے۔ زیاد کے بارے میں جتنا میں نے تم سے سنا ہے' وہ ایک شان دار انتخاب ہے۔ اپنے فیصلے پہ شک کیوں کر رہی ہو؟" صفورا نے چھری کانٹا پلیٹ میں چلانا شروع کر دیا۔

"کہیں میں جلد بازی سے کام تو نہیں لے رہی؟ یعنی دو ماہ میں شادی۔" اس نے نگاہ اٹھا کے صفورا کو دیکھا۔ وہ کانٹے کو چکن فلے میں گاڑے چھری سے ایک ٹکڑا کاٹ رہی تھی۔

"انتظار کس کا کرنا ہے؟ امی رہی نہیں۔ یہاں رہ کے کیا کرو گی۔ دبئی جاؤ اور نئی زندگی شروع کرو۔" پھر اس کا چہرہ دیکھ کے صفورا نے ہاتھ روکا اور ایک گہری سانس لی۔

"تم بتاؤ' مالا۔ تم جلد بازی کیوں کر رہی ہو؟" اور وہ جیسے ایک دم سے بولنے لگی۔

"کیونکہ میں لاہور میں مزید نہیں رہنا چاہتی۔ یہاں ہر طرف ماں کی یادیں ہیں۔ ڈپریشن ہے۔ ایک طویل عرصے سے کوئی میرا تعاقب کرتا آیا ہے۔ میں اس سب سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں۔"

"اب تو وہ تعاقب نہیں کر رہا نا؟" صفورا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"نہیں۔ کیونکہ میں نے اس کا تعاقب چھوڑ دیا ہے۔"

ذہن کے پردے پہ باتھ روم کے نل والا واقعہ لہرایا۔ اور اسٹوڈیو میں پڑا کارٹن جس میں اس نے عامل کے متعلق جمع کی گئی معلومات کو سیل بند کر دیا تھا۔ وہ باب ختم ہو چکا تھا۔

"میں نے دبئی میں بھی کچھ جگہوں پہ جاب کے لیے اپلائی بھی کیا ہے۔" اس نے بالآخر چھری کانٹا اٹھایا۔

"پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"کچھ ہے میرے اندر جو مجھ سے کہتا ہے کہ زیاد میرے لیے بہترین چوائس نہیں ہے۔" وہ الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

"کیا تمہیں زیاد سے محبت ہے؟"

"کیا مجھے زیاد سے محبت ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"نہیں ہے؟" صفورا نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"پتا نہیں۔" اس نے بال کان کے پیچھے اڑسے۔ سبز آنکھوں میں اداسی سی تھی۔

"مجھے اس کے لیے ایک بے چین کر دینے والی کشش محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ کھنچتا ہو اس کی طرف۔ وہ سامنے ہو تو سب سے اہم وہی لگتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی خواہش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد میں کوئی فیصلہ کروں ورنہ میں اسے کھو دوں گی۔"

"شروع شروع میں محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔" اس نے لاپروائی سے اسٹیک کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

"واقعی؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔ "میں سمجھی محبت مختلف محسوس ہو گی۔"

"مختلف کیسے؟"

مالا نے تھوڑی پہ ہاتھ رکھا اور نظریں اٹھا کے چھت سے لٹکتی بوگن ویلیا کی بیلوں کو دیکھا۔

"میں سمجھتی تھی کہ محبت بے چین اور جلد بازی کروانے والی نہیں ہو گی۔"

"پھر کیسی ہو گی؟"

"بے چینی' سکون کا الٹ ہے۔ کھو دینے کا ڈر' تحفظ کا الٹ ہے۔ میں سمجھتی تھی محبت میں کھو دینے کا

ڈر نہیں ہوگا۔سکون ہوگا۔تحفظ ہوگا۔"

(وہ کار کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔اور کیف خاموشی سے ڈرائیو کررہا تھا۔کھڑکی کے باہر نہر کے ساتھ لگے درخت بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ہر طرف خاموشی تھی۔)

"میں سمجھتی تھی کی محبت کمفرٹیبل (پرسکون) کردینے والی ہوگی۔آنکھوں کی ٹھنڈک ہو جیسے۔ تحفظ کا احساس۔"

(وہ کار کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔اور وہ دھوپ میں کھڑی تھی۔قریب آئی تو دھوپ کا راستہ رک گیا۔ہر طرف چھایا تھی۔)

"میں سمجھتی تھی کہ میں اپنی محبت کے ساتھ جہاں بھی ہوں گی خوش ہوں گی۔مجھے خوشی کی تلاش میں ایک نئے شہر جاکے نئی زندگی نہیں بسانی پڑے گی۔"

(وہ دونوں عثمان کی بیٹھک میں موڑھوں پہ بیٹھے تھے سامنے مٹی کے پیالوں میں مہک اڑاتی چائے اور نان خطائیاں رکھی تھیں۔وہ چائے سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ مسکرا کے اسے سن رہی تھی۔)

"دیکھو میری ارینج میرج ہوئی تھی۔میرا تجربہ مختلف تھا۔" صفورا کے چھری کانٹا چلانے کی آواز سے کوئی فسوں سا ٹوٹا۔وہ چونک کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ بے چینی وغیرہ شادی سے پہلے ہوتی ہے۔شادی کے بعد زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ایک ہی انسان سے روز لڑائی اور روز صلح ہوتی ہے۔وہ ایک اچھا انسان ہے۔تمہیں خوش رکھے گا۔ویسے بھی مرد کی شکل کون دیکھتا ہے۔"

"شکل؟" وہ ایک دم چونکی۔"زیاد کی شکل کو کیا ہوا؟"

"نہیں دراصل......" صفورا گڑبڑا گئی۔"میرا مطلب تھا۔تمہارے مقابلے میں بہت پرکشش چارمنگ نہیں ہے لیکن اچھا ہے۔ڈیسنٹ ہے۔اور شکلیں کہاں میٹر کرتی ہیں یار۔اخلاق اچھا ہونا چاہیے۔"

"یعنی تمہیں وہ نارمل لگتا ہے؟" وہ قدرے خفا ہوئی اور اپنے کھانے پہ جھک گئی۔"مجھے تو وہ بہت ہینڈسم لگتا ہے۔"

"یہی تو محبت ہے۔نارمل انسان بھی بہت اچھا لگتا ہے۔" صفورا ہنس دی تو وہ بھی مسکرادی۔

"زیاد تھوڑا تلخ ہے۔اس کی منگیتر کی موت کا ٹراما ابھی تک تازہ ہے۔لیکن مجھے یقین ہے کہ محبت سے اس کو فکس کرلوں گی۔"

اس بات پہ صفورا چونکی۔پھر کھنکھاری۔"مالا... کوئی عورت کسی مرد کو بدل نہیں سکتی۔نہ heal کرسکتی ہے۔نہ فکس کرسکتی ہے۔شادی کے بعد وہ بدلے گا نہیں۔تھوڑا بہت تمہارے طریقے پہ ڈھل جائے گا۔"

ویٹر ڈرنکس کی ٹرے اٹھائے ان کے قریب آیا اور ادب سے ایک گلاس صفورا کے سامنے رکھا۔

"غلط۔محبت انسان کو بدل بھی سکتی ہے اور فکس بھی کرسکتی ہے۔محبت ہی تو heal کرتی ہے۔یہ سب سے بڑا مرہم ہوتی ہے۔" وہ مسکرا کے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔صفورا کچھ کہنے لگی تھی لیکن اسی وقت ویٹر دوسرا گلاس رکھنے جھکا ہی تھا کہ گلاس ہاتھ سے پھسلا۔بہت سا منٹ مارگریٹا کشمالہ کے کندھے پہ جاگرا۔

"اندھے ہو کیا؟ دیکھ نہیں رہے؟" صفورا ایک دم غرائی۔

"صفورا... اٹس اوکے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔پھر نیپکن اٹھایا اور پرسکون انداز میں اپنا کندھا صاف کیا۔

"سوری میم۔رئیلی سوری۔" کمزور سا ویٹر گھبرا کے جلدی جلدی معذرت کرنے لگا۔

"کوئی بات نہیں۔ دوسری ڈرنک لے آئیں۔میں اسے واش کرلیتی ہوں۔" وہ نرمی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ ریسٹ روم سے واپس آئی تو دیکھا' صفورا کے پاس منیجر اور ویٹر کھڑے معذرت کررہے تھے۔اور وہ خفگی سے ان کو ڈانٹ رہی تھی۔

"اٹس اوکے' صفورا۔جانے دو۔" وہ واپس بیٹھی اور ان کو جانے کا اشارہ کردیا۔صاف نیپکن گود میں بچھایا۔پھر محسوس ہوا' صفورا اسے ناراضی سے گھور رہی تھی۔

"اسے سزا ملنی چاہیے تھی' مالا! ورنہ سیکھے گا کیسے؟"

"اس نے میرا کارڈیگن خراب کیا۔اور تمہاری ڈانٹ نے اس کا پورا دن خراب کردیا۔حساب برابر۔اب اپنی انا کے پیچھے میں کسی غریب کو اس کی نوکری سے نہیں نکلوا سکتی۔"

وہ پلیٹ اپنی طرف کھسکائے' کھانا وہیں سے شروع کرچکی تھی۔

"انا کہاں سے آگئی درمیان میں؟" صفورا خود بھی ریستوران مینیجر تھی۔اس کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

وہ جواباً دھیرے سے ہنس دی۔

"ہنسی کیوں؟"

"کچھ نہیں۔کچھ یاد آگیا تھا۔" وہ مسکراہٹ دبائے سر جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔اس کا دل اب ہلکا پھلکا تھا۔وہ درست فیصلہ کررہی تھی۔

☆☆☆

"ناممکن۔ایک دم ناممکن ہے۔"

روم نمبر ۵۵۵ کی کھڑکی کا بلائنڈ اوپر اٹھا تھا جس کے باعث بظاہر تیز لیکن درحقیقت ٹھنڈی دھوپ اندر داخل ہونے کا راستہ بنا چکی تھی۔سورج کسی ہمسایہ عمارت کی اوٹ میں تھا' اس لیے دھوپ کا رخ ترچھا تھا۔وہ صرف کھڑکی کے ساتھ رکھے کاؤچ تک پہنچ پا رہی تھی جس پہ بیریل فرید چپ چاپ' گہری سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا۔

دیوار پہ لگے کاغذ' میزوں پہ بکھرے دستے'

سب کچھ ایسے صفائی سے سمیٹا جا چکا تھا کہ جیسے کچھ پھیلایا ہی نہ ہو۔ ماہر بیڈ کی ٹیک سے کمر ٹکائے ٹانگیں لمبی کیے نیم دراز تھا۔ سر پیچھے تکیے پر تھا اور آنکھیں دائیں بائیں ٹہلتے چنگیز پہ جمی تھیں۔

"ناممکن۔ کوئی کسی پہ محبت کا جادو کیسے کرسکتا ہے؟" چنگیز جھنجلا گیا تھا۔

"جیسے شمس نے میری ماں پہ کروایا تھا۔"

"ہوسکتا ہے تمہاری ماں کو شمس کی کوئی خوبی اچھی لگی ہو۔"

"شمس میں کوئی خوبی نہیں تھی۔" وہ سپاٹ نظروں سے چنگیز کو دیکھ رہا تھا۔ "سرکار اس جادو میں ماہر ہے وہ کسی پہ بھی سحر عشق کروا سکتا ہے۔"

"سرکار کا کوئی ای میل ایڈریس نہیں مل سکتا؟ میرے تو سارے مسئلے حل ہوجائیں۔" سوچ میں ڈوبا بیربل کھنکھارا۔ لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم سرکار اس جادو میں ماہر ہے؟" چنگیز اب مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ماہر نے شانے اچکائے۔

"میں نے دو جمع دو چار کیا ہے۔ اس البم میں میری ماں کی تصویر بھی تھی' اور کشمالہ کی بھی۔ میں سمجھتا تھا کہ البم والی عورتوں کو سرکار نے مروادیا ہے یا مرواتا ہے۔ اس لیے میں کشمالہ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے ساتھ وہ نہ ہو جو میری ماں کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن میں غلط تھا۔" اس نے تیخ کی آواز نکالی۔ گویا خود پہ افسوس کیا۔

"یعنی البم والی عورتوں پہ دراصل سرکار نے جادو کیا تھا؟"

"بالکل۔ اس نے مختلف کلائنٹس کے لیے مختلف عورتوں پہ سحر عشق کیا تھا۔ سرکار ایک ٹروفی کلیکٹر بھی ہے۔ اپنے ہر شکار کا حساب رکھتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ کوئی کسی کے دل میں اپنی محبت جادو کے ذریعے نہیں پیدا کرسکتا۔" چنگیز نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"درست۔" اس نے سر تائید میں ہلایا تو وہ دونوں چونک کے اسے دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب؟"

"سحر عشق کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئی انسان جادو کے ذریعے کسی کے دل میں اپنی محبت پیدا نہیں کرسکتا۔" وہ ٹیک لگائے" سنجیدگی سے ان سوالات کے جواب دے رہا تھا۔

"لیکن تم نے کہا، سحر عشق اثر کرتا ہے۔" سب سے زیادہ مایوسی بیربل فرید کو ہوئی تھی۔

"سحر عشق عشق نہیں ہوتا۔ سحر ہوتا ہے۔ ایک الوژن۔ محبت کا ایک سراب۔ ایک مصنوعی احساس جو ساحر محبوب کے دل میں جگاتا ہے۔ محبوب اس کو محبت سمجھتا ہے اور"... اس نے تھوک نگلا۔ "اور اپنے ساحر کو اپنی زندگی میں شامل کرلیتا ہے۔ جیسے ہماری ماں نے کیا۔"

"ایک ہی بات ہے۔ محبت ہو یا اس کا احساس۔"

"ایک بات نہیں ہے' بیربل! محبت ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔ سحر الوژن ہے۔ دور سے لگتا ہے سڑک پہ پانی پڑا ہے۔ لیکن قریب آؤ تو پانی نہیں ہوتا۔ صرف دھوپ کا الوژن ہوتا ہے۔"

"یعنی سحر عشق جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔" چنگیز نفی میں سر ہلاتے ہوئے کرسی پہ بیٹھا۔ "تم صرف زیاد سلطان سے جیلس ہو۔ اور ہسپتال کے اس بند کمرے کی قید نے تمہارے ذہن پہ برا اثر ڈالا ہے۔"

"ایسے مت کہو چنگیز۔" بیربل برا مان گیا۔ "اس کے ذہن پہ اثر بہت پہلے سے ہے۔ ہسپتال کے کمرے کا کیا قصور؟"

ماہر نے جواباً بس ایک نظر اسے دیکھا اور کندھے اچکادیے۔

"واللہ ماہر فرید کبھی غلط نہیں ہوتا۔"

"تم یہ ثابت کرسکتے ہو؟" چنگیز نے ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ کہنے لگا لیکن چنگیز نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ "اور یہ مت کہنا کہ وہ ہینڈسم نہیں ہے۔ جب کسی لڑکی کو کسی آدمی سے محبت ہوجائے تو وہ اس کو ہینڈسم ہی لگتا ہے۔ میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ وہ بدصورت نہیں ہے۔"

"میں نے کب کہا، بدصورت ہے۔ صرف ہینڈسم نہیں ہے۔ وہ خود کو بدصورت سمجھتا ہے، اسی لیے اس نے جادو کا سہارا لیا ہے۔"

"کیا تم یہ ثابت کرسکتے ہو؟" اس نے چبا چبا کے اپنی بات دہرائی۔ "کیونکہ اگر وہ واقعی جادو کروا رہا ہے تو تمہیں اس لڑکی کو بچانا ہوگا۔ کیا کہہ کے بچاؤ گے؟ کہ واللہ ماہر فرید کبھی غلط نہیں ہوتا؟"

"میں ثابت کرسکتا ہوں۔" اس کا انداز اٹل تھا۔

"کیسے؟"

"نمبرز سے۔ سارے کھیل نمبرز کے ہیں۔" وہ پہلی دفعہ ہلکا سا مسکرایا۔ اس کے گال پہ لگے کٹ کا نشان ویسا ہی تھا البتہ چہرے کے نیل قدرے مندمل ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

"یعنی؟"

"میں اتنا جانتا ہوں کہ سرکار ایک ہائی پروفائل جادوگر ہے۔ اس کے کلائنٹس پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔ اور وہ بااثر لوگ ہیں۔ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔" اس نے ابرو سے پلستر میں لپٹی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔ "کیونکہ وہ امیر لوگ ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ سرکار اپنے کام کی بھاری فیس لیتا ہے۔ زیاد نے بھی دی ہوگی۔ ہے نا؟"

"زیاد کی بینک اسٹیٹ منٹ۔" چنگیز نے چونکا۔ "یقیناً کوئی منی ٹریل ہوگا۔"

"جادوگروں کو عموماً ماہانہ پے منٹ کی جاتی ہے۔ زیاد کے اکاؤنٹ سے ہر مہینے ایک خاص رقم کی ٹرانزیکشن کی جاتی رہی ہوگی۔ مجھے صرف اس اکاؤنٹ کو ڈھونڈنا ہے جہاں وہ رقم جاتی ہوگی۔"

"کیا معلوم وہ کیش دیتا ہو؟"

"ہاں ہوسکتا ہے۔ لیکن تب بھی ہر ماہ اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے کا اندراج ہوگا۔ یوں میری بات ثابت ہوجائے گی۔"

"اس کے بینک اکاؤنٹس دبئی اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہوں گے۔ اسٹیٹمنٹ کیسے نکلواؤ گے؟" چنگیز اب اس کی بات پہ سوچنے لگ گیا تھا۔

"اس کی فکر مت کرو۔" بیربل ہنسا۔ "ہمارے پاس ایک ایسا انسان ہے جو کسی کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرکے دے سکتا ہے کیونکہ اس کے ہر اہم ملک کے ہر اہم عہدے پہ دوست موجود ہوتے ہیں۔"

"کون؟" چنگیز چونکا۔

"زارا۔" وہ اب سر جھکائے زارا کو میسج لکھ رہا تھا۔

چنگیز بڑبڑا کے رہ گیا۔

"ویسے جنرل نالج کے لیے پوچھ رہا ہوں"... بیربل سرسری سے انداز میں کھنکھارا۔ "سرکار کی فیس کتنی ہوگی؟"

"بیربل۔" اس کی آواز بلند ہوئی۔ بیربل نے فوراً سے ہاتھ اٹھادیے۔

"مذاق کررہا تھا یار۔" پھر کسی خیال سے چونکا۔ "تم نے کہا سحر عشق کا انجام بہت بھیانک ہوتا ہے؟ مگر کیسے۔"

ماہر فرید نے ایک گہری سانس کھینچی۔ اور پھر وہ کہنا شروع ہوا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆



وردہ گل

من مست مگن

''کیا وہ میرے ساتھ خوش ہوگی؟''
گجرے خریدتے وہ رکا۔
''کیسے خوش ہوگی بھلا...... کہاں تم غریب، ایک چھوٹے سے مکان کے مالک، کہاں وہ بڑی سی کوٹھی کی مکین...... ایک امیر گھرانے کی لڑکی، امیر باپ کی امیر بیٹی۔
اس کے دل نے اس کو آئینہ دکھایا۔
وہ سر جھٹک کر گجرے لیے بائیک پر سوار ہوا۔
''ایک دن کی نئی نویلی دلہن کے لیے خالی ہاتھ گھر جانا عجیب سا لگے گا ناں!''
وہ بائیک پر سوار، بالوں کو ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ کرتا، دل ہی دل میں خود سے مخاطب ہوا...... پھر زیرلب مسکرا دیا۔

اس کو کل کا دن یاد آیا۔ کیسے وہ اس کی دلہن بنی تھی! وہ اس کی یونی ورسٹی فیلو تھی...... خوب صورت سی...... بلیک حجاب لیے...... اپنے آپ میں مگن رہنے والی...... ذرا ذرا سی بات پر چونک جانے والی......
اس کے کلاس فیلو دو لڑکے جو بے حد رنگین مزاج تھے...... وہ بھی شاید ان ہی اسٹوڈنٹس کی طرح تھے جو یونی میں پڑھنے کی غرض سے نہیں، بلکہ آزادی حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں...... اور اپنے رنگین شوق پورے کرنے کے لیے یونی میں داخلہ لیتے ہیں......!
وہی دو لڑکے عادل کو کھٹکتے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر چونک جانے والی لڑکی ان کی رنگین مزاجی...... وہ عجیب طرز سے سیٹیاں مارتے، اس کو ''معصوم'' کہہ کر مخاطب کرتے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر خوب ہنستے، ہاتھوں پر ہاتھ مارتے، قہقہے لگاتے...... عجیب نظروں سے دیکھتے۔
حیا کی نیچر اس کے شریف خاندان سے تعلق ہونے کا بتا دیتی تھی اور عادل جانتا تھا کہ وہ ایک بے حد سلجھی ہوئی اور شریف لڑکی ہے۔
وہ اس دن پہلے کی نسبت جلدی یونی آگیا تھا...... وہ تیز تیز قدم بڑھا رہا تھا کہ اس کو سامنے لان میں وہی دو لڑکے دکھائی دیے۔ وہ سہمی ہوئی حیا سے چھیڑ خانی کر رہے تھے جبکہ وہ بنچ پر خود میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔
عادل کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ ان دونوں کے بالکل پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا کہ ان کو اندازہ تک نہ ہوا۔
''سویٹی! کیا تم آج میرے ساتھ لنچ پر چلو گی؟ میں تم کو کھانا بھی کھلاؤں گا اور کہیں گھمانے کے لیے بھی لے کر جاؤں گا۔''
ایک لڑکے نے اس کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''ارے میری جان! اس کی کمپنی تم کو بور کر دے گی۔ آئی سوئیر...... تم میرے ساتھ چلنا...... بہت انجوائے کرواؤں گا۔''
دونوں نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔
ان دونوں کے پیچھے کھڑا عادل جانے کیا سوچ کر ان پر جھپٹ پڑا۔ وہ بھی اس کو مارنے کو دوڑے اچھا خاصا ہاتھا پائی والا تماشا شروع ہو گیا تھا جب کچھ سینئر اسٹوڈنٹس نے آ کر لڑائی ختم کروائی۔
وہ بلیک حجاب والی، حیا ڈری سہمی سی ایک جانب کھڑی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں کو چھپانے کی ناحق کوشش کرتی وہ گھبرائی ہوئی تھی۔
پتا نہیں کیسے اس سے چھوٹی بہن تک یہ خبر پہنچ گئی اور......! اور یہیں سے تو کہانی شروع ہوئی تھی!
گھر جا کر اس نے بات کیا بنا کر پیش کی یہ تو وہ بلیک حجاب والی حیا کو ہی معلوم تھا...... اسی لیے تو عادل کا بلاوا آیا تھا۔
وہ ان کے گھر گیا تھا...... کیا خوب صورت بنگلہ تھا۔ محل نما...... وہ تو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
اس کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا...... وہ ادھر ادھر دیکھتا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس پر عجیب انکشاف ہوا۔
حیا کی مما پوچھ رہی تھیں کہ ان دونوں کا کب سے چکر چل رہا ہے؟
وہ واقعتاً حیران ہوا تھا کیا ان کو اپنی بیٹی کی پاکیزگی دکھائی نہیں دیتی؟ لیکن نہیں...... اس پر مزید ایک اور انکشاف ہوا۔
وہ اس کی سوتیلی ماں تھیں، اس کی شکایت اس کی سوتیلی بہن نے لگائی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں کی باتوں سے لگ رہا تھا وہ ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔
وہ اس کے سگے باپ کو بھڑکا چکی تھیں، اس کو وہیں اندازہ ہوا تھا۔ وہ حیران تھا ایک۔ اس کی حیرانی مزید حیرت میں بدل گئی، جب اس کو کہا گیا کہ وہ حیا سے نکاح کر لے، وہ اس کو اب مزید اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتے۔
اس کو پتا ہی نہ چلا کب اس نے اس سے نکاح کے لیے ہامی بھری، کب اس کا نکاح ہوا اور کب وہ اس کو لے کر اپنے گھر آیا...... پتا ہی نہ چلا۔
لیکن ایک بات کا اس کو وہیں پر اندازہ ہوا اور شدت سے ہوا تھا کہ......
اس کو حیا سے محبت ہوئی تھی...... وہیں یونی ورسٹی میں...... اس کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔
بارش کا ایک قطرہ اس کے ہاتھ پر گرا تو وہ چونک کر حال میں واپس آیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بارش تیز ہو گئی تھی۔ اس نے بائیک کی اسپیڈ بڑھا دی۔
''کیا وہ یہ گجرے پہن لے گی؟''
ایک مزید سوچ اس کے ذہن میں ابھری۔
''وہ تو میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے، کجا کہ گجرے۔''
بارش مزید تیز ہو رہی تھی۔
''گجرے خراب نہ ہو جائیں بارش کی وجہ سے، جلدی گھر پہنچنا ہوگا مجھے۔'' اس نے سوچوں کو جھٹکا۔
وہ گھر تک آ چکا تھا...... آہستگی سے دروازہ کھولتا اندر داخل ہوا تو ایک دلکش منظر اس کا منتظر تھا۔
وہ بارش میں بھیگتی گول گول چکر کاٹتی ہتھیلیوں میں بارش کا پانی بھرتی...... گنگنا رہی تھی۔
''دیکھ کل نہ مجھ کو سہائے
تجھ سنگ سوکھی روٹی بھائے
وہ کافی دیر تک ٹک ٹک اس کو دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر سر جھٹکا، گجرے لیے اس کے پاس چلا آیا۔
کچھ دیر بعد کے منظر میں، صحن کے بیچوں بیچ...... وہ دونوں کھڑے...... آسمان کو تکتے...... مسکراتے ہوئے...... گنگنا رہے تھے۔
''من مست مگن
من مست مگن
بس تیرا نام دہرائے

☆☆

فائزہ جمال طارق

ابھی کچھ پھول کھلنے ہیں

در شہوار کو ہمیشہ سے لگتا تھا اس کے رشتے اس کی سب سے بڑی طاقت ہیں، اس کا مان، اس کی ڈھال، اس کے لیے چھپر چھاؤں، ضرورتیں تو بنا کہے پوری ہو جاتیں لیکن اپنی چھوٹی بڑی خواہشات بھی وہ ان سے منوا ہی لیتی، کبھی پاؤں پٹخ کر کبھی رو دھو کر اور کبھی بھوک ہڑتال کر کے۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن یہی رشتے اس کی سب سے بڑی کمزوری بن جائیں گے۔ ان کی محبت کے آگے وہ اتنی مجبور ہو جائے گی کہ ایک ان چاہے فیصلے کے لیے اپنا سر جھکا دے گی۔

مکمل ناول

کچھ دن پہلے تک سب ٹھیک تھا۔ اگر ٹھیک نہ بھی ہوتا تو اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس کی رنگوں سے کھیلنے کی عمر تھی۔ بے فکری کی خوش نما تتلی کے رنگ اپنی پوروں پر اترتے دیکھ کر خوش ہوتی زندگی کے سیاہ، کڑوے، کسیلے رنگوں سے نا آشنا رہی تھی۔

لیکن اچانک بے فکری کی وہ تتلی اپنے خوش نما رنگ سمیٹ کر کہیں دور اڑان بھر گئی۔ اس کی پوروں پر اترتے رنگ آہستہ آہستہ معدوم ہوتے غائب ہو گئے۔ وہ شوخیاں، وہ شرارتیں کسی اڑن کھٹولے میں سوار دور دیس سدھار گئیں۔ زندگی کا نیا روپ دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جولائی کے حبس زدہ چپچپے سے دن تھے۔ مون سون بارشوں نے ہر طرف جل تھل سی کر دی تھی لیکن جیسے ہی بارش رکی، ہوا دم سادھ لیتی۔



پیڑ، پودے، بچے سب ساکن، اور مچھروں کی یلغار دھاوا بولنے کو ہر دم تیار، مکھیاں صاف جگہ پر بھی یوں ٹوٹ پڑتیں جیسے وہاں کسی نے شیرہ گھول کر پھیلا دیا ہو۔ ہر طرف نمی، سیلن کی عجیب سی باس اندر شہوار کو یہ موسم سخت برا لگتا۔

"نجانے لوگوں کو اس ساون میں کیا چارم نظر آتا ہے۔" کوفت کے مارے دوپٹے کے پلو سے چہرے کا پسینہ پونچھتے اس نے کڑھ کر سوچا۔ لائٹ چلی گئی تھی، وہ چھت پر اوگھتے پنکھے کو گھورتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

بارش تھم گئی تھی۔ اکا دکا بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ایسے میں کچن سے اٹھتی پکوڑوں کی اشتہا انگیز مہک، وہ صحن میں کہیں کہیں جمع شدہ بارش کے پانی کو پھلانگتی کچن میں آ گئی۔

محبت برساد ہے تا تم ساون آیا ہے
تیرے اور میرے ملنے کا موسم آیا ہے

صدف بہت مگن انداز میں گنگناتی پکوڑے تل رہی تھی

"آپا! آج آپ نے کیسے کچن کو رونق بخش دی؟" اس نے ایک گرم گرم پکوڑا اٹھاتے ہوئے شرارت سے صدف سے پوچھا۔

"ساون پکوڑوں اور چائے کے بغیر ادھورا ہے۔" صدف نے احتیاط سے پکوڑے نکالتے ہوئے پلیٹ میں رکھے۔ اسی وقت شہوار نے کچن کی کھلی کھڑکی سے سبکتگین کو دادی کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ شرارت سے مسکرائی۔

"یوں کہو نا دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ تمہارے دل نے تمہیں پہلے ہی سبکتگین بھائی کی آمد کے بارے میں گرین سگنل دے دیا تھا۔ ہے نا؟"

صدف نے اسے گھورا۔ "فضول مت بولا کرو۔"

"لو خواہ مخواہ! اس میں کیا فضول بات ہے؟ مجھے تو لگتا ہے وہ یہاں آتے ہی تمہارے لیے ہیں۔ دادی بے چاری ایویں خوش ہوتی رہتی ہیں کہ نواسا اپنی ڈھیر ساری مصروفیات چھوڑ کر ان کی محبت میں دوڑا چلا آتا ہے۔ ہائے میری معصوم دادی......"

ایک اور پکوڑا منہ میں رکھتے ہوئے شہوار نے اسے کہنی ماری۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ ابھی گرم تیل میرے ہاتھوں پر گر جاتا......"

کفگیر دوسری پلیٹ میں پٹختے صدف نے برہم ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"سوری...... میں تو...... میں......" شہوار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اتنا غصہ کس بات پر آیا ہے؟ خوب صورت چہرے پر ناگواری کے تاثرات لیے، باقی ماندہ پکوڑے پلیٹ میں نکال کر اس نے بے زاری سے چولہا بند کر دیا۔

"اب ایسے کیوں کھڑی ہو؟ پکوڑے اٹھاؤ اور اندر دے آؤ سب کو۔"

دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھتی وہ باہر نکل گئی تھی۔ شہوار نے لمحہ بھر کے لیے اس کے اچانک بگڑتے خراب موڈ کی وجہ سوچنا چاہی پھر پلیٹ اٹھا کر دادی کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں سبکتگین ماں کی خراب طبیعت کے بارے میں دادی کو تفصیل سے بتا رہا تھا۔ شوگر، بلڈ پریشر اور اب یہ مواد ل......

دادی کے چہرے پر تفکر کے گہرے سائے منڈلانے لگے تھے۔ بیٹی کی خراب طبیعت کا سن کر دل کی بے چینی حد سے سوا ہو گئی۔

"شام کو چلیں گے اماں! سویرا آپا کی طرف۔" بہو کے کہنے پر انہوں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"السلام علیکم سبکتگین بھائی!" شہوار نے اندر آتے ہوئے زوردار سلام جھاڑا تھا۔ سبکتگین نے سر کو ہلکا سا خم دے کر جواب دیا۔

"بڑے اچھے وقت پر آئے ہیں۔ پکوڑے کھائیں اور اس چیچے، حبس زدہ ساون کا مزہ دوبالا کریں۔"

اس نے پلیٹ درمیانی میز پر رکھ دی پھر قدرے نازدارانہ انداز میں بولی۔

"صدف نے بنائے ہیں۔"

سبکتگین نے بنا کسی تاثر کے پکوڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔ شہوار جی بھر کے بدمزہ ہوئی۔

"سٹریل نہ ہو تو، بندہ اپنی منگیتر کے ذکر پر تھوڑا سا مسکرا ہی دیتا ہے۔"

وہ منہ بناتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ کچن میں جا کر ابا کے لیے الگ سے نکالے گئے پکوڑوں کی پلیٹ اٹھا کر ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ابا وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے نجانے کب سو گئے تھے۔

ابا ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے۔ ان کے بھلے چنگے زندگی سے بھرپور ابا کی پوری ہستی کو، اس بھیانک روڈ ایکسیڈنٹ نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

جان تو بچ گئی لیکن دونوں ٹانگوں سے معذوری انہیں وہیل چیئر پر لے آئی تھی۔

ابا کی جگہ پر کاشف کو بھرتی کرا لیا گیا تھا۔ یوں زندگی کا پہیہ ایک بار پھر رواں دواں ہو گیا تھا۔ ابا مشکل سے ہی سہی زندگی کی طرف لوٹ آئے تھے۔

ان کے قریب میز پر پکوڑے رکھ کر کھڑکی وہ بالکنی میں آ گئی۔ گیلری کی کھڑکیاں کھولیں تو نمی سے بوندوں سے لبریز ہوا کا جھونکا اسے گدگدانے پر مجبور کر گیا تھا۔

"ساون اتنا بھی برا نہیں ہے۔"

بارش کے پانی سے لبالب بھرے آب خوروں میں چونچیں مارتی بھوری چڑیوں کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

"بارش ہو رہی ہے؟" ابا نے کھلی کھڑکی کے پار جھانکا۔

"اب تو رک بھی گئی ابا!" شہوار نے پیچھے سے آ کر ان کی وہیل چیئر تھامی۔

"میں آئی تھی آپ کو دیکھنے آپ سو رہے تھے۔" آہستگی سے وہیل چیئر گھماتی وہ انہیں باہر لے آئی تھی۔ انہیں تازہ چائے کا کپ بنا کر دیا۔ اماں نے آلو گوشت کا گاڑھے شوربے والا سالن بنایا تو ایک کٹورے میں، سویرا پھپھو کے لیے بھی نکال لیا اور سبکتگین کے لیے سوجی کا حلوہ اسے بہت پسند تھا۔

دادی ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی اپنے تخت پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی تھیں۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" ابا نے پوچھا۔ تو دادی انہیں پھپھو کی خراب طبیعت کا بتانے لگیں۔ ابا کے چہرے پر دکھ ہلکورے لینے لگا تھا۔ مطلقہ بہن کی تکلیف کا سن کر وہ یونہی تڑپ اٹھتے تھے۔ وہ ابا کو بہت عزیز تھیں۔ شہوار آج تک اندازہ نہیں لگا پائی تھی کہ پھپھو ابا پر زیادہ مرتی تھیں یا ابا پھپھو پر زیادہ جان چھڑکتے تھے۔

وہ چادر لینے کے لیے اپنے کمرے میں آئی تو صدف کل کے لیے اپنا سوٹ استری کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے کسی سے بات کرتے کرتے بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ شہوار کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ کچن والی صدف سے بالکل مختلف مطمئن، سرشار...... شہوار پر نگاہ پڑی تو ہوں۔ ہاں میں بات کرنے کے بعد موبائل رکھ دیا۔

"ہم پھپھو کی طرف جا رہے ہیں، ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تم چلو گی؟" الماری سے چادر نکالتے ہوئے شہوار نے پوچھا۔

"میں کیوں جاؤں گی وہاں؟"

"ہاں تم تو اب ایک ہی دفعہ جاؤ گی وہاں، رخصت ہو کر۔"

صدف بنا کوئی جواب دیے جما جما کر اپنا سوٹ استری کرتی رہی۔ شہوار چادر اوڑھتی باہر آ گئی۔ اماں اور دادی بیرونی دروازے کے پاس کھڑی اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

ناظم صاحب کی مہربانی کے طفیل کچھ عرصے پہلے مین نالی لگا کر ان کی گلی کی از سر نو مرمت کی گئی تھی۔ اب بارش کا پانی ٹھہرتا نہیں تھا۔ لیکن پھپھو کی گلی کا موڑ مڑتے ہی صورت حال بدل گئی۔ گلی میں جگہ جگہ چھوٹے گڑھے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ ابلتی نالیوں سے اٹھتا تعفن...... شہوار نے بے ساختہ دوپٹے کا پلو ناک پر رکھ لیا۔

"کاشف کا انتظار کر لیتیں اماں۔ وہ بائیک پر آپ کو چھوڑ آتا۔ اب کیسے اتنے فاصلے پر کیچڑ میں رکھی اینٹوں پر قدم رکھ کر جائیں گی؟"
اماں نے تشویش سے پیچھے مڑ کر دادی سے کہا تو وہ جھلا کر بولیں۔
"بائیک پر بھی جانے کا بھلا کہاں راستہ ہے۔ راستے میں پھسل کر گر جاتی تو اور مصیبت......"
شہوار نے مضبوطی سے دادی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھپھو کے دروازے پر پہنچنے تک انہیں دانتوں پسینہ آ گیا۔ دادی نے ہانپتے کانپتے اندر قدم رکھا۔ سامنے ہی صحن میں تخت پر چت لیٹی بیٹی پر نگاہ پڑی تو دل کٹ کر رہ گیا۔
وہ انہیں دیکھ کر فوراً اٹھی تھیں۔
"اماں! آپ لوگوں نے کیوں تکلیف کی۔ ایسے موسم میں...... اوپر سے راستہ بھی خراب تھا۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" چہرے پر کھنڈی زردی صاف بتا رہی تھی وہ کتنا ٹھیک تھیں۔
شہوار نے سب سے پہلے صحن میں ایک طرف بنے کمرے میں جا کر اپنے پاؤں دھوئے تھے۔
"توبہ پھپھو! آپ کی گلی نے تو ہمارے پسینے نکال دیے۔"
وہ پائنچے جھٹک کر نیچے کرتی وہ تخت پر ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔
"ناظم صاحب نے اس طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں کیا؟"
"سبکتگین بتا رہا تھا ناظم کا پٹواری سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے جان بوجھ کر نہیں بنوا رہا ہے گلی......"
پھپھو بتاتے بتاتے ہنسیں۔ آواز سے نقاہت نمایاں تھی۔
"ووٹ مانگنے تو کیسے دوڑے چلے آتے ہیں۔" دادی نے دونوں پاؤں اوپر کر لیے تھے۔
"میرا تو دل چاہ رہا تھا آپ کی گلی کی ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر وائرل کر دوں۔"
شہوار کے تپ کر کہنے پر پھپھو خفیف سا ہنس دی۔

"سبکتگین کہاں ہے؟" اماں کچن میں کھانے کے ڈبے رکھ کر آئیں تو پوچھنے لگیں۔
"شام میں ایک کوچنگ سینٹر میں پڑھانے جاتا ہے۔" بیٹے کے ذکر پر ان کے زرد چہرے پر ایک ساتھ کئی سرسوں کے پھول کھل اٹھے تھے۔
شہوار کی نظر اب صحن میں بارش اور ہوا سے گری ڈھیر ساری جامنوں پر پڑی تھی۔ وہ کچن سے ٹوکری اٹھا لائی اور ایک ایک کر کے چننے لگی۔
"اف اللہ! اتنی میٹھی اور ڈھیر ساری جامنیں۔ میں یہاں ہوتی تو پورے محلے میں بانٹ کر مفت کا ثواب کماتی۔"
اس کا باآواز بلند پرجوش سا تبصرہ بیرونی دروازے سے اندر آتے سبکتگین کے کانوں تک بھی پہنچ گیا تھا۔
"یہ نیک کام تم اب بھی کر سکتی ہو۔"
مٹھی بھر جامنیں ٹوکری میں ڈالتے شہوار نے اسے دیکھا پھر مسکراہٹ دبا کر بولی۔
"جب صدف یہاں آ جائے گی تو وہ اور میں مل کر کریں گے۔"
سبکتگین آگے بڑھ گیا تھا وہ ٹوکری اٹھا کر جامن دھونے کی غرض سے واش بیسن کی طرف آ گئی۔

☆☆☆

برآمدے میں کھڑی بائیک کاشف کی گھر واپسی کا بتا رہی تھی۔
آسمان ابھی بھی گہرے کالے بادلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے پورے شہر میں ریل گاڑیوں کی آمدورفت کا شیڈول بری طرح متاثر ہوا تھا۔
اس لیے اس کی گھر واپسی کا ان دنوں کوئی مخصوص وقت مقرر نہیں رہا تھا۔ ابا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔
شہوار اندر آئی تو صدف دونوں ٹانگیں سیدھی کیے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے "پہناوا" بوتیک کے

نئے جاری کردہ میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔
"پوچھو گی نہیں وہاں کا؟"
شہوار نے اپنے سنگل بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اسے دیکھا۔
"نہیں۔" صدف نے بغیر نگاہیں اٹھائے مختصراً بولی۔ "کیونکہ میں جانتی ہوں تم ویسے ہی بتا دو گی۔"
"اور اگر نہ بتاؤں تو؟"
"تو پھر تمہاری مرضی۔" صدف نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ شہوار چڑ گئی۔
"تم ایسی کیوں ہوتی جا رہی ہو صدف؟"
"کیسی؟" کمال کا تجاہل عارفانہ برتا گیا۔
"جیسی پہلے نہیں تھیں۔" شہوار نے بے دھڑک کہہ دیا۔
صدف اس وقت بی ایس سی کے سال اول میں تھی جب روڈ ایکسیڈنٹ میں ابا کی دونوں ٹانگیں چلی گئیں۔ گھر میں ہر وقت سوگواریت کی فضا چھائی رہتی۔ ایسے میں اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا۔
وہ ایک دلکش شخصیت کی مالک تھی۔ ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ رہتی۔ اس کی کالج کی بہترین دوست نایاب نے اپنی آنٹی زرقا سے سفارش کر کے ان کے بوتیک "پہناوا" میں اسے جاب دلوائی۔ معقول تنخواہ تھی۔ کام بھی صدف کی طبیعت سے میل کھاتا تھا۔ اس نے بہت جلدی ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔
لیکن اب کچھ عرصے سے اس کے بدلے بدلے تیور شہوار کو تشویش میں مبتلا کر گئے تھے۔ بظاہر کوئی قابل گرفت بات نہیں تھی۔ لیکن کچھ ایسا ضرور ہوا تھا۔ جس نے شہوار کو چونکا دیا۔ لیکن کیا؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ صدف دن بہ دن ایک پہیلی بنتی جا رہی تھی۔
موبائل پر میسج کی ٹون بجی تو وہ ٹچ اسکرین پر انگلی پھیرتی دلکشی سے مسکرا دی۔ گویا اس وقت وہ خود سے ذرا فاصلے پر بیٹھی شہوار کی موجودگی سے بھی غافل ہو گئی تھی۔

شہوار نے گہری سانس کھینچتے اپنے کندھوں سے ذرا نیچے آئے گھنگھریالے بالوں کو سفید نقطوں والی سیاہ ہیئر پٹی سے آزاد کیا اور منہ تک چادر تان کر چت لیٹ گئی۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے سر؟"
سبکتگین نے اپنے ہاتھ میں تھامے نوٹ ایک بار پھر گنے۔ "نو ہزار چالیس روپے؟"
"ایک ماہ کے پندرہ ہزار بنتے تھے سر!" اسے لگا شاید ادھیڑ عمر پروفیسر شکیل سے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کی بات پر وہ ہنس پڑے۔
"برخوردار! اس ایک مہینے میں تم نے چار چھٹیاں کیں، دو ہاف لیو اور ایک بار......"
وہ گہری سانس بھرتا سنتا رہا۔ پروفیسر شکیل اسے ان پندرہ ہزار میں سے کی جانے والی کٹوتیوں کے بارے میں بتانے لگے تھے۔
"تمہارے ساتھ برتی جانے والی نرمی کے پیچھے سب سے بڑی وجہ طلبا کی اکثریت کا تمہارے پڑھانے کے انداز سے مطمئن ہونا ہے۔ ورنہ ہمارا ادارہ اتنی بے قاعدگیاں برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"
وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آیا تھا۔ مجبوریاں انسان کو شاید اسی طرح لاجواب کر دیتی ہیں۔ راستے میں پڑا ایک کنکر زور سے پاؤں کی ٹھوکر مار کر دور اچھالا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف جلتی اسٹریٹ لائٹز کی روشنیاں رات اترنے کا اشارہ دے رہی تھیں۔ شام باسی ہو کر تھوڑے سے مغرب کی گود میں سر رکھے سو گئی۔
اس نے اپنی روٹ پر جانے والی بس کا ہارن سن کر نظر انداز کر دیا۔ دل چاہ رہا تھا ناک کی سیدھ میں بس یونہی چلتا چلا جائے۔ اگر گھر میں اکیلی بیمار ماں کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہناتا۔ لیکن ماں کا خیال آتے ہی وہ قریب ترین میڈیکل اسٹور کی طرف بھاگا تھا۔

دوائیوں کا شاپر تھامے اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے گھر کے راستوں پر گامزن تھا۔ آسمان ہنوز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اس کے گھر پہنچنے تک بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں۔

"آج بہت دیر کر دی بیٹا؟"

اس کے انتظار میں جاگتی اماں اسے آتا دیکھ کر فوراً کھانا گرم کرنے لگی تھیں۔

"جی اماں! کوچنگ سے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔" گیلے ہاتھ تولیے سے پونچھتا وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اماں نے سامنے چھوٹی میز پر کھانا چن دیا۔ آلو گوشت کا مسالے والا سالن، رائتہ، سلاد، سوجی کا حلوہ......

"ممانی کو منع کر دیں آپ، وہ کیوں بھیجتی ہیں یہ سب کچھ؟"

اس کی کشادہ پیشانی پر ناگواری ابھر آئی تھی۔

"نہ ہم کسی کو خود سے محبت کرنے سے کیسے روک سکتے ہیں؟" انہوں نے پانی کا گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھا۔

"خدا جانے محبت ہے یا احسان؟" وہ کہہ نہ سکا۔ ماں کی دل آزاری کا خیال مانع تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا اماں کو اپنے اکلوتے بھائی اور اس سے وابستہ رشتے اپنے اکلوتے بیٹے سے کم عزیز نہیں تھے۔

کھانا ختم کر کے وہ اماں کے کمرے میں آ گیا تھا۔ جب سے ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اس نے ان کے کمرے میں ہی سونا شروع کر دیا تھا۔ انہیں معمول کی دوائیاں کھلا کر سلانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ جاتا۔

اس کا ایم ایس کا فائنل ایئر چل رہا تھا۔ صبح یونیورسٹی، شام کو کوچنگ، پھر رات گئے تک امتحان کی تیاری کرتا۔ بے حد مصروف، مشقت بھری زندگی گزارتے اتنا وقت گزر گیا تھا کہ اسے اب یہ بھی یاد نہیں رہا تھا آخری بار اطمینان سے بیٹھ کر چائے کب پی تھی؟

☆☆☆

شہوار کا ایف ایس سی فرسٹ ٹرم کا رزلٹ گھر میں چھوٹا سا طوفان لے آیا تھا۔

"ناک کٹوا دی ہے اس نے ہم سب کی......" زور سے کپڑا جھٹک جھٹک کر اپنی موٹر سائیکل کو چمکاتے کاشف کی بات پر اماں نے دہل کر اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"کیا کر دیا ہے اس نے؟"

"مر مر کر پاس ہوئی ہیں محترمہ۔" کاشف نے اپنی جیب سے اس کا رزلٹ کارڈ نکال کر لہرایا۔

"پاس تو ہو گئی ناں؟" شہوار نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے اپنا رزلٹ کارڈ اچکا تھا۔

"یہ سب اس کی نکمی سہیلیوں کی کمپنی کا اثر ہے جنہیں فلم، ٹی وی اور ڈراموں کو ڈسکس کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

"تمہیں جیسے بہت پتا ہے۔"

وہ کاشف سے ڈیڑھ سال ہی چھوٹی تھی۔ اور صدف ان دونوں سے بڑی تھی۔

"بتانے کے لیے یہ کافی ہے؟" کاشف نے اس کے رزلٹ کارڈ کی طرف انگلی کر کے جتایا۔

"بہو! میں تو کہتی ہوں اس کو گھر بٹھا کر کھانا پکانا، سینا پرونا ہی سکھا دو۔ یہ پڑھائی وڑھائی اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک وہ ہے بے چاری صدف جو اس کی بھاری فیس بھرنے کے لیے خوامخواہ پیسہ لٹائے جا رہی ہے۔"

تخت پر نیم دراز تسبیح کے دانے گراتی دادی کی بات پر وہ خفگی سے انہیں گھورنے لگی۔

"بات پیسوں کی نہیں ہے دادی! اسے اپنے مستقبل کی ذرا فکر نہیں ہے۔ الٹ پٹانگ کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتی ہے۔ پڑھائی کے لیے تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پڑھنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے ابھی سے کیا ٹینشن لینا۔"

صدف بوتیک جانے کے لیے تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ جاتے جاتے منہ

چِڑاتے کھڑی شہوار کو ملامتی نگاہوں سے دیکھا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ عین سامنے کھڑے سبکتگین پر نظر پڑی اس نے بھی اسی وقت اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ صدف نے اپنی نازک رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی اس کے پہلو سے نکل کر باہر چلی گئی۔ گریز کو حیا پر محمول کرتا وہ آگے بڑھ آیا تھا۔

"ارے سبکتگین بیٹا! وہاں کیوں کھڑے ہو؟ اندر آ جاؤ ناں۔" اماں کی اب اس پر نظر پڑی تھی۔

شہوار کو رونا آنے لگا۔ یقیناً اس کی بے عزتی کا لائیو شو انہوں نے بھی براہ راست ملاحظہ کیا تھا۔ وہ سرخ چہرہ لیے اندر کمرے میں گم ہو گئی۔

اب اس نے شام سے پہلے باہر نہیں نکلنا تھا۔

"نجانے کب ختم ہو گا اس لڑکی کا بچپنا؟"

اماں کی بڑبڑاہٹ دیر تک جاری رہی تھی۔

☆☆☆

صبح مطلع بالکل صاف تھا۔ بادلوں نے کہیں دور رخت سفر باندھ لیا تھا۔ در شہوار نے بے ساختہ دعا مانگی ان کا یہ سفر مزید طویل ہو جائے اور...... کم از کم اگلے دو تین ماہ تک وہ یہاں کا رخ نہ کریں۔

باہر ابا صحن کے ایک طرف کیاری میں اگے پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں کٹر پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے سے سہولت سے اپنی وہیل چیئر ادھر ادھر گھماتے اپنے کام میں بے حد مگن لگ رہے تھے۔

"آج کالج نہیں گئیں؟"

ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"اب ایک دن تو بنتا ہے ناسوگ منانے کے لیے؟" کاشف اور اس کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ اس نے چڑ کر کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی وہ بائیک کو کک مارتا بیرونی دروازہ پار کر گیا۔

"جب میں نے کہا تھا مجھے آرٹس پڑھنی ہے پھر زبردستی سائنس کیوں دلوائی گئی؟" اس نے کٹر ابا کے ہاتھ سے لیا تھا۔ مور پنکھ کے پھیلتے چوڑے پتوں کو کتاکٹ کتر ڈالا۔

"سائنس اور کمپیوٹر کے زمانے میں کون پوچھتا ہے آرٹس کو ہاں؟"

سارا دن چولہا چوکی سنبھالنے والی اماں کو بھی سائنس اور آرٹس کا فرق بخوبی معلوم تھا۔ جو دادی کو چائے دے کر خود بھی ان کے پاس تخت پر بیٹھ گئیں۔

"زور، زبردستی کرنے کا پھر یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے جب میرا دل ہی نہیں ہے سائنس پڑھنے کا۔"

لمبی اسٹریپ والا بیگ کندھے پر لٹکاتی صدف کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ بوتیک جانے کے لیے بالکل تیار......

دروازے پر گاڑی کا نامانوس سا ہارن سنائی دیا تھا۔

"تمہیں بوتیک سے اب گاڑی لینے کے لیے آتی ہے؟" ابا نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ابا! میری پروموشن ہو گئی ہے۔ تنخواہ میں اضافے کے ساتھ پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی مل گئی ہے۔ آپ کو بتایا تو تھا۔"

"اچھا؟" ابا نے خود کلامی کی۔ "مجھے تو یاد نہیں ہے۔ بھول گیا ہوں گا۔ بوڑھا بھی تو ہو گیا ہوں اب۔"

صدف چادر کندھوں پر پھیلاتی باہر چلی گئی تھی۔

"اللہ ہماری بچی کو مزید کامیابیاں عطا کرے!" دادی کی دعا پر اماں نے با آواز بلند "آمین" کہا تھا۔ جب کہ گل دوپہری کے پھولوں سے لدی بڑی کیاری پر نظریں جمائے شہوار سوچ گئی۔

"یہ راتوں رات ایسی کون سی پروموشن ہوئی ہے؟" وہ بڑبڑائی تھی۔

☆☆☆

صبح سبکتگین یونیورسٹی جاتے ہوئے ماں کو ان کے ہاں چھوڑ گیا تھا۔

تخت پر اونگھتی دادی ان کی آواز پر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ جنہوں نے چہرے پر رقم دکھ اور کسمپرسی کی داستان کو ہمیشہ کی طرح نرم مسکراہٹ کے لبادے میں چھپا رکھا تھا۔

دادی نے بہت چاؤ سے ان کا نام روشن سویرا رکھا تھا۔ شادی کے آٹھ سال بعد وہ ان کی بے رنگ تاریک زندگی میں روشن سویرا بن کر ہی تو آئی تھیں۔ دو سال بعد ابتجاج محمد کی پیدائش بھی ان کی اہمیت میں کمی نہیں کر پائی تھی۔ بہت لاڈ سے پالا، چاؤ سے شادی کی۔ لیکن ظفر مخدوم کے دل پر وہ کبھی چڑھ ہی نہ سکیں۔ اترنے کا تو سوال ہی کیا؟

ماں کے مجبور کرنے پر ظفر مخدوم نے روشن سویرا سے شادی تو کر لی تھی لیکن نہ تو انہیں دل میں بسا سکے نہ ہی اپنے گھر میں، ماں نے جتنے جتن بیٹے کا گھر بسانے کے لیے کیے بیٹا اتنا ہی بیوی سے برافروختہ اور نالاں۔

ان کے امید سے ہونے کی خبر بھی شوہر کا دل موم نہیں کر پائی تھی۔ بے زاری یا شاید نفرت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن معمولی بات کو وجہ تنازع بنا کر طلاق کے تین لفظ بولے اور قصہ تمام کر دیا۔

وہ آٹھ ماہ کے حمل سے تھیں، طلاق نہیں ہو سکی تھی۔ دل کو ایک امید تھی کہ شاید......

لیکن جس روز سبکتگین پیدا ہوا اس سے اگلے روز انہیں ظفر مخدوم کی جانب سے تحریری طلاق نامہ موصول ہوا۔ امید ٹوٹ گئی۔ راستے تنگ پڑ گئے۔

ظفر مخدوم کا ان پر پہلا اور آخری احسان وہ قدیم طرز پر بنا حق مہر میں لکھوایا گیا مکان ان کے حوالے کرنا تھا۔ شاید بیٹے کو وراثت کا حق ادا کر کے خود کو اس کی عدالت میں بری کروا لیا تھا۔

ماں اور ابتجاج کے لاکھ اصرار کے باوجود وہ ان کے گھر جا کر رہنے پر آمادہ نہ ہوئیں انہیں کسی پر بوجھ بننا گوارا نہیں تھا۔

ابتجاج ریلوے میں ملازم گھر بچوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کے ساتھ ساتھ ہر ماہ کچھ رقم زبردستی ان کے ہاتھوں میں تھما جاتے۔

واجبی تعلیم یافتہ تھیں۔ ہنر...... ہاں وہ ہنر مند تھیں۔ شروع شروع میں اجرت پر کپڑے سلائی کرنا شروع کر دیے۔ جب سبکتگین پانچ سال کا ہوا تو اسے قریبی اسکول میں داخل کروا کر خود ایک پیکو سینٹر میں نوکری کر لی۔ تنخواہ بہت زیادہ نہیں تھی لیکن وہ مطمئن تھیں۔ ضروریات محدود کر لیں اور خواہشات انہوں نے کبھی پالی ہی نہیں۔

اماں، بھائی، بھاوج سے جتنا بن پاتا کرتے لیکن زندگی اتنی آسان کب تھی؟ کچھ لوگوں کو آزمائش کے لیے چن لیا جاتا ہے۔

شوگر نے آہستہ آہستہ جسم کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ نہار منہ گولی منہ میں رکھنے کے بعد وہ اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے ایک نئے دن کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں۔

لیکن جب روز سینے میں اٹھتی درد کی لہر نے انہیں ادھ موا کر دیا تب وہ بے بسی سے رو پڑی تھیں۔

"ایک دل ہی تو تھا۔"

سبکتگین ان دنوں میٹرک میں تھا۔

"اماں! یہ رکھ لیں۔"

اس نے پانچ سو سے لے کر سو، پچاس کے چند نوٹ ان کی ہتھیلی پر رکھے تو وہ متعجب سی اسے دیکھنے لگیں۔

"ہمارے ہمسائے منشی اکرم نے کہا تھا میرے پوتے کو گھر میں ٹیوشن پڑھانے آ سکو گے۔ دو چار اور لوگوں نے بھی کہا تو......" وہ بتا رہا تھا اور روشن ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھے گئیں۔

"کیا میرا سبکتگین اتنا بڑا ہو گیا ہے؟"

وہ ماں کو مشقت کرتے، دن رات رنگ برنگی گولیاں پھانکتے دیکھ کر وقت سے پہلے بڑا ہو گیا تھا۔

بن باپ کے بچے کی شرافت اور قابلیت پر محلے والے آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو تیار تھے۔ کالج سے واپسی کے بعد وہ گھر گھر ٹیوشن پڑھانے جاتا لیکن جب اس کے لیے دس گھروں میں جا کر پڑھانا مشکل ہو گیا تو اس نے اپنے گھر میں ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔

دن گزرتے گئے بچوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ محلے میں اس کا نام، ایک پہچان بن گئی۔ یہ اس کا آغاز تھا۔

اسے ابھی بہت آگے جانا تھا۔

بی ایس فائنل کے امتحانات کے بعد اس نے ایک کوچنگ سینٹر میں پڑھانا شروع کر دیا۔

"اماں! اب آپ پیکو سینٹر نہیں جائیں گی۔" اس دن انہیں پھر کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ کھانس کھانس کر وہ دوہری ہو گئیں۔

سبکتگین نے پانی کا گلاس ان کے لبوں سے لگایا۔ پیٹھ سہلائی۔ کھانسی تھمی تو آنکھوں سے مسلسل بہتا پانی بھی رک گیا سانس ہموار کرنے میں انہیں کچھ وقت لگا تھا۔

"ایک کمپیوٹر سینٹر میں دو گھنٹوں کے لیے ٹائپ رائٹنگ کی کلاس دینی ہے۔ رات آٹھ سے دس بجے تک۔ اس کا وہ معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اب آپ پیکو سینٹر نہیں جائیں گی اماں پلیز!" ان کے ہاتھ تھامے وہ جیسے منت کر رہا تھا۔

"پڑھائی کب کرو گے؟"

"رات کس لیے ہوتی ہے؟" وہ مسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔

"رات بھر تو وہی نہیں سوتے ہوں گے جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ہیں یا پھر وہ جنہیں پلیٹ میں رکھ کر سب مل جاتا ہے۔ میں تو پھر......"

"خود پر اتنا بوجھ مت ڈالو سبکتگین! تھک جاؤ گے۔"

نرمی سے کہتے انہوں نے تکیے سے پشت ٹکالی تھی۔

"مجھے محنت نہیں تھکاتی اماں! لیکن آپ کی یہ بے آرامی ضرور تھکا دے گی۔ اس لیے اب آپ صرف آرام کریں گی۔"

اس نے کسی بچے کی طرح جیسے انہیں بہلایا تھا۔

اس دن وہ ان سے پیکو سینٹر چھوڑ دینے کا وعدہ لے کر ہی اٹھا تھا۔

☆☆☆

"سبکتگین کی اپنی مصروفیات ہیں۔ میں سارا دن اکیلی گھر میں اکتاہٹ کا شکار ہو جاتی ہوں۔ سوچ رہی ہوں جیسے ہی اسے پکی نوکری ملے گی اس دن نکاح کی تاریخ لینے آ جاؤں گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ چاول چنتی اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بالکل آپا! آپ کی امانت ہے صدف، جب چاہیں لے جائیں۔" دُرِشہوار سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"صدف کب تک آتی ہے؟" پھپھو نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے تو چار بجے تک آ جاتی تھی۔ آج کل ذرا دیر سے آتی ہے کہہ رہی تھی بوتیک پر کام بڑھ گیا ہے۔"

دادی نے چائے میں رسک ڈبوتے ہوئے بتایا۔

"شہوار! چائے ختم کر کے کچن میں آ جاؤ۔" اماں نے چاولوں کا تھال اٹھاتے ہوئے کچن کی طرف جاتے ہوئے اسے کہا تو وہ سر ہلا گئی۔

"کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے بھابھی! سبکتگین کا تو آپ کو پتا ہے کھانے پینے کا بالکل بھی شوقین نہیں ہے۔ جو بھی سامنے رکھ دو چپ کر کے کھا لیتا ہے۔"

پھپھو کے جواب پر شہوار خالی کپ ٹرے میں رکھتے بولی۔ "کمال ہے سبکتگین بھائی کی جو جینے کے لیے کھاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے میرے جیسے لوگ آئے ہی دنیا میں کھانے کے لیے ہیں۔"

پھپھو ہنس پڑی تھیں۔

"اماں کو منع مت کریں، آپ کی وجہ سے آج ہم بھی چھوٹی موٹی شاہی دعوت اڑا لیں گے۔"

قدرے رازدارانہ انداز میں بولتی وہ کچن میں چلی گئی۔

شام ڈھلنے کو تھی جب صدف کی گاڑی بیرونی دروازے پر آ کر رکی۔

سامنے ابا اور دادی کے ساتھ پھپھو اور سبکتگین کو بیٹھا دیکھ کر اس نے ہاتھ میں تھامے شاپر دوسرے

ہاتھ میں منتقل کیے۔
"السلام علیکم!" سبکتگین نے یوں ہی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جو پھپھو سے ملنے کے بعد "میں چینج کر لوں۔" کہتی کمرے میں چلی گئی تھی۔ سبکتگین نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

اماں نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ چکن پلاؤ، کوفتے، آلو پالک کا سالن، رائتہ، سلاد اور میٹھے میں زردہ۔

شہوار نے اٹھ کر دستر خوان لگایا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گی آج ایک کولیگ نے لنچ دیا تو کھانا بہت لیٹ کھایا اب تو بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔"

صدف تھوڑی دیر ہی ان کے پاس بیٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا آج آپ کی وجہ سے ہم بھی شاہی دعوت اڑائیں گے۔"

"ندیدی!" کاشف نے اسے گھورا تو وہ مزے سے کندھے اچکا کر مزید پلاؤ نکالنے لگی۔

اماں نے دیکھا۔ سبکتگین پہلی بار اتنی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔

پھپھو کے لاکھ نا، نا کرنے کے باوجود ان کے جاتے وقت کھانا ڈبوں میں بند کر کے ان کے ساتھ کر دیا۔

شہوار اندر کمرے میں آئی تو صدف بوتیک سے لائے کپڑے بیڈ پر پھیلائے انہیں اپنے آگے رکھ کر چیک کر رہی تھی۔ میڈم زرقا وقتاً فوقتاً اسٹاف کو سوٹ گفٹ کرتی رہتی تھیں۔ یہ بات اسے صدف نے ہی بتائی تھی۔

"تمہارا نایاب سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"

شہوار نے ہیئر بینڈ اتار کر کنگھا اٹھا لیا۔

"نہیں تو۔" صدف چونکی۔ پھر لہجے کو سرسری بناتے ہوئے پوچھا۔ "کچھ کہا ہے اس نے تم سے؟"

"ہاں کہہ رہی تھی صدف سے کہنا اونچی اڑان ضرور بھرو لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اتر کر پھر زمین پر ہی آنا ہوتا ہے۔"

بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے اس نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا۔ کن انکھیوں سے ڈریسنگ کے آئینے میں ابھرتے عکس کو دیکھا۔ جس کا چہرہ لمحہ بھر میں متغیر ہوا تھا۔ پھر دوسرے لمحے خود کو سنبھال کر لاپروائی سے بولی۔

"تم اس کی کال اٹینڈ مت کرنا اب۔ ایسے فضول میں بولتی رہتی ہے۔"

"اوکے!" شہوار نے کندھے اچکائے۔

صدف نے الماری سے دو تین پرانے سوٹ نکالے

"یہ تم پہنو گی؟" شہوار نے پوچھا۔

"نہیں، تم جانتی ہو میں اترن نہیں پہنتی۔"

صدف نے کندھے اچکا کر پرانے سوٹ باہر نکال کر صوفے پر پھینکے اور ان کی جگہ پر بوتیک سے ملنے والے نئے سوٹ ہینگ کر کے لٹکانے لگی۔

☆☆☆

پھپھو کی رات پھر طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ سبکتگین انہیں بروقت اسپتال لے گیا۔ وہ تنہائی اور اکیلے پن کا شکار تھیں۔ کبھی شوگر لو ہو جاتی تو کبھی دل گھبرانے لگتا۔ ڈاکٹر نے انہیں ٹینشن فری رکھنے کا کہا۔

غم روزگار میں الجھے سبکتگین کے اختیار میں ہوتا تو دن رات ماں کے سرہانے لگ کر بیٹھا رہتا۔

لیکن وہ ماں کا پہلے سے بڑھ کر خیال رکھنے لگا تھا۔ کوچنگ سینٹر کے پروفیسر شکیل نے اسے وارننگ دی تھی کہ ان کا ادارہ مزید ایک بے قاعدگی برداشت نہیں کرے گا۔ سبکتگین انہیں بتا نہیں سکا کہ اس کے حالات بھی ان کی کٹوتیوں کا بار مزید نہیں اٹھا سکتے۔ ایک ایوننگ اکیڈمی میں اسے میتھس اور کامرس پڑھانے کی آفر آئی تو اس نے کوچنگ سینٹر چھوڑ دیا۔

اس کا ایم ایس مکمل ہو چکا تھا۔ رات کو روزانہ اخبار کھول کر ملازمت کے اشتہار ڈھونڈ کر اگلی صبح اپنی سی وی بھیج دیتا۔ چند چھوٹے موٹے کورسز نے اس کی سی وی میں کئی ستاروں کا اضافہ کر دیا تھا لیکن اس کے پاس نہ تو تگڑی سفارش تھی نہ ہی رشوت۔ ایسے میں محض اپنی قابلیت کے بل پر جاب ڈھونڈنا اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔

وہ مایوس نہیں تھا لیکن ماں کی حالت۔

اس نے تفکر سے ان کا زرد چہرہ دیکھا۔ "میں اب بہت بہتر ہوں سبکتگین! تم پریشان مت ہو بیٹا۔"

وہ اپنی تکلیف سے زیادہ بیٹے کو پریشان دیکھ کر فکر میں گھلنے لگی تھیں۔ وہ اپنے کام پر توجہ مرکوز نہیں کر پا رہا تھا۔ دن میں کئی بار فون کر کے ان کی طبیعت پوچھتا۔

اس صورت کا انہیں ایک ہی حل نظر آیا تھا۔ انہوں نے سبکتگین کے سامنے وہ حل رکھ دیا۔

"مجھے آپ کے فیصلے پر اعتراض نہیں ہے اماں! آپ کی فرمائش ہے تو سر آنکھوں پر۔ حکم ہے تو سر تسلیم خم۔"

ان کی بے رنگ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"جانتے ہو سبکتگین! جب جب میں تمہیں دیکھتی ہوں تو میرا دل کہتا ہے، قسمت کی لاکھ ستم ظریفیاں ایک طرف لیکن ایک تمہیں میری جھولی میں ڈال کر قدرت نے میرے تمام دکھوں کا ایسا خوب صورت ازالہ کیا ہے کہ کوئی شکوہ میرے لبوں تک آیا ہی نہیں۔"

سرخ چہرہ لیے سبکتگین نے ان کے دونوں ہاتھ چوم لیے تھے۔

☆☆☆

وہ بیٹا تھا اس نے ماں کا مان رکھا ہی نہیں تھا بلکہ بڑھا دیا تھا۔

لیکن یہاں وہ سوالی بن کر آئی تھیں۔

درخواست گزار، اماں نے بے ساختہ دادی کی طرف دیکھا تھا اور دادی نے اپنے بیٹے کی طرف

ڈاکٹر نے جو کچھ کہا سبکتگین انہیں بتا گیا تھا۔

"انہوں — میں کیسی سوچ بچار، گھر کی ہی بات ہے۔ فکر مت کریں آپا! صدف سے پوچھ کر نکاح کی کوئی قریبی تاریخ رکھ لیں گے۔"

اباجان کی بات پر انہوں نے طویل اطمینان بھری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔ اماں اور دادی بھی متفق تھیں۔

"صدف کی شادی؟ وہ بھی اتنے اچانک؟" شہوار ایکسائٹڈ ہوتی اچھل پڑی۔ "کاشف! کچھ سنا تم نے؟"

"ہاں جی اپنے سبکتگین بھائی کے سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں اور صدف ۔۔۔" صدف نے تو ان کی پوری بات سننے سے پہلے ہی انہیں بات کرنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔

"میں سبکتگین سے شادی نہیں کروں گی۔"

سردیاں تو کب کی رخصت ہو گئی تھیں لیکن اباجان نے خود کو سر تا پیر پسینے میں بھیگا محسوس کیا۔

"میں شاہ ویز سے محبت کرتی ہوں اور اسی سے شادی کروں گی۔"

دادی نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔ اماں نے لڑکھڑا کر سرسوں کا پھول بنی پھپھو کو دیکھا اور سبکتگین اس کی طرف تو دیکھا ہی نہیں گیا۔

سورج جیسے عین ان کے سروں پر آ کر انہیں جھلسانے لگا تھا۔

"شاہ ویز بہت جلد اپنے گھر والوں کو لے کر آئے گا رشتے کی بات کرنے۔"

ایک وہی تھی جو اس سلگتے ریگستان میں اتنے سکون سے کھڑی ٹھنڈے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"شاہ ویز؟" شہوار نے زیر لب دہرایا۔ "لیکن وہ تو نایاب کا منگیتر تھا نا؟" تو یہ تبدیلی بے وجہ نہیں تھی۔

☆☆☆

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔"

اجنبی نمبر تھا اس لیے نایاب نے کال ریسیو کر لی تھی ورنہ جتنی نفرت اسے صدف سے ہو گئی تھی وہ اس سے متعلقہ کسی فرد کی آواز تک سننا نہیں چاہتی تھی۔

اصل معاملہ کیا تھا، یہ صرف نایاب ہی بتا سکتی تھی۔ شہوار اس کے گھر پہنچ گئی۔

"پلیز نایاب! آپ ہی بتایئے یہ سب کیا ہے؟ صدف کے شادی سے انکار نے ہمارے گھر پر قیامت ڈھادی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شاہ ویز کی شادی تو آپ سے ہونا تھی نا؟"

نایاب تنا ہوا چہرہ لیے اس کی بات سن رہی تھی۔ سرد لہجے میں کہنے لگی۔

"آستین میں سانپ پالنا کسے کہتے ہیں یہ مجھے تمہاری بہن نے ہی سمجھایا ہے۔ میں نے اسے آنٹی کے بوتیک میں جاب دلوائی۔ اس پر ٹرسٹ کیا لیکن اس میں سارا قصور میری سادگی اور اندھے اعتبار کا نہیں۔ خود غرض لوگ شاید اسی طرح دوسروں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

میں نہیں جانتی اس نے کب اور کیسے شاہ ویز کو اپنے دام میں پھنسایا۔ شاہ ویز نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔ زرقا آنٹی کا اکلوتا بیٹا۔ میرا بچپن کا منگیتر جو کل تک مجھ سے محبت کا دعوے دار تھا آج اس کی محبت کا دم بھر رہا ہے۔ آنٹی نے اسے بوتیک سے نکالا تو شاہ ویز نے اسے اپنی نئی برانچ میں پرسنل اسسٹنٹ کی جگہ پر بٹھا دیا۔ دونوں ماں بیٹے کو ایک دوسرے کے مقابلے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اس نے۔ آنٹی نے مجھ سے کہا ہے میں مر جاؤں گی لیکن اسے بہو بنا کر اپنے گھر نہیں لاؤں گی۔ شاہ ویز کی شادی تم سے ہی ہوگی۔ لیکن...... اب وہ شاہ ویز سونے کا بھی بن کر آجائے تو مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔ وہ صدف جیسی لڑکی ہی ڈیزرو کرتا ہے۔"

نایاب کے الفاظ زہر میں بجھے تیروں سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ واپسی کے سفر میں وہ رکشے کے ایک کونے میں دبکی آنے والے وقت سے خوف زدہ تھی۔

☆☆☆

دادی نے بیٹے کے ڈھلکتے کندھے دیکھے۔ اتنا کرب تو اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی نہیں آیا تھا جب حادثے نے ان سے دونوں ٹانگیں چھین لی تھیں۔ اپنی تربیت پر انگشت بدنداں بیوی کی شرمساری سے جھکی آنکھیں دیکھیں۔

سرسوں کا پھول بنی بیٹی کو دیکھا، جس کا سانس اس وقت دھونکنی کی مانند چلنے لگا تھا اور ان کا نواسا شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والا سبکتگین کیسے لحوں میں فقیر ہوا تھا۔ انہوں نے دوپٹے کا پلو منہ پر ڈال کر کروٹ بدل لی۔ ان کی گدلے پانیوں سے بھری ضعیف آنکھوں میں مزید کچھ دیکھنے کی تمنا باقی نہیں رہی تھی۔

"تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو صدف؟"

شہوار کا جی چاہا اسے جھنجوڑ کر رکھ دے۔ جب کہ وہ اس ساری صورت حال کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ سکون سے بولی۔

"خود غرض میں نہیں ہمارے گھر والے ہیں۔ انہیں خود سوچنا چاہیے کیا میرا اور سبکتگین کا کوئی جوڑ ہے؟ خالی خولی وجاہت کے سوا اور اس کے پاس ہے ہی کیا؟"

"پھپھو محبت کرتی ہیں تم سے اور شاید سبکتگین بھائی بھی۔"

"ہونہہ! خالی جیب محبت کسے اچھی لگتی ہے؟"

شہوار نے دکھ سے اسے دیکھا۔ جو مزید گل افشانی کر رہی تھی۔

"اس کے پاس نہ اچھا گھر ہے نہ کوئی ڈھنگ کی جاب۔ پھپھو نے جس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے سسکتے ہوئے زندگی گزاری ہے۔ ایسے میں نہیں گزار سکتی۔ جب میرے پاس اس سے بہتر آپشن موجود ہے تو میں اس ترستی، سسکتی زندگی کا انتخاب کیوں کروں؟"

شہوار کا جی چاہا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روک دے۔ اور کچھ نہیں تو دروازے کے پار ساکت کھڑے سبکتگین کے کانوں میں ہی انگلیاں ٹھونس دے۔ جو اپنی لہورنگ آنکھیں لیے الٹے قدموں واپس مڑ گیا تھا۔

☆☆☆

شاہ ویز نے نجانے کیسے اور کیا کہہ کر ماں کو راضی کیا تھا۔ وہ رشتہ لے کر آگئی تھیں۔ شہوار نے سوچا اس سے تو اچھا تھا وہ نہ ہی آتیں۔

"آج کل کے بچوں کا تو پتا ہے۔ اپنی مرضی کے مالک ہیں اوپر سے راہ بھٹکانے والے بھی "ایسے" مل جائیں تو ماں باپ بے چاروں کے پاس، ان کی ماننے کے علاوہ اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر بہت مشکلوں سے یہاں آئی ہوں......"

میڈم زرقا بول رہی تھیں۔ اٹھی ہوئی گردن والی مغرور عورت جن کی بوتیک کی شاخیں کئی شہروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ شہر کی معروف شخصیات میں شمار ہوتی تھیں۔ جنہیں بیٹے کی ضد اور محبت نے اس عام سے گھر کے عام سے ڈرائنگ روم کے عام سے صوفے پر لا کر بٹھا دیا تھا۔ وہ یوں کنارے پر ٹک کر بیٹھی تھیں جیسے ابھی اٹھ کر چل پڑیں گی۔

چائے اور دیگر لوازمات پر غلط ڈالے بنا مطلب کی بات پر آگئی تھیں۔ ڈرائنگ روم کا سفید جالی والا پردہ دبوچے صدف کو ان کا یہاں آنا ہی اپنی سب سے بڑی کامیابی لگا تھا۔

ان کے الفاظ لہجے پر غور کرنے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

کاشف نے بے اختیار ابا کو دیکھا۔ جو نگاہیں نیچی کیے مسلسل کارپٹ کو گھورے جا رہے تھے۔ نہ جانے انہوں نے کچھ سنا بھی ہے یا نہیں؟ یقیناً سب سن لیا تھا۔ ان کے وہیل چیئر پر مضبوطی سے جمے ہاتھوں کی ابھری ہوئی رگوں کو دیکھ کر شہوار نے سوچا۔

دادی نے صدف سے بات کی تھی۔ لیکن وہ اپنی ضد سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کے پاس ایک سو ایک دلائل تھے خود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے دادی نے وہ ساری نصیحتیں اپنے پلو سے باندھ لیں، جو وہ اسے کرنے کا ارادہ کر کے اس کے پاس آئی تھیں۔

"سادگی سے نکاح اور رخصتی ہوگی۔"

ابا نے صرف ایک بات کہی تھی۔ اس کے بعد چپ سادھ لی۔ لوگوں کی کھلتی زبانیں دیکھ کر انہیں ویسے ہی چپ ہو جانا تھا۔

والہانہ جوش و خروش کا مظاہرہ دوسری طرف سے بھی نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے نکاح کے لیے بھجوایا گیا سامان دیکھ کر تو لمحہ بھر کے لیے شہوار کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نکاح کا جوڑا شاید ہی لاکھ سے کم ہو گولڈ کے زیورات، جوتے، مہنگا ترین کاسمیٹکس، بیگ......

"دیکھا؟" صدف نے ایک جتاتی ہوئی نظر اس کے حیرت زدہ چہرے پر ڈالی تھی۔ اس گھر میں اس وقت کوئی خوش تھا تو وہ صدف تھی۔

سبکتگین نہیں آیا لیکن وہ ماں کو بھی آنے سے روک نہیں سکا تھا۔ وہ ان کے ٹوٹے دل کو مزید کرچیوں میں بٹا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"وہ میرا بیٹا ہے سبکتگین! ایک رشتے کے ٹوٹنے سے میں اپنے باقی رشتوں سے تعلق نہیں توڑ سکتی۔"

وہ خاموش رہا تھا۔ پھر اسی خاموشی سے انہیں ماموں کے دروازے پر چھوڑ کر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

"مجھے معاف کر دیں ابا!"

رخصتی سے پہلے وہ ابا کی وہیل چیئر کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ انہوں نے لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

ہاں معاف کرنا ان کے اختیار میں تھا۔ لیکن جو دکھ وہ انہیں دے کر جا رہی تھی اسے بھلانا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔

☆☆☆

میڈم زرقا دنیا دار خاتون تھیں۔

ان کے وسیع سرکل میں شاہ ویز کی شادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ شاہ ویز کی شادی اور وہ بھی اتنی خاموشی اور سادگی سے؟

خلقت خدا کہنے کو فسانے مانگے۔ نایاب کی جگہ صدف کو جس دل سے وہ رخصت کروا کر لے آئی تھیں یہ وہ خود ہی جانتی تھیں۔ لیکن شان دار ولیمہ ارینج کرکے انہوں نے لوگوں کے منہ بند کردیے تھے۔

ولیمے کے اگلے روز شاہ ویز کے ساتھ گھر آئی تھی۔ قیمتی لباس پہنے، خوشبوؤں میں بسی ایک بالکل مختلف صدف۔

وہ آتے ہی دادی، اماں اور شہوار کے گلے لگی تھی۔

"ولیمے پر کیوں نہیں آئے آپ لوگ؟" نہ جانے وہ اتنی بے نیاز بن رہی تھی یا حیثیت بدلتے ہی بے نیاز ہوگئی تھی۔

کچھ بھی تھا داماد پہلی بار گھر آیا تھا۔ دادی کے اشارہ کرنے پر اماں چائے وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ شاہ ویز نے روک دیا۔

پکی عمر کا بہت معمولی سا شاہ ویز، جس کی بے تحاشا دولت نے اسے صدف کی نگاہ میں سب سے اہم بنا دیا تھا۔

"کل ہم بھوربن وغیرہ جارہے ہیں تو اس لیے آج صدف کو آپ لوگوں سے ملوانے کے لیے لے آیا......"

اس نے صدف کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سر کو ہلکا سا خم دے کر خوب صورت سا ہنس دی۔ "جناب!"

اور برآمدے کی گرل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی شہوار نے سوچا۔

"کیا واقعی کچھ لوگ اتنے ہی خوش قسمت ہوتے ہیں کہ جب جی چاہا ہاتھ بڑھا اپنی من پسند خوشیاں حاصل کرلیں؟"

صدف چلی گئی تھی لیکن اس کے لباس سے اٹھتی قیمتی پرفیوم کی مہک دیر تک پورے گھر میں مہکتی رہی تھی۔

☆☆☆

آج بہت دنوں بعد پھپھو آئی تھیں۔ پہلے سے زیادہ کمزور ہوگئی تھیں۔ نقاہت چہرے سے جھلکنے لگی۔ صرف مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے صدف کا حال احوال پوچھا۔ چائے بھی پی لی۔

اماں ان سے نظریں نہیں ملا پائی تھیں۔ کاشف دنوں بعد آج تسلی سے اپنی موٹر بائیک چمکا رہا تھا۔

"سبکتگین بھائی کی جاب کا کیا بنا پھپھو! ان سے کہیں تگڑی سفارش کے بغیر ان کے شایان شان جاب ملنا بہت مشکل ہے کوئی اور کام ڈھونڈ لیں۔"

"اب کیا پرچون کی دکان کھول کر بیٹھ جائے؟" دادی نے پوتی کو گھورا۔

"سبکتگین لگا ہوا ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا ان شاءاللہ۔" پھپھو بہت پرامید تھیں۔

ابا چپ چاپ شاور اٹھائے پودوں کو پانی سے نہلاتے رہے۔

آہستہ سے ہی سہی زندگی معمول پر لوٹ آئی تھی۔ اس روز انہیں چھوٹا آئینہ سامنے کیے اپنی کنپٹیوں پر کلر لگاتے دیکھ کر شہوار نے سکھ کی سانس لی تھی۔ ان کے سفید، الجھے بالوں کو دیکھ دیکھ کر عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے برش لے لیا اور احتیاط سے کلر لگانے لگی۔

"تم سبکتگین سے شادی کرلو در شہوار"

اس کا ہاتھ کانپا تھا۔ غلط اسٹروک ابا کے کان کو داغ دار کرگیا۔

"جو زخم وہ دے گئی ہے اس پر مرہم تم ہی رکھ سکتی ہو۔ ورنہ زندگی بھر رستا رہے گا۔"

امرود کی ٹہنیوں پر اچھلتی گلہری لمبی چھلانگ لگا کر، ساتھ والے املتاس کے گھنے پتوں میں دبک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ جو ابا کے چہرے کو یک ٹک تکے جارہی تھی۔

"ابا! میں......" اس کے لب پھڑپھڑائے تھے۔ اس نے شدت سے نفی میں سر ہلانا چاہا۔ زبان سے کہنا چاہا۔ لیکن ابا کہہ رہے تھے۔

"ہاتھ جوڑوں تمہارے سامنے؟"

اور در شہوار وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے قدموں میں گری فنا ہوگئی تھی۔

دادی نے لرزتے ہاتھوں سے ساتھ بیٹھی بہو کا ہاتھ تھاما، جس کے چہرے پر عجیب سا سکون ہلکورے لیتا دکھائی دینے لگا تھا۔

صدف واپس آگئی تھی پہلے سے زیادہ خوب صورت اور خوش باش۔ ابا کے لیے جیکٹ، دادی کی شال، اماں کا جوڑا شہوار اور کاشف کے لیے پرفیوم اور بھی نہ جانے کیا کچھ۔ اس نے ان کے لیے اتنا کچھ لیا تھا۔ اپنے لیے نہ جانے کیا کچھ لیا ہوگا؟

"سبکتگین اور شہوار کا نکاح؟ آج...... شام کو؟" سارے شاپنگ بیگز اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئے تھے۔

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟" اس نے شہوار کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ "صاف...... صاف انکار کردو ابھی اور اسی وقت......"

کارپٹ پر گویا انگارے دہک اٹھے تھے جن پر ننگے قدموں چلتی وہ یہاں سے وہاں تک چکر کاٹ رہی تھی۔ شہوار ساکت سی بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ نگاہ اٹھا کر اپنے اندر کے ہیجان پر بمشکل قابو پاتی صدف کو دیکھا۔

"میں تمہاری طرح نہیں ہوں صدف! بہادر، بے باک اور شاید خودغرض......"

"ہونہہ!" صدف نے سر جھٹکا۔ "میں نے صرف اپنا حق استعمال کیا تھا اور ابا کو دیکھو مجھے ان سے یہ امید نہیں تھی۔ بہن اور بھانجے کی محبت میں بیٹی قربان کرنے چلے ہیں۔ میں نے انکار کردیا تو انہوں نے تمہیں سولی پر چڑھانے کا فیصلہ کرلیا۔" "لیکن تم اپنے ساتھ یہ زیادتی مت کرو شہوار! پھپھو کی طرح تمہاری بھی ساری زندگی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو مارتے آخر میں خون تھوکتے گزر جائے گی۔"

"تمہیں اتنا غصہ کس بات پر آرہا ہے صدف! میری شادی ہونے پر یا سبکتگین سے ہونے پر؟"

صدف نے دونوں بازو کمر پر رکھ کر اسے گھورا۔

"ترس آرہا ہے مجھے تم پر۔ بلکہ حیرت ہورہی ہے تم تو سالن میں اچھی بوٹی نہ ملنے پر طوفان اٹھا دیا کرتی تھیں، پھر زندگی کے اتنے بڑے فیصلے پر کیسے سر جھکا دیا؟"

صدف کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کیسے اسے اس سب سے باز رکھے۔ اس کا غصہ، وحشت اور بے قراری عروج پر تھی۔

"اور تم تو اترن تک نہیں پہنتی تھیں کجا کہ ایک دھتکارا ہوا شخص......"

شہوار دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے گھٹنوں میں سر دیے کر رو دی تھی۔

☆☆☆

روشنیوں کا شہر خاموش ہوگیا تھا۔

آسمان کے سینے پر چمکتا آدھا ادھورا چاند رات کی تاریکی کو نگلنے میں ناکام تھا۔ اسٹریٹ پولز کی مدھم روشنیوں میں تارکول کی سیاہ سڑک پر خاموشی رقصاں تھی۔ دور کہیں کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز مہیب سناٹے میں دراڑیں ڈال گئی تھی۔

"خالی خولی وجاہت کے سوا اور ہے ہی کیا سبکتگین کے پاس؟ نہ اچھا گھر نہ کوئی ڈھنگ کی جاب؟"

راہ میں آئے خالی کین کو جوتے کی ٹھوکر ماری تو وہ عجیب سی کھنکھناہٹ پیدا کرتا دور تک لڑھکتا چلا گیا تھا۔

رات کا دامن بہت وسیع تھا۔ تھکاوٹ سے چور جسم، بھاگتے دوڑتے مناظر، ادھیڑبن میں الجھا دماغ آہستہ سے ہی سہی رات کی مہربان چادر تلے کسمسا کر پرسکون ہوگئے تھے۔

ایک وہی تھا۔ بے سکون، مضطرب......

شل ہوتے قدموں کے ساتھ وہ گھر لوٹ آیا تھا۔ صحن کے بیچ و بیچ کسی سنگی مجسمے کی مانند ایستادہ کھڑی ماں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا تھا۔ وہ اسی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

"آپ سوئی نہیں ہیں اماں! ابھی تک کیوں جاگ رہی ہیں؟"

ان کے قریب آکر وہ ٹھہر گیا تھا۔

"جس ماں کا بیٹا اپنی شادی کی رات دو بجے تک گھر سے باہر رہے اس ماں کو موت تو آسکتی ہے نیند نہیں۔"

ماں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سامنے بیڈ پر بیٹھی شہوار کو دیکھ کر اس کے قدم تھمے تھے۔

"ابھی تک ایسے کیوں بیٹھی ہو ورد؟"

"وہ چونکی ورد؟" ہاں ایک وہی تھا جو ہمیشہ اسے ورد کہہ کر پکارتا لیکن ایسے، یہ اور بات تھی ایسا موقع شاذ و نادر ہی آیا تھا۔

"مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ تم چینج کر کے سو جاؤ۔" سنجیدگی سے کہتا وہ الماری کی طرف بڑھا۔ کچھ کتابیں، فائل وغیرہ اٹھائیں اور کونے میں رکھی میز کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

شہوار کو روایتی دلہنوں کی طرح نہیں سجایا گیا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ کا ہم رنگ دوپٹہ سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ جس کے کناروں پر سفید موتیوں کا ہلکا سا کام تھا۔ ایسا ہی کام قمیص کے گلے، دامن اور آستینوں پر بھی تھا۔

ہونٹوں پر لپ اسٹک، آنکھوں میں کاجل۔

پھپھو کا جو تھوڑا بہت زیور تھا وہ تھوڑا تھوڑا کر کے سبکتگین کی پڑھائی کے اخراجات کے سلسلے میں بک گیا۔ اب صرف دو کنگن ہی بچے تھے۔ جو پھپھو کو ان کی ساس نے چڑھائے تھے۔ وہی کنگن انہوں نے بہت محبت سے شہوار کے ہاتھوں میں ڈال دیے تھے۔

اس نے اٹھ کر کپڑے بدلے۔ منہ دھویا اور بیڈ کے کنارے لیٹ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ سبکتگین اس کی وہاں موجودگی سے لاتعلق بنا اپنا کام کرتا رہا۔

"دیکھنا تم پچھتاؤ گی اپنے فیصلے پر اور اس کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ایک ہی دن کافی ہوگا۔"

آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے تک صدف کی آواز اس کے کانوں کے آس پاس گونجتی رہی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کے اٹھنے سے پہلے وہ باہر جا چکا تھا۔

ملحقہ غسل خانے میں ٹوٹی سے قطرہ قطرہ پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ نیچے اکھڑے ہوئے فرش پر مسلسل پانی گرنے سے چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔

اس نے بالٹی اٹھا کر ٹونٹی کے نیچے رکھ دی۔

بیسن پر لگے آئینے پر نگاہ ڈالے بغیر منہ پر پانی کے چھپاکے مارتی، وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے چہرے پر گزری رات کا ایک ایک لمحہ ثبت تھا۔ دوپٹے کے پلو سے چہرہ خشک کرتی وہ باہر آگئی تھی۔

پھپھو کچن میں پیڑھی پر بیٹھی پیڑے اتار رہی تھیں۔

اسے آتا دیکھ کر مسکرائیں۔

"ناشتے میں کیا لوگی بیٹا!" چھوٹا سا کچن اپنے اندرونی حال کی کہانی سناتا گویا ان کے سوال پر ہنسا تھا۔

اسے یاد آیا وہ ناشتے کے معاملے میں اماں کو کتنا زچ کرتی تھی۔ کبھی آملیٹ چاہیے تو کبھی آلو والے پراٹھے، کبھی دیسی گھی کے ساتھ چپڑی روٹی پر دادی کے ہاتھ سے ڈالا گیا سبزیوں اور کیری کا اچار۔

"میں نے تو سوچا تھا سبکتگین سے کہوں گی سامنے نکڑ پر بشیرے سے حلوہ پوری اور چھولے لے آئے گا۔ لیکن آج اس کا انٹرویو ہے تو اس لیے جلدی چلا گیا......"

اس کے سامنے پراٹھا اور پیاز، ہری مرچوں والا آملیٹ رکھتے ہوئے بولیں۔

"منہ اندھیرے کون سا انٹرویو ہوتا ہے؟" سر جھٹک کر وہ خاموشی سے ناشتا کرنے لگی تھی۔

"سبکتگین تو ناشتے میں سادہ روٹی کے ساتھ دہی لیتا ہے جب کہ مجھے رات کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ باسی روٹی مزہ دیتی ہے۔ وہ جلد ہضم

ہو جاتی ہے نا تو اس لیے......"

ناشتے کے دوران پھپھو یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہیں۔

"لیکن اب تم آگئی ہو نا تو اب بہت کچھ بدلے گا۔ زندگی کو تبدیلی درکار ہوتی ہے۔"

انہوں نے ٹھیک کہا تھا زندگی تبدیلی مانگتی ہے۔ لیکن ایسی تبدیلی کا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر اس کے دن رات بدل ڈالے ہوں۔ اس گھر میں وہ بارہا آچکی تھی لیکن کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے ہمیشہ کے لیے یہاں آکر رہنا پڑے گا۔

البتہ صدف کے یہاں آنے کے بارے میں اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اس کی دوستی روبیلہ......

"تبدیلی تو صدف کے زندگی میں بھی آئی تھی اور کیا قابل رشک تبدیلی تھی۔ وہ فرش سے عرش پر جا پہنچی تھی اور میں......"

اس نے اس وقت خود کو انگاروں پر چلتا محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

"وحید ٹیکسٹائل" کا نام دور سے ہی اونچی عمارت کے ماتھے پر جگمگا رہا تھا۔

فیکٹری کے اندر مشینوں کو گھمر گھمر، زوں زوں گونج رہی تھی۔ منہ پر ماسک چڑھائے باوردی ملازم مستعدی اور جاں فشانی سے اپنے اپنے امور انجام دے رہے تھے۔ ان کی مخصوص بو نے اندر داخل ہوتے ہی اس کا استقبال کیا تھا۔

شہر کی اس مشہور ترین مل میں منیجر کے لیے ایک اسسٹنٹ اور کوالٹی چیکر کی جاب تھی۔ آج اس کے انٹرویو کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔

ریوالونگ چیئر پر بیٹھے پکی عمر والے منیجر نے کرسی روک کر اسے دیکھا تھا۔ کئی بار کی پہنی ہوئی پینٹ پر گرے لائنوں والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سلیقے سے جمے بال، اس کی سحر انگیز شخصیت دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے تو منیجر بھی دل ہی دل میں اس سے مرعوب ہو گیا تھا۔

"او بادشاہو! ڈگریوں کا پہاڑ لے کر کہاں کپڑا بنانے والی فیکٹری میں بھول کر آ بھٹکے ہو؟ تم تو کرسی پر بیٹھ کر حکم چلانے کے لیے بنائے گئے ہو۔"

اس کی فائل پر نگاہیں دوڑاتا منیجر بھدی آواز میں بولتے ہوئے ہنسا تھا۔

"کوئی تجربہ ہے اس کام کا؟"

"کام کروں گا تو تجربہ ہوگا سر!" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"او نا جی ناں! ایسے اناڑی بابو کو تو سیٹھ وحید اپنی مشینوں کے پرزوں کے قریب بھی نہ بھٹکنے دے۔"

انہیں واقعی کاروباری سوجھ بوجھ رکھنے والے گھاگ، چلتر قسم کے اسسٹنٹ کی ضرورت تھی۔

مشینوں کی زوں زوں اب اعصاب پر گراں گزرنے لگی تھی۔ وہ ایک لمحہ مزید ضائع کیے بغیر اپنی فائل اٹھائے وہاں سے نکل کر باہر آگیا تھا۔

ایم ایس مکمل ہوتے ہی اس نے یونیورسٹی چھوڑ دی تھی۔ پرائیویٹ اسکول والے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے بعد مہینے کے آخر میں گنتی کے چند ہزار ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ اس نے کوچنگ کے بعد ایک ایوننگ اکیڈمی میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ آخری دو گھنٹے ایک کمپیوٹر سینٹر میں دو گھنٹوں کے لیے ٹائپ رائٹنگ چینج کی کلاسز دیتا۔ دن رات کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ جتنا کماتا اس ہوشربا مہنگائی کے دور میں اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف تھی۔

بجلی، پانی، گیس کے بل، اماں کی دوائیوں کا خرچا، خاندان میں دینا دلانا، راشن وغیرہ...... سبکتگین چاہتا تھا مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ ہاتھ آئے اسی تگ و دو میں وہ جگہ جگہ جاب کے لیے اپلائی کر رہا تھا۔ چاہے کام اس کی ڈگری اور شخصیت سے مطابقت نہ بھی رکھے وہ ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔

"اماں کہاں ہیں؟"

آج وہ ہمیشہ کی طرح اسے اپنے انتظار میں

دروازے کے پاس کھڑی نظر نہیں آئی تھیں۔ ورنہ تو گلی میں اس کے موٹر سائیکل کی آواز سنتے ہی دروازے کے پاس چکر کاٹنا شروع کر دیتی تھیں۔ سبکتگین کو دروازہ بجانے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کا ہاتھ اٹھنے سے پہلے ہی وہ دروازہ کھول دیتی تھیں۔

"پھپھو؟ پتا نہیں......"

آگے چلتے سبکتگین کے قدم تھمے تھے۔ مڑ کر پیچھے آتی شہوار کو دیکھا۔

"کیا مطلب؟ پتا نہیں؟"

تیز لہجے میں بولتا وہ ان کے کمرے کی طرف بھاگا تھا پھر کچن کی طرف جہاں اندر دروازے کے قریب وہ بے ہوش ہو کر گری ہوئی تھیں۔

شہوار کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ "پھپھو!" وہ فوراً آگے بڑھی تھی۔

سبکتگین نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھالے انہیں کمرے میں لے آیا تھا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر دروازے کے پاس لب چباتی شہوار کو جو کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"میں اب ٹھیک ہوں بیٹے! تم دونوں جاؤ اپنے کمرے میں۔"

وہ تکیے کا سہارا لے کر تھوڑا سا اوپر اٹھ کر بولیں۔

"میں آج یہیں ہوں آپ کے پاس۔ جس نے جانا ہے وہ جائے۔"

شہوار نم آنکھیں لیے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

"یہ کیا حرکت تھی سبکتگین؟"

صبح پھپھو سبکتگین پر ناراض ہو رہی تھیں۔

"کیا؟" وہ چنگیر اپنی طرف کھسکاتا بے نیاز بن گیا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس بارے میں بات کر رہی ہوں۔"

"اور اس محترمہ کے بارے میں کیا کہیں گی آپ؟ حد ہوتی ہے لاپروائی اور غیر ذمہ داری کی......" وہ دبے دبے غصے میں بولا تھا۔

"میں کیا پہلی بار بیمار ہوئی ہوں؟"

پھپھو نے دہی کا پیالہ اس کے سامنے کیا۔

"پہلے کی بات اور تھی اماں! تب آپ سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ جانتی ہیں کل پورا دن میں نے صرف یہی سوچ کر آپ کو کال نہیں کی کہ آپ اکیلی نہیں ہیں......"

"سارا وقت وہ میرے پاس ہی تھی۔ اب تو مجھے خواب تھوڑی آیا تھا کہ اس کے کمرے میں جاتے ہی میں بے ہوش ہو کر گر پڑوں گی۔"

پھپھو خفا خفا لہجے میں بول رہی تھیں۔ سبکتگین ناشتا کرنے لگا۔

"شہوار! آ جاؤ بیٹا!" پھپھو کی نظر اب اس پر پڑی تھی۔ وہ خاموشی سے اندر آ گئی۔

"آج تو اتوار ہے۔ تمہیں دیر نہیں ہو رہی ہو گی۔ بشیر سے شہوار کے لیے چھولے اور بریانی لے آؤ۔"

"اس کی عادتیں خراب مت کریں اماں! بس جو ہے جیسا ہے "یہی" ہے۔"

کہتا وہ اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ پھپھو اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئیں۔ شہوار خاموشی سے اس کا چھوڑا ہوا ناشتا ختم کرنے لگی۔

"میں اور بنا دیتی ہوں۔" وہ جلدی سے پراٹھے کے لیے توا چولہے پر رکھنے لگیں تو شہوار نے منع کر دیا۔

"کام ختم کر کے پھر تمہاری اماں کے ہاں چلتے ہیں۔ ٹھیک ہے؟"

شہوار کو لگا جیسے وہ اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوششوں میں لگ گئی ہوں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھپھو کے ساتھ کچن سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ سبکتگین اپنی مخصوص کرسی پر لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔

شہوار نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں کنگھا پھیرا۔ سرخ چھوٹے چھوٹے پھولوں والی ہیئر پن ماتھے کے اوپر سے کھینچ کر لگائی۔ پیچھے کرلی بال کھلے چھوڑ دیے۔

"چلیں پھپھو؟"

پھپھو کو اندر کمرے میں آتا دیکھ کر وہ چادر اوڑھتے پوچھنے لگی تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"ایسے ہی چل پڑیں کیا؟ شادی شدہ بیٹیاں اچھے سے تیار ہو کر میکے جاتی ہیں۔ تم تو خیر سے نو بیاہتا ہو......"

"مجھے ایسا نہیں لگا پھپھو! جب لگے گا تو میں بھی پورے سولہ سنگھار کر کے ہی میکے جایا کروں گی۔"

سبکتگین نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا تھا۔ لیکن تب تک وہ چادر اوڑھتی باہر نکل گئی تھی۔

"ٹھیک ہو در شہوار؟"

"شکر ہے ابا نے یہ نہیں پوچھا۔ "خوش ہو در شہوار؟""

"آپ کیسے ہیں؟" آنسوؤں کا گولہ حلق سے اندر اتارتے وہ مسکرائی تھی۔

"کیسے کا تو پتا نہیں بس رات کو جب سونے لگتا ہوں تو نیند جلدی آ جاتی ہے اور دل پر کوئی بوجھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔"

وہ بھیگی آواز میں بول رہے تھے۔ "تمہیں مجھ سے گلہ تو ہو گا نا میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کر دی؟"

"ابا!" وہ زور سے ان کے گلے آ لگی تھی۔

شام کو سبکتگین انہیں لینے پہنچ گیا تھا۔ پھپھو نے اطمینان کی سانس لی۔

☆☆☆

"ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں اماں سے کہ تمہیں نہیں لگتا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

رات کو وہ سونے کی تیاریوں میں تھی جب سبکتگین اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

شہوار کو اندازہ نہیں تھا وہ بغیر کسی لگی لپٹی کے اس کے سامنے یوں سوال جواب کرنے کھڑا ہو جائے گا۔

"کیا جتانا چاہ رہی تھیں اماں کو کہ تم اس زبردستی کے بندھن سے خوش نہیں ہو؟"

"مجھے کچھ جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" رخ موڑ کر وہ تکیہ درست کرنے لگی تھی۔ سبکتگین نے اس کا بازو پکڑ کر رخ اپنی طرف موڑا۔

"بات سنو! کسی نے تمہاری کنپٹی پر بندوق نہیں رکھی تھی۔ تمہاری رضامندی کے بعد ہی میں نے اس نکاح کے لیے ہامی بھری تھی اماں کی خوشی......"

شہوار کے اندر سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑواتے سلگتے لہجے میں بولی۔

"میں نے بھی صرف اپنے ابا کا حکم مانا ہے۔ ان ہی کی خوشی کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے ورنہ مجھے ایسے انسان کا ساتھ چاہیے ہی نہیں جس کے دل و دماغ پر کسی اور کا قبضہ ہو۔"

نا چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے اندر سلگتے احساس کو اس پر عیاں کر گئی تھی۔

صدف کی خوب صورتی، اس کے ناز و انداز کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ گداز جسامت سانولی نمکین رنگت والی در شہوار نے خود کو "نمایاں" کرنے کے لیے کبھی کوئی تردد نہیں کیا تھا۔ اپنے حلیے سے بے نیاز اپنے آپ میں مگن رہتی۔

وہ صدف کی خوب صورتی کو دل سے سراہتی لیکن اس کے اندر اس جیسا بننے کی خواہش نے کبھی سر نہیں اٹھایا تھا۔

اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔ سبکتگین کی اس سے برتی جانے والی، حد درجہ بے نیازی یا شاید لاتعلقی کے پیچھے اسے سب سے بڑی وجہ یہی نظر آئی تھی۔ اس نے یقیناً اپنے ساتھ ہمیشہ صدف کو سوچا ہو گا جو ہنستی بھی تو لگتا کسی دور ویرانے کے مندر میں گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔

وہ عام سی دُرِ شہوار پر ایک نگاہ بھی ڈالتا تو کیونکر؟ وہ پہلی بار رقابت کی آگ کی تپش محسوس کر رہی تھی۔ اب وہ ناچاہتے ہوئے بھی اپنا اندرونی خلفشار اس پر ظاہر کر گئی۔

"بہرحال آپ اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں۔"

جی کڑا کر کے اس نے کہہ ہی دیا۔ سبکتگین کے لبوں پر مدہم مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔

"ضرور کروں گا بس ذرا وقت تو آ جائے۔"

☆☆☆

اس دن اچانک صدف پہنچ گئی۔

پھپھو عصر پڑھ رہی تھیں۔ شہوار رات کا کھانا بنانے کی غرض سے کچن میں آ گئی۔

فریج کھول کر جائزہ لیا۔ نہ گوشت، نہ آلو نہ ہی کوئی اور سبزی...... گہری سانس بھرتے اس نے فریج کا دروازہ بند کر دیا۔

سلیب کے اوپر شیلف پر دال، چاول اور مسالہ جات وغیرہ کے ڈبے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

تھوڑی سی دال، تھوڑے سے چاول، اسے پھپھو کے معاشی حالات کا اندازہ تو تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔

دال ٹرے میں ڈال کر اسے صاف کرنے کی غرض سے وہ باہر صحن میں امرود کے درخت نیچے رکھی چارپائی پر آ بیٹھی تھی۔

تنگ ٹوٹی ہوئی گلی کے نکڑ پر ہی صدف کو اپنی لشکارے مارتی گاڑی سے اترنا پڑ گیا تھا۔ نازک ہیل پہنے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس کی بس ہو گئی۔

قیمتی گلاسز بالوں میں اٹکائے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھامے۔

شہوار اسے اچانک سامنے دیکھ کر حیران سی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"صدف! تم؟"

"ہاں یار! مجھے نہیں پتا تھا تمہارے دولت خانے پر آنے کے لیے مجھے اتنا خوار ہونا پڑے گا۔"

سخت جھلائے ہوئے لہجے میں بولتے اس نے بیگز چارپائی پر رکھ دیے تھے۔ اس کی آواز پر پھپھو بھی باہر آ گئی تھیں۔

"کیسی ہیں پھپھو؟"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا۔" انہوں نے [illegible] ادا کیا تھا۔

"کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا؟" ان کے کہنے پر وہ پلاسٹک کی کرسی پر تکلفاً بیٹھ گئی۔

پھپھو چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی تھیں۔ جب سے شہوار اس گھر میں آئی تھی وہ بہت خوش اور مطمئن رہنے لگی تھیں۔ صحت بھی پہلے کی نسبت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

"شاہ ویز نے اسلام آباد میں اپنی بوتیک کی نئی لانچنگ اوپننگ کی ہے تو اس خوشی میں۔ میں نے گھر میں ایک دعوت رکھی ہے۔ باقی سب کو تو کال پر ہی انوائٹ کیا ہے لیکن تمہارے پاس خود چل کر آئی ہوں۔ سوچا اس بہانے تم سے مل لوں گی اور تمہارا گھر بھی دیکھ لوں گی۔"

چاروں اور نگاہیں دوڑاتے اس کا لہجہ کچھ تمسخرانہ سا ہو گیا۔ شہوار کو یاد تھا اس نے بہت عرصہ پہلے پھپھو کے گھر آنا چھوڑ دیا تھا اور وہ اس کی ناپسندیدگی کو فطری جھجک اور لحاظ پر محمول کرتی رہی تھی۔

اس نے لاشعوری طور پر دال کی ٹرے اپنے پیچھے کھسکا دی۔

"یہ میں تمہارے لیے لائی تھی۔" صدف نے شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی صدف؟" اس کے چمکتے چہرے کی طرف شہوار سے دیکھا نہیں گیا۔

صدف نے بھنویں اچکائیں۔

"ابھی بھی ضرورت نہیں ہے؟"

اس کے سادہ کپڑوں اور پیروں میں پہنی سیاہ دو پٹی چپل کی طرف اشارہ کیا۔

"ویسے بھی جن حالات میں تمہاری شادی ہوئی

ہے تو اچھا ہوا، شاہ ویز نے جہیز لینے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اور میرا سارا جہیز کا سامان تمہارے کام آ گیا ورنہ اماں لوگوں نے بھلا کہاں تیاری کر رکھی تھی [illegible] پھپھو...... ان کو تو [illegible]

پھپھو چائے لے آئی تھیں۔ یقیناً انہوں نے صدف کی ساری گفتگو من و عن سن لی تھی۔ آواز بلند

شہوار کو شرمندگی ہونے لگی۔

"غربت شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" کم دودھ والی سادہ چائے اور بسکٹ کو دیکھ کر شہوار نے سوچا۔

"آپ نے خوامخواہ تکلیف کی پھپھو! میں اب چائے نہیں پیتی۔"

شاید وہ پھپھو کا دل رکھنے کی خاطر ایسا کہہ رہی تھی۔ لیکن صدف کو دل رکھنا کہاں آتا تھا بھلا؟ یقیناً اس نے چائے پینا چھوڑ دی ہوگی۔

"اچھا؟ پھر کھانا کھا کر جانا۔"

پھپھو دال کی ٹرے اٹھا کر کچن میں چلی گئی تھیں۔

"کھانا؟ اوہ مائی گاڈ۔" ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے اس نے گویا جھرجھری سی لی۔ "اسی لیے تمہیں منع کیا تھا مت کرو یہاں پر شادی۔ اگر اس وقت تم نے اپنے لیے اسٹینڈ لیا ہوتا تو آج اس بوسیدہ سے گھر میں نہ بیٹھی ہوتیں جس کی دیواروں سے ہی غربت ٹپک رہی ہے۔ تم تو کھانے کے معاملے میں بالکل سمجھوتا نہیں کرتی تھیں میں حیران ہو رہی ہوں، یہ پتلے شوربے والی دال کیسے تمہارے حلق سے اتر جاتی ہے؟"

سبکتگین لب بھینچے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے پاس سے گزر کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"ہونہہ! بھرم وہ دکھائے جس کے پاس کچھ ہو۔"

"اف! یہ صدف آخر چلی کیوں نہیں جاتی؟" شہوار نے بے بسی سے سوچا۔

☆☆☆

صدف جاتے جاتے پھپھو کو اور اسے بصد اصرار اپنے گھر دعوت پر آنے کا کہہ گئی تھی۔

[illegible]

شہوار اسے چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی تھی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا، گلی کے نکڑ پر اس کا ڈرائیور سفید گاڑی سے ٹیک لگائے اس کا منتظر تھا۔

شہوار نے دروازہ بند کر دیا۔

اگلے روز پھپھو نے تو اپنی طبیعت کو جواز بنا کر دعوت پر جانے سے معذرت کر لی تھی۔ البتہ شہوار کو جانے سے منع نہیں کیا۔

"اور سبکتگین؟"

"کیا سبکتگین؟ اس کی اتنی جرأت ہے کہ وہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ کہہ سکے؟"

پھپھو کے ہلکے پھلکے لہجے پر وہ ہنس پڑی تھی۔

اماں کی کال آئی تھی۔ وہ اور دادی بھی جا رہی تھیں۔ بیٹی نے دل دکھایا تھا لیکن اب تو سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا تھا۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ تو کب تک دل میں اس کے خلاف ناراضی پالتی رہتیں۔

"تم تیار ہو جاؤ۔ کاشف تمہیں لینے آئے گا۔"

اماں سے بات کرنے کے بعد وہ الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔ سوچتے ہوئے ہینگر الٹ پلٹ کر دیکھے۔ اچانک نظر صدف کے لائے ان شاپنگ بیگز پر پڑی تھی جو اس نے یونہی الماری کے نچلے حصے میں ڈال دیے تھے۔

بوتیک کا مہنگا سوٹ نفیس سی فینسی سینڈل اور بھی کئی برانڈڈ اشیاء تھیں۔ اس نے نہا کر ڈریک بلو کلر کا وہ سوٹ پہن لیا جس پر ایمبرائیڈری کی گئی تھی۔

ایک سائیڈ سے مانگ نکال کر بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک کی تہہ جمائی اور لمبی اسٹریپ والا بیگ کندھے پر ڈالتی چادر اوڑھ کر پھپھو سے جانے کی اجازت مانگی۔

کاشف اسے لینے پہنچ گیا تھا۔ اماں اور دادی کو وہ پہلے ہی صدف کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ اور صدف کا گھر کم تھا عالی شان کوٹھی۔ شہوار تو اندر قدم رکھتے ہی دنگ رہ گئی۔ اماں اور دادی بھی یقیناً اسی قسم کی کیفیات سے دوچار ہونے کے بعد اب صوفے پر بیٹھی آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ آہستہ آواز میں تبصرے بھی کر رہی تھیں۔ شہوار ان کی طرف بڑھ گئی۔

بلیک ساڑھی میں ملبوس دلکش سی صدف والہانہ انداز میں اس سے گلے ملی تھی۔

"تھینک گاڈ! تم نے یہ سوٹ پہن لیا ورنہ تو میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہیں اپنا کوئی ٹوپیس ٹائپ جوڑا ہی پہن کر نہ آ جاؤ۔" صدف کی بات پر دادی کو پتنگے لگ گئے۔

"اے بی بی! اگر ہماری وجہ سے تیری اونچی ناک کٹ جانے کا خطرہ ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔"

یقیناً صدف نے ان کے کپڑوں وغیرہ کے بارے میں اپنے نادر خیالات کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ دادی کی برہمی کے پیچھے یہی وجہ تھی۔

"اوہو دادی! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔" ہیئر کٹ بالوں کو ایک ادا سے جھٹکتی وہ قدرے خفگی سے بولی۔ سلیولیس باریک ساڑھی کے نیچے اس کا گورا بدن دمک رہا تھا۔ کتنی جلدی وہ ان سب کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ شہوار نے بے ساختہ نگاہ چرائی۔

"تمہاری ساس نظر نہیں آ رہیں؟" اماں نے پوچھا تو وہ ویٹر کو انہیں جوس سرو کرنے کا اشارہ کرتی ناک چڑھا کر کہنے لگی۔

"وہ کہاں نظر آئیں گی اب؟"

"کیا مطلب؟" دادی نے خوش ذائقہ مشروب چھلکاتا بلوریں گلاس بمشکل اپنے ہاتھوں سے گرنے سے بچایا تھا۔

"وہ اس دعوت کے حق میں نہیں تھیں۔ اپنے تھیں تو انہوں نے پورا زور لگایا لیکن افسوس...." اس نے مصنوعی تاسف سے گردن ہلائی۔

"اس تو پھر یہ سب کس نے کیا ہے؟"

اماں کو اسٹرابری کا جوس پسند نہیں آیا تھا۔ بمشکل ایک دو گھونٹ بھر کے گلاس واپس رکھ دیا۔

"شاہ ویز نے کیا ہے۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتا۔ اسی بات کا تو صدمہ لگا ہے اس کی ماما کو جنہوں نے میری بات رد کر کے بیوی کی بات کیسے مان لی؟ "احتجاجاً گھر سے واک آؤٹ کر گئی ہیں اپنی اس چہیتی بھانجی کے پاس، دعوت ختم ہوتے ہی واپس آ جائیں گی۔"

صدف ایسے بتا رہی تھی جیسے اس کے نزدیک یہ بہت معمولی بات ہو۔ زرقا میڈم نے اسے شروع دن سے اپنی بہو تسلیم نہیں کیا تھا تو سو واٹ؟ شاہ ویز تو اس کی زلفوں کا اسیر تھا اور اس کے لیے یہی بہت تھا۔

کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ شاہ ویز کے ساتھ مہمانوں کو اٹینڈ کرتی وہ ساری تقریب پر چھائی ہوئی تھی۔

بیش قیمت بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس شاہ ویز کو اس کے ساتھ دیکھ کر شہوار کو بے ساختہ حور کے پہلو میں لنگور والی مثال یاد آ گئی۔

کھانے کے بعد وہ یونہی اٹھ کر گھر کا جائزہ لینے کی خاطر چہل قدمی کرتی کاریڈور پار کر گئی۔ بیش قیمتی ساز و سامان سے سجا وہ محل شیشے سے بنا لگتا تھا۔

"لگتا ہے سالی صاحبہ کو کھانا پسند نہیں آیا؟ کچھ اور آرڈر کروں آپ کے لیے؟" وہ گلاس وال کے پار خوب صورت لان کا منظر دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ عقب سے آتی شاہ ویز کی آواز سن کر اچھل ہی تو پڑی۔

اس کی گھبراہٹ پر وہ عجیب سا مسکرایا۔ شہوار کو تو اس کی مسکراہٹ اچھی لگی نہ آنکھیں۔ وہ سرعت سے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ غیر محسوس انداز میں شیفون کا باریک دوپٹا دونوں کندھوں پر اچھی طرح پھیلا لیا۔

"ایسی بات نہیں ہے شاہ ویز بھائی! میں کھانا کھا چکی ہوں۔" وہ جبراً مسکرائی۔

"چلو تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں۔ ویسے تم صدف کی بہن بالکل نہیں لگتیں۔ مختلف ہو اس سے۔ تمہاری جیسی لڑکیاں تو شاید اب اس دنیا میں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ ہزار صدف جیسیوں کے درمیان بالکل الگ...."

شہوار کا تنفس تیز ہوا تھا۔ "ایکسکیوزمی!" چہرے پر ناگواری لیے وہ اس کے پہلو سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتی اماں اور دادی کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

"اگر آپ لوگوں کا ابھی یہاں رکنے کا ارادہ ہے تو بتا دیں میں خود ہی چلی جاتی ہوں؟"

"نہیں.... نہیں ہم بھی بس اب اٹھ ہی رہے تھے۔ وہ صدف کہہ رہی تھی ڈرائیور چھوڑ آئے گا تو...."

اماں نے پستہ فلیور آئس کریم کا کپ میز پر رکھ دیا تھا۔ شہوار نے ایسی جلدی مچائی کہ صدف کو مجبوراً ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہنا پڑا۔

"کیا بچپنا ہے شہوار! گھر کہیں بھاگا تھوڑی جا رہا ہے۔ ابھی تو موسیقی کا پروگرام شروع ہونا ہے۔ ہمارے ہاں تو ایسی تقریبات رات گئے تک چلتی ہیں۔ ابھی صرف بارہ ہی تو بجے ہیں۔"

"ہمارے یہاں اس وقت آدھی رات کا وقت ہوتا ہے۔" شہوار جتا کر کہتی سب سے پہلے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک الگ جہاں تھا خوابناک سا۔ جسے وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ آئی تھی۔ چھو آئی تھی۔ محسوس کر آئی تھی۔ اور اب بند آنکھوں کے پار بھی ایک بار پھر وہی جہاں آباد ہو گیا تھا۔ جہاں روشنیاں تھیں مسکراہٹیں، بے فکری، تو کیا یہ طے ہے اگر پیسہ ہاتھ میں نہ ہو تو زندگی کا دامن تنگ پڑنے لگتا ہے۔

"بے سکونی، ناامیدی اور جھنجلاہٹ۔"

"افوہ! اس سے تو اچھا تھا وہاں نہ ہی جاتی۔"

اس نے جھلا کر کروٹ لی۔ سامنے سبکتگین کسی معمول کی طرح لیپ ٹاپ پر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اسے بے اختیار شاہ ویز یاد آ گیا۔ اس کی آنکھیں۔ اس کی مسکراہٹ اور وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اسے صدف کے انتخاب پر افسوس ہوا۔ ایسے دل پھینک، نظر باز اور ناشکرے انسان کی خاطر اس نے سبکتگین کو ٹھکرایا تھا۔

ایک ہی چھت تلے رہنے کے باوجود جس نے کبھی زبردستی کا استحقاق نہیں جتایا اور حق جتاتا بھی تو کیوں؟ میں کون سا اس کے دل کی خواہش بن کر اس کی زندگی میں آئی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔

خیال کی رو بھٹکی۔ صدف کے ساتھ شاہ ویز کو دیکھ کر اگر حور کے پہلو میں لنگور کی مثال تازہ ہو سکتی ہے تو اسے سبکتگین جیسے شاندار انسان کے ساتھ دیکھ کر بھی تو لوگ کچھ سوچتے ہوں گے؟

کشادہ پیشانی، مغرور ناک نقشہ اوپر سے اس کا لیا دیا انداز مقابل کو اپنی حد میں رکھتا۔

"کوئی پریشانی ہے دُر؟"

اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے وہ سر اوپر اٹھائے پوچھ رہا تھا۔ شہوار گڑبڑائی پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میری ساری پریشانی تم ہو سبکتگین ظفر۔"

اس نے کروٹ بدل لی۔ آج تو بیڈ کا نرم گدا بھی جسم کو کاٹ رہا تھا۔

☆☆☆

موسم بدلا تو پھپھو کے کچن گارڈن کے اطراف اگے کینوں کے پودوں پر بور آ گیا۔ کھٹی میٹھی سی مہک چاروں اور مہکنے لگی تھی۔ انہوں نے چھوٹے سے باغیچے میں تمام موسمی سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ ایک طرف لیموں اور انار کا پودا تھا۔ دوسری طرف امرود جہاں سارا دن گلہریاں اچھلتی کودتی رہتیں۔ صحن کے بیچ و بیچ مضبوط تناور جامن کا درخت سر اٹھائے کھڑا تھا۔

پھپھو کی دیکھا دیکھی اس نے ان پودوں کا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔

آج وہ ساتھ والی پروین خالہ کے ساتھ گروسری لینے بازار گئی ہوئی تھیں۔ شروع میں سبکتگین انہیں مہینے بھر کا سودا سلف اکٹھا لا دیتا تھا لیکن اب وہ بہت مصروف ہوگیا تھا۔ صبح کا گیا رات گئے واپس آتا تب تک شہوار سو چکی ہوتی۔

رات کو جب کبھی اس کی آنکھ لمحہ بھر کے لیے کھلتی وہ اسے اپنی مخصوص کرسی پر لیپ ٹاپ پر کام کرتا دکھائی دیتا۔ نجانے وہ سوتا کب تھا؟ اس نے گھر گروی رکھ کر بینک سے قرض لیا تھا اور چند مخصوص دوستوں کے تعاون سے اپنی اکیڈمی کھول لی تھی۔ اکیڈمی کے لیے عمارت کرائے پر لی اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کردیا۔ دن رات کی ان تھک محنت اور لگن رنگ لانے لگی تھی۔ وہ شروع سے مختلف اکیڈمیوں اور ٹیوشن سینٹرز میں پڑھاتا رہا تھا۔ کالج، یونیورسٹی کے طلبا کے لیے "سر سبکتگین" کا نام نیا نہیں تھا۔

ایک نئی راہ کھل رہی تھی۔ راستہ ناہموار اور دشوار سہی لیکن وہ اپنے قدم جما رہا تھا۔ اس روز کاشف اچانک ابا کو لے آیا۔

پیچھے اماں اور دادی بھی تھیں۔ وہ خوشی سے ابا کا مسکراتا چہرہ دیکھتی بھاگتے ہوئے ان سے لپٹ گئی تھی۔ حادثے کے بعد آج وہ پہلی بار یہاں آئے تھے۔

"بیٹی کی محبت آخر تمہیں یہاں کھینچ ہی لائی۔" تشکر کے احساس سے لبریز پھپھو کی آنکھوں میں نمی سی چمکی تھی۔ سبکتگین اس وقت گھر پر ہی تھا۔

"ہاں بھئی برخودار! بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ پاک مزید کامیابیاں سمیٹنا نصیب کرے۔"

انہوں نے پھلوں اور مٹھائی کے شاپر میز پر رکھ دیے تھے۔ شہوار کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ جب سبکتگین باہر سے سامان لے آیا۔

"تم چائے ڈالو جب تک۔"

شہوار نے حیرت سے اسے دیکھا جو اس کے قریب بیٹھ کر پلیٹوں میں سموسے، رول بسکٹ اور کیک نکالنے لگا تھا۔

"چائے؟" اس نے ایک دم جھرجھری لے کر اسے دیکھا تو خجل سی ہوئی، چائے کپوں میں ڈالنے لگی۔ سبکتگین کی نگاہوں سے اس کی ہاتھوں کی لرزش مخفی نہیں رہی تھی۔

دونوں ایک ساتھ چائے اور دیگر لوازمات کی ٹرے اٹھائے کچن سے باہر نکلے تھے۔

دادی کی دور پار کی بھانجی شمسہ کی بیٹی کے لیے کاشف کا رشتہ ڈالنے جانا تھا۔ دادی اور اماں کو تو لڑکی بہت پسند تھی۔ کاشف نے سعادت مندی سے فیصلے کا اختیار ان کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

سبکتگین کی کال آئی تو وہ معذرت کرتا اٹھ کر گھر سے باہر چلا گیا تھا۔

"سوچا تھا تم بہنیں ساتھ چلو گی تو بات پکی کر آئیں گے۔ لیکن وہ صدف تو ہمارا فون نہیں اٹھاتی۔ ہفتہ بھر سے زیادہ ہوگیا ہے اس کی کوئی خیر خبر نہیں۔ ویسے بھی وہ کہاں اس پرانے محلے میں ہمارے ساتھ جانے پر رضا مند ہوگی۔ اونچے گھر میں بیاہ کیا ہوگیا اس کی ناک تلے کچھ بیاتا ہی نہیں۔"

اماں بول رہی تھیں۔ شہوار نے ساتھ چلنے کی ہامی بھرلی۔ اگلے روز اماں اور دادی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر صدف کا نمبر ملایا لیکن اس کا نمبر ابھی تک بند جا رہا تھا۔

شہوار گہری سانس بھرتی ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے کاشف کا چہرہ بیک ویو مرر کے آئینے میں دیکھا تو وہ سوالیہ انداز میں ابرو اچکا کر اسے دیکھنے لگا۔

"ویر میرا گھوڑی چڑھیا۔" شہوار گنگنائی۔ کاشف ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

"میری بات کا جواب دیے بغیر تم باہر نہیں جا سکتے۔"

صدف کی چلاتی آواز پر شہوار کے قدم دروازے کے باہر ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"تمہارا صرف دماغ خراب ہے اور کچھ نہیں......"

شاہ ویز نے درشتی سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑوایا تھا۔

"اچھا؟ تو پھر تم ہی بتا دو وہ نایاب تمہارے ساتھ مال میں کیا کر رہی تھی؟"

"بتایا تو ہے اتفاقاً وہاں مل گئی۔"

"اچھا؟" صدف کی طنزیہ آواز گونجی۔ "اتفاقاً ہی وہ تمہیں اب مال میں مل جاتی ہے۔ اتفاقاً ہی تم اسے شاپنگ کروانے کی آفر کرتے ہو اور اتفاقاً ہی اس کے ساتھ ڈنر کرنے بیٹھ جاتے ہو۔ تم کسے بے وقوف بنا رہے ہو شاہ ویز؟"

شاہ ویز جھنجلایا۔ "ماما صحیح کہتی ہیں دن بدن تمہارا دماغ خراب ہوتا جا رہا ہے۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں یہ سب تمہاری ماما کا کیا دھرا ہے۔ لیکن میں بتا رہی ہوں شاہ ویز یہ دونوں مل کر تمہیں بے وقوف بنا رہی ہیں۔ صرف اور صرف مجھ سے بدلہ لینے کے لیے......"

"اوہ شٹ اپ! میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ اب اگر تم میری جاسوسی کرتی پائی گئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ آئی وارن یو صدف!" وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

شہوار ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

"پاگل ہوگئی ہے تمہاری بہن اسے سمجھا دو۔ سچ ہی کہتے ہیں عورت کی عقل اس کے ٹخنوں میں ہوتی ہے۔ لیکن ہر عورت کی نہیں شاید......"

اس پر ایک گہری معنی خیز نگاہ ڈالتا وہ باہر چلا گیا تھا۔ شہوار فوراً دروازہ دھکیلتی اندر آئی۔

اپنے تیز تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتی صدف نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"یہ سب کیا تھا صدف؟"

وہ ایسے تھک کر کاؤچ پر بیٹھی جیسے میلوں کا سفر پیدل طے کر آئی ہو۔

"تم دونوں تو بہت آئیڈیل زندگی گزار رہے تھے پھر اب کیا غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔"

"جب تک وہ "وچ" زندہ ہے تب تک ہمارے درمیان کچھ ٹھیک نہیں ہوسکتا۔" صدف بھڑکتے ہوئے بولی۔

"شروع دن سے ان کی کوشش رہی ہے کہ کسی طرح شاہ ویز کو مجھ سے بدگمان کرکے اس نایاب کو اس گھر میں لانے کی راہ ہموار ہوجائے۔"

"لیکن شاہ ویز بھائی تو محبت کرتے تھے تم سے؟ وہ کیوں آگئے ان کی باتوں میں؟ کیا محبت اتنی ہی کمزور اور ناقابل اعتبار ہوتی ہے صدف؟"

"محبت؟" صدف بڑبڑائی۔ شہوار کو اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگی تھی اس وقت۔

اور صدف اس کو بتا نہیں پائی تھی کہ وہ اس کی زلفوں کا اسیر ہوا تھا۔ اس کے خوب صورت چہرے اور ہوش ربا حسن پر مرمٹا تھا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا، دریافت کا پرندہ...... اسے اپنی دسترس میں کرکے اسے حاصل کرکے اب اس سے اکتانے لگا تھا۔ ایک نئے جہاں کی تسخیر کے لیے لمبی اڑان بھرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتی شکست خوردہ تاثرات مٹانے کی سعی کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہاجرہ جوس ویرہ لے آؤ۔"

دروازے پر کھڑے ہوکر ملازمہ کو آرڈر دیا۔

"وہ جی...... بڑی بیگم صاحبہ نے منع کیا ہے آپ کا کوئی بھی کام کرنے سے۔"

انہوں نے کہا آپ کو کچھ چاہیے تو خود کچن میں جا کر لیا کریں۔

ملازمہ کی منمناتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"دفع ہوجاؤ تم، بڑی بیگم صاحبہ کی چمچی......"

ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ جل اٹھا تھا۔ گالیاں دیتے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ شہوار فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"پلیز صدف خود پر قابو رکھو۔ غصہ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ کاشف کے نکاح پر تو آؤ گی نا؟"

صدف نے منتشر ذہن کے ساتھ اثبات میں

سر ہلا دیا۔

☆☆☆

مختصر عرصے میں سبکتگین کی اکیڈمی نے اپنی الگ پہچان بنالی تھی۔ اس کی دن رات کی دوڑ دھوپ کا ثمر ملنا شروع ہو گیا تھا۔ جس دن اس نے اکیڈمی کے ساتھ ملحقہ اپنا نیٹ کیفے اور کمپیوٹر سینٹر کھولنے کا بتایا تو پھپھو سجدے میں گر گئی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے تھوڑا تھوڑا کر کے بینک سے لیا قرضہ واپس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچن کی شیلف پر رکھے مسالہ جات اور دال چاول کے ڈبے خالی ہونے سے پہلے ایک بار پھر بھر جاتے۔ فریج میں تازہ دودھ، انڈے، پھل اور بریڈ ہمیشہ وقت موجود رہتے۔ پھپھو کی دوائیاں وقت سے پہلے آجاتیں۔

سبکتگین کے خون پسینے سے اگتی بے فکری اور خوش حالی کی بیلیں پھلنا پھولنا شروع ہو گئی تھیں۔

اس رات وہ معمول سے قدرے جلدی گھر واپس آ گیا تھا۔ کھلی کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکائے وہ محویت سے دور آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ کھٹکے کی آواز پر مڑ کر دیکھا۔ سبکتگین نے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"مجھے یہ نہیں چاہئیں۔" شہوار نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"رکھ لو در! کاشف کے نکاح کے لیے شاپنگ وغیرہ بھی تو کرنی ہوگی۔" اس کا لہجہ اس کے الفاظ اور پر سے اس کا یوں "در" کہنا قیامت سی ڈھا گیا۔ شہوار کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہوا۔

لیکن دماغ اف......

وہ محض اپنی ماں کو خوش کرنے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔ پہلے بھی تو ان کی خوشی کی خاطر اس سے شادی کرلی تھی۔ ہاں سبکتگین ظفر اتنا فرماں بردار تو تھا ہی۔

"بہت شکریہ! میرے پاس ہے سب کچھ۔"

اس کے پہلو سے نکل کر وہ بیڈ پر اپنا تکیہ درست کرتی کروٹ بدل گئی تھی۔

آنکھوں کے کنارے بھیگے تو دل کی بستی ڈوبنے لگی۔

"کیا میں سبکتگین سے محبت کرنے لگی ہوں؟" سینے تک اوڑھے کمبل کو دونوں مٹھیوں سے دبوچتی وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی تھی۔

☆☆☆

کہنے کو تو اس وقت کہہ دیا تھا لیکن جب کاشف کے نکاح کے لیے تیار ہونے کے لیے الماری کھولی تو ایک بھی سوٹ اس قابل نہیں لگا جو وہ اپنے اکلوتے بھائی کے نکاح پر پہن کر جاتی۔

دو "قابل غور" جوڑوں کو الماری سے نکال کر اپنے سامنے کیے الٹ پلٹ رہی تھی جب سبکتگین نے الماری کھول کر ایک شاپر اس کی طرف بڑھایا۔

"بڑے بڑے ڈائیلاگ بولنے سے پہلے اگر لمحہ بھر کے لیے سوچ بچار کرلی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

آرام سے کہتا وہ ڈریسنگ کے آئینے میں کھڑے ہو کر بال بنانے لگا تھا۔

سفید کاٹن کے کلف لگے شلوار قمیص میں آستینیں موڑے، پاؤں میں سیاہ پشاوری جوتے پہنے، نئے کٹنگ کیے بالوں کو سلیقے سے جماتا وہ سر سے پاؤں تک شاہکار تھا۔

"تیار ہو کر باہر آجاؤ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔"

برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے وہ اس کی طرف پلٹا تھا۔ شہوار نے فوراً نگاہوں کا زاویہ بدلا اس کے باہر جانے کے بعد شاپر کھولا۔ سرخ رنگ کا شیفون کا خوب صورت سا سوٹ جس پر کالے دھاگوں اور شیشے سے کام کیا گیا تھا۔

وہ ہمیشہ سیاہ، سرمئی اور مٹیالے سے رنگ پہنے رکھتی پہلی بار اتنا الگ اور کھلتا ہوا رنگ پہنا تو بہت عجیب سا محسوس ہوا۔

پھپھو نے دیکھتے ہی اس کی بلائیں لی تھیں۔ جبکہ وہ بے نیاز سا موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

شہوار کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ وہ مٹیالے رنگ پہنے یا دھانی رنگ اوڑھے اس کی نظروں میں کبھی نہیں جچ سکتی۔

اماں کے گھر رائل بلیو ساڑھی کے ساتھ ہم رنگ اسٹون کا نیکلس پہنے صدف پہ پہلی نگاہ پڑتے ہی وہ کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔ اونچی نازک ہیل نے اس کی دراز قامت کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔

"اب بھی اگر تم نہ پہنچتیں تو میں اپنا نکاح کینسل کرنے لگا تھا۔" سفید سوٹ پر سیاہ جیکٹ کو درست کرتے کاشف نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

نکاح پر صرف قریبی رشتہ داروں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ شرمائی، جھجکتی نگین کو کاشف کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ ان لوگوں پر خرچے کا اضافی بوجھ نہ پڑے یہی سوچ کر ابا نے کھانے کا انتظام اپنی طرف سے کیا تھا۔

"مبارک ہو! سنا ہے بہت کامیابیاں سمیٹ رہے ہو؟" ساڑھی کی فال درست کرتی صدف سبکتگین کی طرف چلی آئی تھی۔

"دعائیں ہیں، چاہنے والوں کی۔" کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے وہ مسکرایا تھا۔

"اتنا یقین ہے؟" صدف نے بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں پھیلائیں۔

"بالکل! یقین کے ستونوں پر ہی تو ساری عمارت کھڑی ہے۔ اعتبار، اپنائیت اور محبت کی۔"

قدرے فاصلے پر دادی کے ساتھ صوفے پر بیٹھی شہوار کی نگاہ بار بار بھٹک کر ان دونوں کی طرف اٹھ جاتی۔ کتنا کم مسکراتا تھا سبکتگین شاید ہفتے میں ایک آدھ بار اور آج...... اس نے پہلی بار اسے یوں کھل کر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا دادی نے اس کا بازو ہلایا تو وہ چونکی۔

"آہاں دادی؟"

دادی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "اے ہے دھیان کدھر ہے تیرا؟ میں پوچھ رہی تھی کہ پھپھی ساس کاشف کے کان میں کیا کھسر پھسر کر رہی تھی۔ تو تو اس وقت قریب کھڑی تھی نا اس کے؟"

"پتا نہیں دادی! میں نے دھیان نہیں دیا۔" دادی سخت بدمزہ ہوتی پہلو بدل گئیں۔ وہ دادی کو کیا بتاتی اس کا دھیان کس طرف تھا؟

رات کو جب پھپھو اور سبکتگین جانے کے لیے تیار کھڑے تھے تب اس نے کہا۔

"میں آج رات یہیں رکوں گی۔"

پھپھو نے خوش دلی سے اجازت دے دی تھی۔ سبکتگین خاموش رہا۔

"اچھا ہے پھر میں بھی آج یہیں رک جاتی ہوں۔" صدف نے بھی اچانک فیصلہ سنا دیا۔ اور ڈرائیور کو کال کر کے واپس جانے کا کہا۔

☆☆☆

"سنو! سبکتگین کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ؟"

وہ چائے بنا کر کمرے میں آئی تو صدف نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کریدنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" شہوار نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا؟ مجھے تو کچھ ٹھیک نہیں لگا۔"

"مطلب؟" کپ منہ سے لگاتے لگاتے اس نے ہٹا کر پوچھا۔

"مطلب صاف جن حالات میں تمہاری شادی ہوئی اس نے اپنی ماں کا ٹوٹا ہوا دل پھر سے جوڑنے کے لیے زبردستی اس رشتے کے لیے ہامی تو بھر لی تھی۔ لیکن کسی اداس شام میں اپنے ٹوٹے دل پر ماتم بھی تو کرتا ہوگا؟"

صدف صاف گو زیادہ تھی یا بے رحم؟ وہ اندازہ نہیں لگا پائی تھی۔

"اس نایاب کو تو تم نے دیکھ رکھا ہے نا؟ نہ تھا نہ متھا۔ کیا وہ اس قابل ہے میری برابری کر سکے؟ لیکن وہ شاہ ویز جو کل تک میرے لیے اتنا ڈولا ہوا پھر رہا تھا آج اس کے دل میں اپنی بچپن کی منگیتر کی محبت پھر سے انگڑائی لے کر جاگ گئی ہے۔"

"سارے مرد ایک جیسے تو نہیں ہوتے؟"

چائے کے اوپر جمی سیاہ تہہ کو گھورتی وہ آہستہ سے

گویا ہوئی۔ صدف نے سر جھٹکا۔

"تم بہت معصوم ہو شہوار! تمہیں نہیں پتا اندر سے یہ سارے مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ خود غرض اور انا پرست۔ ایسے معاملے میں ان کی غیرت ویسے ہی جوش مارنے لگتی ہے۔"

"بچپن کی منگیتر۔"

جن سوچوں نے شہوار کو عرصے سے سولی پر چڑھا رکھا تھا آج صدف انہیں کھول کھول کر اس کے سامنے پڑھ رہی تھی۔

"اور یہ سبکتگین تو شروع سے ہی اپنی ذات کے زعم میں مبتلا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے پھپھو کے آنکھیں بند کرتے ہی تمہیں کسی طوق کی طرح اپنے گلے سے اتار پھینکے گا۔ یہ انتہا درجے کی خود غرضی نہیں تو کیا ہے محض اپنی ماں کی خوشی اور اطمینان کے لیے وہ تمہاری زندگی ضائع کر رہا ہے۔"

ٹھنڈی پڑتی چائے کے کپ پر شہوار کی انگلیوں کی گرفت سخت پڑتی گئی تھی۔

"میری مانو تو ابھی سے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ لے لو۔ اس سے پہلے کہ سبکتگین کوئی انتہائی قدم اٹھائے تمہاری رہی سہی عزت نفس کو بھی کچل دے۔"

"پلیز صدف! میں اب سوؤں گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتی وہ منہ تک چادر تان کر لیٹ گئی تھی۔

صدف گہری سانس کھینچتی اٹھ کر باہر آگئی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی اس نے یہ سب شہوار سے کیوں کہا۔ سبکتگین کو اس نے چھوڑ دیا تھا...... اسے تو اتنی خوب صورت منگیتر کے ٹھکرائے جانے کا روگ لگ جانا چاہیے تھا۔ کجا کہ وہ شہوار کے ساتھ مطمئن زندگی گزارے...... اور سبکتگین بھی تو اب پہلے والا سبکتگین نہیں رہا تھا۔ غریب، مجبور اور بیروزگار سا سبکتگین...... کامیابی اور معاشی آسودگی نے جس کی شخصیت کو مزید باوقار بنا دیا تھا۔

شاہ ویز تو اس کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ وہ حسین تھی اور حسن پرست بھی۔

شاہ ویز کی دولت کا نشہ آہستہ آہستہ اترنا شروع ہو گیا تھا۔ اوپر سے اس کی دل پھینک فطرت۔

"آہ صدف! تمہاری عجلت پسندی تمہیں کہاں لے ڈوبی۔"

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

صدف صبح سویرے ہی بغیر ناشتا کیے واپس چلی گئی تھی۔ شہوار سست قدموں سے چلتی ابا کے کمرے میں آگئی۔

اماں ابا اس کے انتظار میں بیٹھے انہوں نے ابھی تک ناشتا شروع نہیں کیا تھا۔ ان کے کمرے میں آہستہ آواز میں نو بجے کا نیوز بلیٹن چل رہا تھا۔

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ ناشتا کرنے لگی۔ نیوز کاسٹر اب کسی نامور شخصیت کی بائیوگرافی پر روشنی ڈالتا بتا رہا تھا کیسے اپنی راہ کے کانٹے چن کر انہوں نے اوج کمال تک رسائی حاصل کی تھی۔

ابا نے اس کا خاموش، ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

"جانتی ہو در شہوار! صفر سے اپنا سفر شروع کرنے والا جب سو تک پہنچتا ہے تو اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ اپنے اس پہلے ہم قدم کو فراموش کر دے۔ جس نے راہ کی ہر صعوبت اس کے ساتھ مل کر جھیلی تھی۔"

"جی ابا! ایسا ہی ہے۔"

کتنے معصوم تھے ابا۔ اگر وہ اس کا چہرہ پڑھ کے اندرونی حال کا اندازہ لگائے اس کی ہمت بندھا رہے تھے تو اس نے بھی ان کا دل رکھنے کی خاطر بغیر کسی بحث کے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

ناشتے کے برتن اٹھا کر کچن میں دھو کر انہیں جگہ پر رکھتی وہ بالکنی میں آگئی۔ گیلری کی کھڑکیاں کھول کر جھانکا آب خورے خشک ہو چکے تھے۔

نجانے کتنے عرصے سے ان میں پانی نہیں ڈالا گیا تھا۔ بادلوں نے بھی تو روٹھ کر دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کیا تھا۔

وہ کنالیاں پانی سے لبالب بھرنے لگی۔ بھوری چڑیاں اتر کر کنالیوں میں چونچیں مارنے اور ڈبکیاں لگانے لگیں۔ وہ ان کی خوشی دیکھ کر مسکراتے ہوئے دادی کے پاس آبیٹھی۔

"شہوار! آج تم رکو گی بیٹا؟"

دادی شاید اس کے جانے کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھیں۔

"نہیں دادی! کاشف اٹھے تو اس سے کہوں گی چھوڑ آئے گا۔"

دادی کو یہی سننا مقصود تھا۔

☆☆☆

سبکتگین عجلت میں اپنا لیپ ٹاپ گھر پر ہی بھول گیا تھا۔

شہوار نے کچھ سوچ کر دھڑکتے دل کے ساتھ لیپ ٹاپ کھول لیا۔ اسے پکا یقین تھا اس سے بے خبر سوتا پا کر وہ لیپ ٹاپ کے کسی خفیہ فولڈر میں صدف کی تصویر لگائے چپکے سے اپنا غم غلط کرتا ہوگا۔

اسے حیرت ہوئی لیپ ٹاپ پر کوئی پاس ورڈ نہیں لگایا گیا تھا۔ شاید اسے پاس ورڈ لگانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اس نے تمام فولڈرز کی گیلری تک چھان ماری کہیں کوئی تصویر نہیں تھی بلکہ سارے فولڈرز اس کے کام سے متعلق معلومات سے بھرے ہوئے تھے۔

شہوار نے احتیاط سے لیپ ٹاپ بند کیا اور اٹھ کر باہر پھپھو کے پاس آگئی۔ جو اس کے بغیر بہت اداس اور اکیلی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔ سبکتگین گھر کی جدید طرز پر از سر نو تعمیر کروا رہا تھا۔

"دو ہفتوں کا ٹھیکہ دیا ہے۔ تب تک آپ دونوں ماموں کے ہاں رہ لیں۔ مجھے ویسے بھی اکیڈمی کے کچھ کاموں کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا ہے۔"

پھپھو نے خوشی خوشی شہوار کو اپنا بیگ تیار کرنے کا کہا۔

اماں اور دادی کی خوشی دیدنی تھی۔

"سبکتگین کا ارادہ تھا یہ گھر بیچ کر کسی دوسرے اچھے علاقے میں نیا گھر لے لیتے ہیں۔ لیکن میرا دل نہیں مانا۔ عجیب سی انسیت ہو گئی ہے یہاں کی زمین سے......" شہوار چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

واپس آئی تو پھپھو کہہ رہی تھیں۔

"یہ سب میری شہوار کا نصیب ہے۔ اس کے قدم رکھتے ہی میرے بیٹے کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔"

پھپھو کتنی خوش امید تھیں اور خوش گمان بھی...... شہوار نے سوچا۔

اماں کو مارکیٹ جانا تھا اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

"اچھا ہے موسم کی کچھ شاپنگ کر لینا۔" پھپھو نے پیسے اس کے ہاتھ پر رکھے۔

"میرے پاس ہیں پھپھو۔"

"تمہارے میاں کی کمائی ہے میں کون سا اپنے پلے سے دے رہی ہوں۔"

وہ شگفتہ لہجے میں بولی تھیں۔

اماں نے گھر کی چند ایک ضروری اشیاء خریدیں اس نے اپنے لیے لینن کے سوٹ لیے دو پھپھو کے لیے بھی لے لیے۔ ایک وائٹ لائننگ شرٹ اور ڈارک بلو لائننگ والی فل سلیوز شرٹ کو دیکھ کر بے ساختہ اس کا دل چاہا سبکتگین کے لیے خرید لے۔ لیکن اس نے اسے ایسا کوئی حق دیا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے گفٹ لیتی پھرے۔ افسردگی سے اس نے دونوں شرٹس واپس رکھ دی تھیں۔

واپسی پر رکشے کا ڈنڈا پکڑے وہ اردگرد سے گزرتے مناظر دیکھنے میں مگن تھی کہ اچانک چونک کر سیدھی ہوئی۔ بلا ارادہ رکشے والے کو رکنے کا کہا۔

"اماں! میں ابھی آتی ہوں صرف پانچ منٹ میں۔"

ٹریفک کے بے ہنگم شور سے قدرے ہٹ کر اس شاندار سی عمارت کے ماتھے پر "روشن سویرا اکیڈمی" کا نام جگمگا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ اندر چلی آئی۔ اس نے سبکتگین کی اکیڈمی، اس کے کمپیوٹر سینٹر اور نیٹ کیفے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا اس نے سب کچھ اتنے اعلیٰ اور بہترین انداز میں سیٹ

کر کھا تھا۔

"ارے بھابھی! آپ......"

محمود تھا سبکتگین کا بے حد قریبی دوست۔ چند ایک بار کام کے سلسلے میں سبکتگین کے ساتھ گھر بھی آ چکا تھا۔ شہوار پر نگاہ پڑتے ہی کرسی کھسکائے اٹھ کر فوراً اس کی طرف آیا تھا۔

"سبکتگین تو لاہور گیا ہوا ہے نا؟"

وہ تو اس کے طرز تخاطب "بھابھی" سے ہی ابھی نہیں سنبھلی تھی کہ اس کے سوال پر گڑبڑا گئی۔

"جی...... جی میں بس یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا دیکھتی چلوں......"

ہال میں موجود اسٹوڈنٹس اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"یہ سر سبکتگین کی وائف ہیں۔"

محمود کے تعارف کروانے پر بہت سے لبوں سے حیرت نما چیخ بلند ہوئی تھی۔

"اوہ...... واؤ...... از سو گارجیس......"

"ہائے میم! میں اکثر سوچا کرتی تھی وہ کون خوش نصیب ہیں جنہیں سر سبکتگین جیسے بہترین انسان کی لائف پارٹنر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔"

سبکتگین کے بارے میں اس سے ملتے جلتے ڈھیر سارے تعریفی کلمات سن کر اسے اندازہ ہوا طلبہ اپنے سر سبکتگین سے کس قدر والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

پرفیکٹ مین...... ایک آئیڈیل شخصیت......

شہوار کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی تھی۔ ایک بھیگی نم مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔

☆☆☆

صدف کا شاہ ویز سے زور دار جھگڑا ہوا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے رسی تڑانے کے بہانے ڈھونڈنے لگے تھے۔

"اس نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے کہ وہ جو مرضی میرے ساتھ سلوک کرتا رہے اور میں چپ بیٹھی رہوں گی۔ بھول ہے یہ اس کی......"

بیگ لا کر صحن میں پٹختے ہوئے وہ دادی کے ساتھ ان کے تخت پوش پر دھپ سے آ بیٹھی تھی۔

"ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔" اماں کا دل سارے وسوسوں میں گھرنے لگا۔

"وہ چاہتا ہے میں بوتیک چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے؟ اکثر مردوں کو پسند نہیں ہوتا کہ ان کی بیوی باہر جا کر نوکری کرے۔ جب گھر بیٹھے وہ تمہاری ساری ضروریات پوری کر سکتا ہے تو......"

"اوہو دادی! آپ سمجھ نہیں رہیں۔ مجھے گھر میں قید کر کے خود اپنی اس بچپن کی منگیتر کے ساتھ آزادی سے گلچھرے اڑانا چاہتا ہے۔ اگر مجھے گھر بیٹھ کر روٹیاں ہی تھاپنی تھیں تو سبکتگین کیا برا تھا؟"

شہوار نے بے ساختہ پھپھو کی طرف دیکھا۔

"جذبات میں آ کر اپنا گھر خراب مت کرو صدف! کچھ دن اس کی مان کر گھر بیٹھ جاؤ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو ذرا تحمل سے اپنی بات منوا لینا۔"

اماں رسانیت سے بولتی اس کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

"تحمل ہونہہ! بہت برداشت کر لیا ہے میں نے اب اور نہیں۔ میں تنگ آ گئی ہوں اس آدمی کے روز روز کے نئے مطالبوں سے، ادھر ماں چابی بھری ہے ادھر یہ دندناتا ہوا میرے سر پر پہنچ جاتا ہے۔ جیسے میں کوئی ان کی زرخرید غلام ہوں یا پھر بھاگ کر اس کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی۔"

جب عزت نفس پر چوٹ لگتی ہے تو انسان یوں ہی بلبلا اٹھتا ہے۔

ایک زخم خوردہ مسکراہٹ ابا کے بند ہونٹوں پر کرلائی تھی۔

"یہ راستہ تم نے خود منتخب کیا تھا۔"

"میں مانتی ہوں میرا فیصلہ غلط تھا۔ لیکن اب میں مزید وہاں نہیں رہ سکتی۔ میں خلع لوں گی شاہ ویز سے......"

اس نے آرام سے ایک بار پھر سب کے سروں پر بم پھوڑا تھا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ شادی کو کھیل، مذاق سمجھ رکھا ہے تم نے؟ جب موڈ ہوا کھیل لیا جب موڈ خراب ختم......"

ابا زور سے چلائے تھے۔ سانس الجھا، گردن کی رگیں پھولنے لگیں۔ شہوار اٹھ کر ان کی پیٹھ سہلانے لگی تھی۔

"سمجھاؤ اسے اپنی اور ہماری زندگی کو تماشا بنانے کا خیال دل سے نکال دے۔" ابا بمشکل بول پائے تھے۔ اور یہ تو شہوار بھی جانتی تھی وہ در صدف کی اسے کوئی بھی نہیں سمجھا سکتا تھا۔ جو ٹھان لیتی وہ کر کے ہی دم لیتی۔

اس نے شاہ ویز سے خلع لے لی تھی۔

☆☆☆

گھر کا کام مکمل ہوتے ہی سبکتگین انہیں لینے آ گیا تھا۔

صدف عدت میں تھی۔ اس نے کمرے کی کھلی کھڑکی سے جلتی ہوئی آنکھوں سے سبکتگین کے قدم سے قدم ملا کر چلتی شہوار کو دیکھا تھا۔ ان کے باہر نکلتے ہی کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔

شہوار کو لگا شاید سبکتگین انہیں غلطی سے کسی اور جگہ لے کر آ گیا ہے۔ گھر کا تو نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

اکھڑے فرش اور سیلن زدہ دیواروں والے اس بوسیدہ سے گھر کی جگہ پر جدید طرز پر بنا شاندار سا بنگلہ نما گھر دیکھ کر پھپھو نے اندر آتے ہی سب سے پہلے شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔

وہ گھر میں قرآن خوانی اور دعوت رکھوانے کے بارے میں شہوار سے مشورہ کرنے لگیں۔ وہ بجھے دل سے مسکراتی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ ایک کسک سی تھی جو اسے خوش نہیں ہونے دیتی تھی۔ ایک خوف سا دامن گیر تھا۔

سبکتگین نے کہا تھا جب وقت آئے گا وہ اپنا من پسند فیصلہ کرے گا۔ اور شہوار کو لگا وہ وقت اب آ گیا ہے۔

☆☆☆

قرآن خوانی کے بعد کھانا کھول دیا گیا تھا۔

بریانی، قورمہ اور زردے کی دیگ سے ڈھکن اٹھے تو چاروں اور اشتہا انگیز مہک پھیل گئی تھی۔ شہوار کھانے کے بعد پڑوس اور خاندان کی عورتوں کو رخصت کرنے دروازے تک خود آئی تھی۔

صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی صدف کی تمام تر توجہ کا مرکز سبکتگین ہی تھا۔ سرمئی رنگ کے شلوار قمیص میں ہمیشہ کی طرح آستین موڑے، وہ ادھر ادھر دیکھے بنا لاؤنج میں دادی کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد شہوار سب کے لیے چائے بنانے کے لیے اٹھ رہی تھی کہ پھپھو نے نرمی سے ٹوک دیا۔

"تھک جاؤ گی بیٹا! دو منٹ آرام سے بیٹھ جاؤ ذرا چائے بھی پی لیں گے۔"

"میں چائے لے آؤں پھر بیٹھی رہوں گی آرام سے کیوں ابا؟"

"بالکل!" ابا خوش گواریت سے مسکرا دیے تھے۔

"اب تو صدف کی عدت ختم ہو گئی ہے کیا سوچا ہے آگے کے بارے میں؟" پھپھو کے پوچھنے پر اماں دل گرفتی سے کہنے لگیں۔

"نادرہ آپا اپنے بھائی وجاہت کے لیے کہہ رہی ہے۔ اچھا خاص الیکٹرونک کا اپنا کاروبار ہے اس کا کوئی لمبی چوڑی سسرال کا جھنجھٹ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ مانے تب نا؟"

صدف کی طرف دیکھا تو اس نے ایک نظر لاؤنج میں موجود نفوس پر ڈالی اور آرام سے بولی۔

"شادی ہی کرنی ہے تو پھر ایرا غیرا کیوں؟ سبکتگین کیوں نہیں؟"

شہوار کے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے گرتے گرتے بچی تھی۔ ایکدم چھائے لاؤنج کے سناٹے میں کپوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز گونجی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ٹرے میز پر رکھی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟"

سب سے پہلے ابا کا سکتہ ٹوٹا تھا۔
"سبکتگین کا اس سب میں کیا ذکر؟" وہ زور سے دھاڑے۔
"وہ اب شادی شدہ ہے۔ شوہر ہے تمہاری بہن کا۔" پھر سے کھانسی کا پھندا لگ گیا۔
شہوار کے اندر اتنی بھی ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر ابا کی پیٹھ ہی سہلا سکے۔ جبکہ صدف ان کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بے خوفی سے کہہ رہی تھی۔
"کیسی شادی ابا کیسا شوہر ابا؟ سبکتگین نے صرف پھپھو کی خاطر مجبوری میں شہوار کے ساتھ شادی کی تھی۔ پیار سے بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ اور شہوار نے بھی تو صرف آپ کے حکم پر سر جھکایا تھا۔ پوچھیں اس سے کیا یہ خوش ہے اس روکھی پھیکی غیر فطری زندگی سے؟ اور سبکتگین بھلا کب تک اس زبردستی کے تعلق کو نبھائے گا؟"
شہوار نے پتھرائی آنکھوں سے خاموش بیٹھے سبکتگین کی طرف دیکھا تھا۔
"تو کیا وہ لمحہ آن پہنچا ہے؟"
ادھر صدف بے دردی سے کہہ رہی تھی۔ "سارا قصور آپ کا ہے ابا! میں نے جذبات میں آ کر انکار کر دیا تو آپ نے فوراً شہوار کی شادی اس سے کروا دی۔ آپ کو تھوڑا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ آپ کی عجلت نے ہم تینوں کی زندگی برباد کر دی ہے۔"
"بے حیا بے غیرت......" اماں اسے مارنے کے لیے اٹھی تھیں کہ دادی نے بازو پکڑ کر روک لیا۔
"یہ بے وقوف تو کچھ کہے گی نہیں تم بولو سبکتگین! بتاؤ ان سب کو کہ تم اب مزید ان چاہی زندگی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔"
شہوار کا جی چاہا وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے لیکن قدم اپنی جگہ سے ہلنے سے انکاری تھے۔ البتہ سبکتگین اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"تمہیں ضرور کوئی شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے صدف! تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں ایک ان چاہی زندگی گزار رہا ہوں! مجھ سے پوچھو تو شاید ہی اس روئے زمین پر کوئی مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب ہو جسے دکھ سکھ میں ساتھ نبھانے والی وفا شعار بیوی ملی ہے۔ بلکہ میں تو ماموں کا شکر گزار ہوں کہ ان کے عجلت میں کیے گئے فیصلے نے میری زندگی سنوار دی۔ ورنہ اس لڑکی کا میری زندگی میں شامل ہونا کسی معجزے سے کم تو نہیں......"
سبکتگین سکون سے بول رہا تھا اور صدف پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ اور ساکت بیٹھی شہوار کو لگا آج اس کا دل بند ہو جائے گا۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آیا تھا۔ شہوار دھواں دھار رونے میں مصروف تھی۔ اس کے آنے پر بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔
"جب رونے کا شغل پورا ہو جائے تو دو منٹ کے لیے میری بات سن لینا۔"
سبکتگین کے کہنے پر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر گھٹنوں سے اٹھایا تھا۔
"میری زندگی کو تماشا بنانے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔"
"خیر، حق تو میں سارے ہی اپنے پاس محفوظ رکھتا ہوں۔ کبھی جتایا نہیں یہ اور بات ہے۔"
رونے سے لال ٹماٹر ہوتا چہرہ مزید سرخ ہوا تھا۔
"بہرحال میں نہیں جانتی سب کے سامنے صدف سے جھوٹ بولنے کے پیچھے آپ کی کیا سوچ کارفرما تھی لیکن میں......"
"وہ بالکل بھی جھوٹ نہیں تھا۔"
اس کی بات کاٹتا وہ آرام سے بولا تھا۔ شہوار دونوں بھنویں اچکائے اسے دیکھنے لگی۔
"آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے؟"
"بالکل نہیں بنا سکتا۔" سبکتگین نے سعادت مندی سے اس کی بات سے اتفاق کیا۔
"اب بنے ہوئے پر کون خوامخواہ محنت کرے۔" اس کے متبسم انداز پر وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سبکتگین نے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا اور خود اس کے بالکل عین سامنے بیٹھ گیا۔

"آج تو آپ کو اپنا من پسند فیصلہ کرنے کا پورا موقع فراہم کیا گیا تھا۔ صدف سے محبت کرتے ہیں تو پھر اس کا ہاتھ کیوں نہیں تھام لیا؟" لہجہ ایک بار پھر گلوگیر ہوا تھا۔
"اس کا ہاتھ تھام لیتا تو تمہارا کیا ہوتا؟" اس کی روتی روتی گلابی آنکھوں میں جھانکتا وہ پوچھ رہا تھا۔ شہوار نے نگاہ چرائی تو سبکتگین نے اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔
"تمہیں کس نے کہا میں صدف سے محبت کرتا ہوں؟"
"کیا نہیں کرتے؟"
"بالکل نہیں، نہ آج نہ پہلے کبھی۔" وہ تیقن بھرے لہجے میں بولا۔
"تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن میری پہلی محبت تم ہی تھیں۔ میں نہیں جانتا یہ سب کب اور کیسے ہوا۔ شاید تب جب تم پھولدار فراک پہنے ہمارے گھر کے صحن میں جامنیں چننے کے لیے ٹوکری اٹھائے بھاگتی پھرتی تھیں یا پھر تب جب میں تمہارے گھر آتا تو تم ہوم ورک کرتے اپنی کاپی پنسل پھینک کر "گین آیا" بھاگی بھاگی ہوئی پانی کا گلاس میری طرف بڑھاتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں خاموشی سے پنپتا یہ جذبہ پروان چڑھتا گیا۔
اماں نے میرے علم میں لائے بغیر ماموں سے صدف کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اور جب مجھے معلوم ہوا تب شفیق جھیلتی اپنی بیمار ماں کو انکار کرنے کی خود غرض ہمت میں اپنے اندر پیدا نہیں کر سکا۔
ویسے بھی میرے دل میں تمہارے لیے فیلنگز یک طرفہ تھیں۔ تم نے تو مجھے ہمیشہ صدف کے حوالے سے ہی دیکھا تھا۔ لیکن یقین جانو ڈیئر! میں نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ اماں کی خواہش پر اس سے شادی ہو جاتی تو اچھا نہیں ہوئی تو بہت ہی اچھا۔"
وہ مدہم گھمبیر لہجے میں بولتا خاموش ہوا تو شہوار نے جیسے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں گہری سانس اپنے اندر اتاری۔
"آپ نے مجھے بے وقوف کہا۔"
خود پر بھی اس کی مخمور نگاہوں سے بزل ہوتی وہ فوراً ایک اور نقطہ ڈھونڈ لائی۔ ورنہ سبکتگین کے منہ سے اظہار سننے کے بعد تو اس کے جلتے ابلتے دل پر ٹھنڈی پھواریں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔
"تم بھی تو مجھے بزدل اور نجانے کیا کچھ کہتی رہتی تھیں؟"
سبکتگین نے آستینیں مزید اوپر چڑھا لیں۔ شہوار شپٹا گئی۔
"آپ نے ہمیشہ میری دل آزاری کی۔ کبھی مجھے اپنائیت کا احساس نہیں دلایا۔"
قدرے پیچھے کو کھسکتے ہوئے پٹاری سے ایک اور شکوہ برآمد کیا۔
"تم نے بھی تو چپکے چپکے میرے لیپ ٹاپ کی تلاشی لی اور تو اور میری غیر موجودگی میں اکیڈمی میں چھاپہ تک مارنے پہنچ گئیں۔ میں نے کچھ کہا؟"
اور تو وہ بے خبر نہیں تھا۔ سب جانتا تھا۔ شہوار نے جیسے ہار مانتے ہوئے نثار ہوتی نظروں سے اسے دیکھا تھا جو قدرت نے بن مانگے ہی اسے عطا کر دیا تھا۔
"کوئی اور فرد جرم عائد کرنی ہے تو وہ بھی بتا دو۔ یا پھر میں خود کو عدالت عظمیٰ سے باعزت بری سمجھوں؟"
اس کے انداز پر شہوار کو ہنسی آ گئی۔
"اچھا اٹھو منہ دھو کر آؤ آج اماں کے کہے بغیر تمہارے لیے بشیرے کی بریانی اور چھولے لے آیا ہوں۔"
مزے سے دونوں ہاتھ رگڑتا وہ اٹھ کر شاپر کھولتا بریانی پلیٹ میں نکالنے لگا تھا۔ شہوار سرشاری وہاں سے اٹھ گئی۔ سجدہ شکر بھی تو بجا لانا تھا۔

☆☆

صائمہ نور

رشتے کی ڈور

کبھی کبھی ایک طویل مدت ساتھ گزار کر بھی دائمی رشتے کو دیکھنے والے کبھی سمجھ نہیں پاتے۔ ان کی محبت اور تعلق کی کیسی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ ہو نہیں پاتا، بظاہر لڑتے جھگڑتے ایک دوسرے سے کیسی محبت کرتے ہیں۔ محلے کے نانا، نانی کی زندگی اس کی تصویر تھی۔

نانی اور نانا 60 سال سے ہم سفر تھے مگر وہ ان سالوں میں دہائیاں نہیں بلکہ صدیاں جی چکے تھے۔ ان کے پاس ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور ان کو زمانے سے کسی تیسرے کی حاجت بھی نہیں تھی، وہ تو ایسے خاموش قول و اقرار میں خود کو جوڑ کر سانسیں لے رہے تھے جس کا مطلب ان دونوں کا آخری لمحے تک ساتھ رہنا تھا۔

☆☆☆

"گڑ گڑ گڑ......" چھوٹی سی ڈبی میں پڑے چھکے کو پوری قوت سے ہلایا گیا۔ مگر جس قدر ہلایا گیا تھا اتنی ہی سست روی سے اس کو پھینکا گیا تھا۔ چھکا......

چھکا، چھکا بیک وقت کئی پرجوش آوازوں نے ایک ساتھ نعرہ لگایا تھا، مگر اس نشست کے باہر صحن کو پار کر کے جو کمرا تھا وہاں ان آوازوں نے محض بھنبھناہٹ کی صورت اختیار کی اور مراقبے میں گم بیٹھے کمزور سماعتوں والے وجود نے ردعمل کے طور پر بھنوؤں کو ایک سو ساٹھ کے زاویے سے اچکایا۔ ہاتھ بے ساختہ آلہ سماعت کی طرف اٹھ گئے۔ کان میں فٹ کر کے آہستگی سے لاٹھی تھام کر بڑے کمرے کی جانب چل دیے اور دروازے کے عین وسط میں کھڑے ہو کر جائزہ لینے لگے مگر ہائے رے! مجال ہے جو نانی سمیت کسی کے سر پر جوں بھی رینگی ہو۔ انہوں نے گلا کھنکھارا مگر نتیجہ صفر، سب مگن تھے۔

"دیکھو بیٹا! ہم بتائے دے رہے ہیں تم نے ہمارے ساتھ چیٹنگ کی ہے تم نے ڈبی زور سے گھمائی ضرور مگر چھکے کو ہاتھ سے نکال کر چپکے سے طرف سے رکھا۔ ایسے نہیں ٹھیائے، تم ہماری آنکھ میں دھول نہیں جھونک سکتے۔" نانی بڑے جوشیلے انداز میں بول رہی تھیں۔

"اور تم ہم بڑھیا کو اکیلے سمجھ کر بے وقوف بناتے ہو، جاؤ ہم نہیں کھیلتے۔"

یہ کہہ کر صوفے پر براجمان نانی نے لوڈو کی بساط ہی الٹ دی، بساط الٹتے ہی نانی کے دوستوں نے جھگڑا اسٹارٹ کر دیا تھا۔

"ہار گئیں، ہار گئیں۔ نانی ہار گئیں۔" اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"اے چپ کرو نگوڑ مارو! ابھی آ دھمکیں گے بڑے میاں، دوبارہ گھر میں گھسنے نہ دیں گے۔" نانی نے کہتے ہوئے ہونٹوں کے اطراف سے پان صاف کیا اور خود ہی ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسنے لگیں۔

"بہت خوب، بہت خوب...... چپ کرو بدمعاشوں!" نانا حتی الامکان زور سے چلائے، نانی نے نانا کی جانب رخ موڑا اور اکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"غضب خدا کا دیوانے ہوئے ہو کیا سب؟ یہ کم عقل عورت ہے جو محلے کے لنڈوروں کو بلا کر ہمارے بچوں کی کمائی لٹا رہی ہے۔" نانا کا اشارہ شربت کے گلاس اور بسکو کی پیٹیوں کی طرف تھا، نانی جز بز ہو کر رہ گئیں۔

نانی نے بچوں کو کھسکنے کا اشارہ کیا اور خود خمیدہ کمر کے ساتھ سینہ ٹھونک کر میدان میں اتر آئیں۔

"اے جو منہ میں آرہا ہے بکے جارہے ہو، تم تو لاٹھی اٹھا کے محلے کی سیر کو، تو ہم کیا نکل جاتے ہو، ٹکرا میں؟ ذرا ہم کو جو یہ معصوم بچے دیواروں سے سر نے آجاتے ہیں تو اب ہماری قدغن ہمارا دل بہلانے ہماری کوئی پابندی نہ لگاؤ گے، لگاؤ گے؟ مگر یاد رکھو اب کوئی پابندی نہ لگا سکو گے، ابھی فون ملاتے ہیں اپنے لڑکے کو......" نانی جلال کی انتہا پر تھیں اور بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

نانا جو نانی کو غصے میں دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ چکے تھے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے اپنے کمرے کی جانب چل دیے کیونکہ اب نانی کا زمانہ تھا۔

کچھ وقت گزرا تو رات کے نو بج چکے تھے مگر بڑھیا اور بڑے میاں کے معرکے کے بعد، اب مشکل ہی تھا کہ کم از کم اس رات کا کھانا دونوں ساتھ کھاتے، سونانی نے کھانا گرم کیا اور پلیٹوں میں نکالا۔

"کھانا نکالے دے رہے ہیں کھا لیجیے گا۔"

برآمدے میں موجود ڈائننگ ٹیبل پر کھانا رکھ کر نانی اپنا



کھانا اپنے کمرے میں لے گئیں۔ ان کی آواز کے کڑک پن نے نانا کو جتا دیا کہ مطلع ہنوز ابر آلود ہے۔ احتیاط لازم تھی۔ نانا سر جھکائے کمرے سے نکلے چپ چاپ کھانا کھایا، پھر کچھ دیر ٹہلنے کی غرض سے یہاں وہاں چکر بھی لگائے۔ نانی کے کمرے میں بھی جھانکنے کی کوشش کی مگر نانی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ سو انہوں نے چپ سادھنے میں ہی عافیت جانی۔

وہ دونوں بوڑھا، بوڑھی ایک دوسرے سے سخت نالاں تھے، زندگی ساتھ گزارنے کا کشٹ جو اٹھا چکے تھے اس قدر ساتھ رہ چکے تھے کہ محبت بھی بیزار ہو کر کہیں دور کھڑی محو تماشا تھی۔

کالی رات کے بعد ہمیشہ چمکتی صبح طلوع ہوتی ہے، ویسے ہی اس دو نفوس پر مشتمل کنبے میں بھی خوش گوار صبح نمودار ہوئی تھی، جس کی گواہی کچن سے اٹھنے والے سوجی کے حلوے کی اشتہا انگیز خوشبو دے رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ نانی ناشتے پر کوئی خاص اہتمام کرتیں، آج وہ مبارک دن تھا۔

نانی نے حلوہ پوری بنائی تھی۔

انہوں نے ڈھیرے ڈھیرے ڈائننگ ٹیبل پر برتن اور طعام سجایا پھر ہاتھ دھو کر نانا کو بلانے پہنچیں۔

''آجائیے ناشتہ تیار ہے ہم انتظار کر رہے ہیں۔'' بس اتنا ہی کہا اور جا کر بیٹھ گئیں۔

نانا دل ہی دل میں خوب خوش ہوئے کہ چلو قصہ پاک ہوا کل کے واقعے کا شائبہ تک نہ تھا ان کے لہجے میں۔

نانا بھی ٹیبل پر آگئے، نانی نے انہیں چھولوں کا سالن اور پوریاں نکال کر دیں اور خود تھوڑے سے چنے اور آدھی سے بھی کم پوری لے کر نفاست سے کھانے لگیں۔

نانا جلدی جلدی اور مزے لے لے کر کھا رہے تھے پتا نہیں دوبارہ کب نانی کا موڈ بنتا۔ نانا نے چوتھی پوری لی تو نانی رہ نہ سکیں۔

''کچھ اپنی صحت کا بھی خیال کیا کریں آپ۔ اس عمر میں اتنی خوراک، صحت اچھی کرنے کے بجائے خراب کر دیتی ہے۔''

نانا کھاتے کھاتے ایک لحظہ رکے اور گھور کر نانی کو دیکھا۔ ''ارے بڑھیا نظر کیا لگاتی ہو ہمیں، اب ٹوک دیا، اب کیا خاک ہضم ہوگا؟''

نانا نے لقمہ پورا کر کے وہیں کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

''معلوم ہوتا اس بار ٹوکنے سے رک جاؤ گے تو پہلے ہی ٹوک دیتے ہم، بیمار پڑو گے تو ہماری ہی جان پر آؤ گے۔''

نانی نے نخوت سے کہا۔

''بھئی تم نے ناشتہ تو اچھا کروا دیا مگر یہ بدشگونی کی باتیں کر کے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ ہمیں خوش دیکھ کر تمہیں الرجی ہوتی ہے شاید۔''

نانا جلے منہ سے بول رہے تھے۔

''چلو تم جیسے ناشکرے انسان نے کچھ تو مانا کہ ہم نے تمہیں ناشتا اچھا کروا دیا۔''

''اوئی ماں! کیا ہم نے کبھی تمہاری تعریف نہیں کی؟'' نانا کو شدید استعجاب نے آن گھیرا۔

''تعریف؟ مطلب بھی جانتے ہو اس لفظ کا؟'' نانی نے برملا کہا۔ ''یاد ہے کیسے سانپ سونگھ جایا کرتا تھا ہمیں تیار دیکھ کر جیسے کہ تمہاری بیوی نہیں بیوہ ہوں...... ہم۔'' نانی کے لہجے میں ہزاروں حسرتیں پنہاں تھیں۔

نانا نے آنکھیں سکوڑیں۔

''یاد نہیں، ایک بار ہم نے آتشی ساڑھی پہنی تو کیسے تمہارے کلیجے پر سانپ لوٹ گئے تھے جیسے ہم نے کسی اور کے لیے سنگھار کیا ہو؟'' نانی کے لہجے میں چبھن سی تھی۔

''ہاں تو صرف ہم نہیں تھے تب مہمان بھی موجود تھے ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری خوب صورتی کوئی اور بھی دیکھے۔''

''اے ہٹو ہم کیا بچے ہیں۔ غضب خدا کا اصل میں تو تمہاری اماں نے تمہارے کان بھرے تھے، جس کا بدلہ تم نے ہم سے نکالا۔'' نانی کے لہجے سے لگتا تھا مذکورہ واقعہ پر آج تک غصہ ہیں۔

بڑی بی! کیا کھانا کھلا کے باتیں سناتی ہو، اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ تم چائے پاپے پر ٹرخا دیتیں۔'' نانا کو زچ دیکھ کر نانی تھوڑی جزبز ہوئیں کہ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ نوراں آگئی تھی۔ نانی نے سکھ کا سانس لیا اب نانی بے فکر ہو گئی تھیں۔ کیونکہ اب سارے کام اسی نے کرنے تھے نانی بس کھانا پکاتی تھیں۔

نانا اور نانی زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے، گیارہ بچے پالنے کے باوجود اکیلے کے اکیلے تھے جس کی وجہ نانی کا اپنی راجدھانی میں کسی کی شرکت گوارا نہ کرنی تھیں۔ آٹھ بیٹے تھے، سب کی شادی کی، تین چار ماہ اپنے ساتھ رکھا، تاکہ بہوؤں کے چاؤ چونچلے پورے کر سکیں۔ کہیں بیٹوں کے دل میں کوئی ارمان نہ رہ جائے، پھر الگ کر دیتیں۔ بیٹیاں تو تھیں ہی پرایا دھن۔

وہ ایک زندہ دل اور متحرک خاتون تھیں، ان کا ماننا تھا کہ اگر بیٹھ گئیں تو بالکل ہی بیٹھ جائیں گی ہاتھ پاؤں چلاتی تھیں، اپنے زیادہ تر کام خود کرنے کی عادی تھیں۔ کسی پر بوجھ بننا یا تکلیف دینا انہیں قطعی پسند نہ تھا پھر چاہے ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہوتی۔

''جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔'' نانی اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھی پوری شدت سے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ سامنے اسکرین پر پاکستان اور انڈیا کا میچ جاری تھا۔ نوراں (کام والی) دم سادھے کبھی نانی کو اور کبھی ٹی وی کو دیکھتی۔ جس کی میچ کے بارے میں شدھ بدھ صفر تھی۔ وہ حیرت سے نانی کو تکے جاتی کیونکہ نانی دعا کے ساتھ ساتھ میچ کی صورت حال کے مطابق اپنے بیان بھی بدلتی جاتی تھیں۔ جوں ہی میچ پاکستان کے حق میں ہوتا، نانی کھلاڑیوں کے واری صدقے جاتیں اور کہتیں شیر ہیں شیر۔ اور جوں ہی کوئی شامت کا مارا آؤٹ ہوتا تو نانی فوراً نوراں سے مخاطب ہو کر دھاڑتیں۔

''ارے بٹیا! ان کا باپ بھی اتنے رن نہیں بنا سکتا۔'' اور وہ سمجھ نہ پاتی کہ نانی کی حمایت کرے یا انکار کرے۔

''ارے نوراں بٹیا! ہمیں چائے بنا دے، یہ بڑھیا تو آج اٹھے گی نہیں ٹی وی کے آگے سے، چاہے ہم مر ہی جائیں۔'' نانا نے نانی کا ارتکاز دیکھ کر نوراں کو صدا لگائی وہ فوراً اٹھ کر کچن کی طرف گئی جبکہ نانی نے ناک پر سے مکھی اڑائی، ہاتھ مسلسل تسبیح کے دانے پھیرنے میں مصروف تھا۔

☆☆☆

''اے بی سنو!'' نانی ہتھیلی پر تمباکو رکھے، رگڑ کر صاف کر رہی تھیں جب نانا ابو نے پیار سے نانی کو مخاطب کیا۔

نانی نے آن کی آن نظریں اٹھائیں اور نانا کو گھورا اتنے پیار سے مخاطب کر رہے تھے، ضرور کوئی کام ہوگا۔

''کہیے۔'' نانی نے ایک ادائے شان بے نیازی سے تمباکو منہ میں ڈال کر نانا کو جواب دیا۔

''وہ راشد کے لڑکے کا فون آیا تھا۔'' راشد ان کے مرحوم بھائی کا نام تھا۔

نانی کے کان کھڑے ہو گئے ضرور ان کی آمد ہوگی۔

''اچھا! ضرور اس پگلی کو ہمارے سر پر نازل کرنا ہوگا تب ہی تو ان کا فون آتا ہے ورنہ کہاں ہم بڈھوں کو پوچھتے ہیں۔''

''اے بی! تم تو خود اتنی خدا ترس ہو، منع تھوڑی کرو گی ہمیں معلوم ہے۔''

نانی نے بھنویں اچکائیں۔ ''ہاں جی وہ تو ہم ہیں جس کا فائدہ تم نے اور تمہارے رشتے داروں نے خوب اٹھایا۔''

''یعنی ہم ہاں بول دیں نا......'' نانا نے بے صبری سے استفسار کیا۔

''ہم ہوں......'' نانی منہ ہی منہ میں بولیں۔

جیسے ہم تو جانتے نہیں نانا اسی وقت ہاں بول دی ہوگی۔ نانی دل میں بولیں کیونکہ اس وقت، تو تو میں میں کا بالکل موڈ نہیں تھا ان کا۔

پگلی نانا کے بھائی کی بیٹی تھی، جو تھوڑی سی کھسکی ہوئی تھیں سب ان کو پگلی کہتے تھے۔ دماغی حالت کے سبب ساٹھ سال کی عمر میں کنواری ہی تھیں۔ بھائی دیکھ ریکھ کرتے، ایک بھائی کی فیملی کے ساتھ رہتی تھی جو پردیس میں مقیم تھے، ان کی فیملی کو جب بھی باہر جانا ہوتا ان کا ٹھکانہ اپنے چچا یعنی نانا نانی کے ہاں ہوتا۔ نانی اگرچہ زبان کی تیز

ضرور تھیں مگر ان کو ہمیشہ کھلے دل سے خوش آمدید کہتی تھیں۔ ان کو آنے کا عندیہ تو مل ہی چکا تھا سو دیر کس بات کی تھی۔

اگلی ہی صبح وارد ہو گئیں۔ بوٹے سے قد پہ بھاری جسم اور ہمہ وقت باچھیں کھلائے رکھنے والی منی خوب جوش و خروش سے گھر میں داخل ہوئیں۔

''چچی جان...... چچی جان، کہاں گئے چچا جان؟ ہم آگئے ہیں......''

وزنی سا بیگ جو ان کے طویل قیام کا پتا دے رہا تھا۔ ساتھ لیے وہ نانی کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

نانی لینڈ لائن پر کسی سے محو گفتگو تھیں اور نانا اپنے کمرے میں کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔

''کہاں گئے سب؟'' منی عرف پگلی تشریف لا چکی تھیں نانی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

''آئے چچی جان کیسی ہو تم؟'' والہانہ اپنی محبت کا اظہار کرتی وہ نانی سے لپٹ گئیں۔ نانی جو ان کی آمد کا شور سن کر اپنی بہن سے فون پر الوداعی کلمات ادا کر رہی تھیں۔ ان کی اس اچانک وارفتگی پر ہل گئیں۔

''آئے منی! دیوانی ہوئی ہو گیا۔ ہم بڑھیا کو ابھی گرا ہی دیتیں۔'' انہوں نے ان کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ان آنکھوں سے نظر ان کے سر کی طرف گئی۔ جہاں حسب معمول گھونسلہ بنا تھا جسے اوپر اوپر سے پانی لگا کر کنگھا کر کے بٹھا دیا گیا تھا۔ نانی کے ذہن میں ان کی پچھلی آمد اور روانگی یاد آ گئی جو نانی نے ان کے سر میں جوؤں کی ریل پیل کے سبب ہنگامی بنیادوں پر کی تھی۔

''بیٹھو بیٹا! کیسی ہو؟'' نانی نے ان کو بٹھاتے ہوئے سر سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی اور خیریت پوچھنے لگیں۔

''بس چچی جان! گزارا ہو رہا ہے، بھائی بھابھی باہر سدھارے ہیں۔ جانے اب کب لوٹیں، ہم کو تھوڑی بتاتے ہیں کہ کب آئیں گے کب جائیں گے، ہم تو ان کے گھر میں ایک اضافی بوجھ کی مانند ہیں۔'' انہوں نے لاپروائی سے ایک گہری بات کی جو نانی بخوبی سمجھ سکتی تھیں۔

''بیٹا! ابھی چائے بنائیں تمہارے لیے؟''

انہوں نے منی سے ہمدردی سے استفسار کیا۔

''نہیں چچی جان! آج تو ہمارا پائے کھانے کا دل ہے آپ بناتی بھی تو اتنے اچھے ہیں۔ آج پائے بنائیں ایک کلو ٹنڈے، ایک دن نہاری بس آگے کا پھر بتائیں گے۔''

منی کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ انہوں نے نانی کو پورے ہفتے کا مینیو بھی بتا دیا۔

نانی پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''ہم بڑھیا، تمہاری خدمت کے لیے تو بیٹھے تھے یہاں کہ تم تشریف لاؤ اور ہم کام پہ لگیں۔'' نانی نے طنزاً کہا۔

''جی جی شکریہ چچی جان!'' منی نے خوش ہو کر شکریہ ادا کیا۔ نانی پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''آہا منی بیٹا! کیسی ہو......؟'' نانا نے بھی ان کی آوازیں سن لی تھیں، اسی لیے کمرے میں ان کو آمد کا موقع دیے بغیر یہیں آ گئے۔

''چچا جان السلام علیکم!'' وہ تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔

''جیتی رہو، جیسی رہو۔'' انہوں نے سر پہ ہاتھ پھیرا اور نانی کے سامنے رکھے پلنگ پر بیٹھ گئے......

''اور بھائی کیسی ہو چمن آرا؟''

انہوں نے ان کے اصلی نام سے پکارا۔

''ٹھیک ہیں چچا جان! آج ہم بہت خوش تھے کہ چچی جان کے بنائے کھانے، کھانے کا موقع ملے گا۔'' خوشی کا اظہار آواز کے اتار چڑھاؤ سے واضح ہو رہا تھا۔

نانی جز بز ہو گئیں۔ ''ہم ذرا کچن سے آتے ہیں۔'' وہ اب مزید یہاں نہیں بیٹھ سکتی تھیں اسی لیے بہانہ بنا کر اٹھ گئیں۔

کچن میں نوراں کھانے پینے کا سب بندوبست کر چکی تھی، نانی نے اسے کھانا نکالنے کی تلقین کی اور خود نانا اور منی کو بلانے چلی گئیں۔

☆☆☆

جلتے ہیں ارمان میرا دل روتا ہے
قسمت کا دستور نرالا ہوتا ہے

منی، دنیا و مافیہا سے بے خبر گانا صرف سن اور دیکھ ہی نہیں رہی تھیں بلکہ لہک لہک کر گا بھی رہی تھیں، اپنے مخصوص صوفے پہ براجمان، پان بنانے میں مشغول تھیں اور نیچے بیٹھی منی کے جھٹکے دیکھ رہی تھیں جو وہ گانے کے ساتھ ساتھ لینے میں مصروف تھیں۔

''اے منی! بس بھی کرو...... یا کم از کم گاؤ تو مت......''

''چچی جان آواز کم کر لیتے ہیں۔'' انہوں نے سیدھا ہوتے ہوئے فرماں برداری سے کہا۔ نانی جو پان بنا چکی تھیں چٹکی سے منہ میں کتھا رکھ رہی تھیں۔

''منی بٹیا! یوں تو تمہیں کھانے پینے کی اور اپنے مطلب کی سب باتوں کی عقل ہے، کچھ اپنی صفائی ستھرائی کا بھی خیال کیا کرو نا۔'' نانی نے بات مکمل کر کے پان منہ میں رکھا۔

منی نانی کی اس بات پر تھوڑا جز بز ہوئیں مگر دماغ کہاں درست تھا۔ جب بولیں تو دور کی کوڑی لائیں۔

اچانک نیچے سے اٹھ کر نانی کے برابر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''چچی جان! آپ کو کیا معلوم......'' تقریباً گھس کر بولیں۔

''ہم بتاتے ہیں وہ جو ہے نا نرگس کا لڑکا۔''

''کون نرگس......؟''

نانی کی آواز حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''ارے وہی نرگس...... جس کا لڑکا ہے نکھٹو......''

وہ لڑکا ہماری جوؤں کا کاروبار کرتا ہے۔ ایک جوں دس روپے میں بیچتا ہے۔''

نانی کا ہاتھ بے ساختہ اپنے ماتھے پر ٹک گیا۔

''اے منی! اٹھ کھڑی ہو یہاں سے اول فول بکتی ہے۔''

''ارے چچی جان! ہمیں کیا ملے گا کسی کو بدنام کر کے......''

''کھڑی ہو یہاں سے، ویسے سب عقل، بس کام کی بات کرو تو دماغ بہک جاوے ہے تیرا......

نیچے بیٹھ اور ٹی وی دیکھ۔''

''ہم نہیں دیکھ رہے۔'' منی کا انداز روٹھا تھا۔

☆☆☆

آج نانی نے نانا اور منی کی فرمائش پر پائے بنائے تھے۔ سو دونوں بہت خوش تھے۔

''نانا کھانے پینے کے معاملے میں بالکل لحاظ کے قائل نہ تھے سو مزے لے لے کر کھائے جا رہے تھے۔

''اے بس کرو، اب ماشاء اللہ تیسرا نان کھا رہے ہو اب تو۔'' نانی نہیں رہ سکیں تو بول پڑیں۔

''ارے تم تو ہمارے کھانے پر نظر رکھتی ہو بس......''

''تم کھاتے تھوڑی ہو پیٹ بھرتے ہو......''

''آج ہم نہ رکیں گے......'' نانا نے رغبت سے کھاتے ہوئے کہا۔

''واقعی چچا جان! آج تو لطف آ گیا کھانے کا...... بہت ہی نائس ویری نائس......'' منی نے ایک ہاتھ سے چٹکی کا اشارہ کیا۔

نانی نے دونوں کو گھورا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

''طوفانی بارشوں نے گندم کی فصلوں کو شدید نقصان پہنچایا۔'' نیوز کاسٹر سلیقے سے خبریں پڑھ رہی تھی جو منی پوری دل جمعی سے دیکھ رہی تھیں۔ نانی اپنے صوفے پر بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھیں کہ آج بریانی بنانے کی فرمائش کی تھی منی اور نانا نے۔

ایک دم منی بلبلا اچھل کر بولیں۔

''چچی جان ہمیں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی......''

''کیا؟'' نانی پیاز کے سبب آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کرتے بولیں۔

''جب بارش آتی ہے تب سب انسان بھاگ جاتے ہیں، مرغے مرغیاں بھاگ جاتے، چیل کوے بھاگ جاتے...... مگر''

''مگر کیا؟'' ان کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی

تھیں، جانتی تھیں کہ کچھ انتہائی بے تکا آنے والا ہے۔

''جب سب بھاگ جاتے ہیں تو...... سبزیاں اور فصلیں کیوں نہیں بھاگ جاتیں، وہ کیوں احمق بنی کھڑی رہتی ہیں؟'' انہوں نے معصومیت سے استفسار کیا۔

''لاحول ولا منی! احمق وہ نہیں تم ہو...... پرے ہٹو عقل کی دم......''

''ہم چچا جان کے پاس بیٹھنے جارہے ہیں۔'' منی ناراضی سے اٹھ گئیں۔

''تمہارا احسان ہوگا ہم پر......'' نانی نے جل کر کہا۔

منی کو آئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا، نانی اب بے زار نظر آنے لگیں...... نانا اور منی نے مل کر نانی کو خوب ستار کھا تھا...... ماسی پورے دن کے لیے آتی سب کام کرتی، نانی بس پکانے کا کام کرتیں مگر اس قدر تھک جاتیں کیونکہ ہڈیوں میں وہ دم خم نہ رہا تھا...... کافی انتظار کیا منی جانے کا نام لیں مگر......

پلنگ پر پاؤں پسارے، گود میں نفاست سے کٹے سیب کی قاشوں کو نوابوں کی طرح کھاتی، ساتھ ساتھ ٹی وی کے مزے لے رہی تھیں کہ اچانک ٹی وی بند ہوگیا۔

کچھ دیر تو وہ ریموٹ ہلاتی رہیں۔ پھر غور کیا تو معلوم ہوا کہ پیچھے سے دھواں نکل رہا ہے۔ فوراً انہیں پلیٹ سائیڈ پر رکھی اور گلاس بھر کر پانی ٹی وی کی جالیوں میں ڈال دیا، برآمدے میں کھڑی نانی ''شوں'' کی آواز سے چونک گئیں۔

''اے منی کیا گل کھلا رہی ہو۔'' انہوں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے وہیں سے آواز لگائی۔

''ارے کچھ نہیں چچی جان! ٹی وی شاید جل گیا تھا تو پانی ڈال دیا......'' ان کی آواز میں بے فکری صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''اے کیا کہہ رہی ہو، دیوانی ہوئی ہو۔ پانی کا ہے ڈال دیا......'' نانی مارے صدمے کے صحیح سے بول بھی نہ پا رہی تھیں......

''چچی جان! جلنے پر جب دھواں اٹھ رہا ہو تو پانی ہی تو ڈالا جاتا ہے......'' اس نے نانی کی عقل پر گویا ماتم کیا......

''ٹھہرو...... تمہیں برنال بھی دیتے ہیں ہم...... اس کا لیپ بھی سود مند ہوگا......'' نانی نے جل کر کہا......

''چھوڑیں چچی جان آج کیا پکا رہی ہیں......'' لہک کر پوچھا......

''آئے ہائے پکانے کی کچھ لگتی، اپنا بوریا بستر سمیٹو اور چلتی بنو، بڑھیا سے خدمت کراتے شرم نہیں آتی، اوپر سے ہمارا تنہائی کا ساتھی ٹی وی بھی جلا دیا...... دن کا کھانا کھا کر شام تک روانہ ہو جانا...... گھر ہے ہمارا ہوٹل نہیں ہے......''

آج نانی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا تھا جس کی معیاد ہمیشہ منی کے آنے کے بعد مہینہ تک کی ہی ہوتی تھی......

''ہاں ہاں ہم تو پہلے ہی جانے کا سوچ بیٹھے تھے......'' منی نے خفت سے کہا......

''ان باتوں کی کیسے عقل ہے تمہیں...... منی۔'' نانی پوپلے منہ سے پان کھاتے ہوئے بولیں

منی اپنے پاؤں کو گھورنے لگیں......

''ہم ٹی وی والے کو فون کر دیں ابھی آجائے گا ٹھیک کرنے......'' نانی کہتے ہوئے فون کے پاس گئیں۔ پھر منی تو چار و ناچار شام کو ہی چلی گئیں اور نقار خانے میں رہ گئے پھر سے نانا اور نانی......

نانی نے اپنے محلے کے دوستوں کو آج پھر دعوت دے دی۔ اتنے دن منی کی موجودگی میں وہ ان کو بلا نہ سکی تھیں......

آج پھر لوڈو کی محفل جمی تھی...... بابا کا رپٹی تھی نانی نے رس ملائی اور حلیم سے بچوں کی تواضع کی، جو ان کے ایک بیٹے اتوار کو...... لائے تھے...... نانا بھی آج تو خوش و خرم نظر آرہے تھے...... وجہ ڈونگے میں کٹی پیاز اور لیموں سے سجی حلیم تھی...... ساٹھ سال کا ساتھ

...... سالا الگ سے تھا......

نانا جانتے تھے، نانی بچوں کے سامنے انکار نہیں کریں گی۔ نانی ان کے ہاضمے سے ڈرتیں، حلیم کی بالکل بندش کر چکی تھیں۔

نانا للچائی ہوئی نظروں سے کبھی نانی کو دیکھتے اور کبھی حلیم کو...... نانی جز بز ہوئیں......

''تھوڑا سا دیں گے بالکل......'' نانی نے ان کے بدیدے پن سے تنگ آکر بالآخر ہامی بھری۔ نانا کی تو دلی مراد بر آئی......

کھٹی میٹھی لڑائی بھی ہر وقت جاری رہتی۔ گزرتے وقت کے ساتھ، نانی کا رعب و دبدبہ بڑھا تو نانا کا یکسر کم ہوگیا تھا، جو کھانا تھا کھا چکے تھے، جو پانا تھا پا چکے تھے، وہ دونوں ایسے دور میں تھے جس میں انتظار ہوتا ہے صرف موت کا...... موت کے سناٹوں میں مدغم ہونے کا......

مگر نانی اپنا بڑھاپا، زندہ دلی سے گزارنے کی قائل تھیں...... پھر وہی ہوا جس کا نانی کو ڈر تھا، نانا کی بسیار خوری رنگ لائی...... اور نانا کو ہیضہ ہوگیا پہلے نانی سمجھیں، معمول کی الٹیاں ہیں مگر طبیعت نہ سنبھلی، بیٹوں کو فون کیا سب دوڑے چلے آئے۔ نانا کو ہسپتال داخل کرانا پڑا...... مگر جب موت اٹل ہو تو کوئی دوا کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا...... نانا پچاسی برس کی عمر میں نانی کو اکیلا کر کے رخصت ہوئے......

نانی کو بچوں، پوتوں اور بھری دنیا میں ایسی ویرانی کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ نانا جن سے بظاہر دیکھنے والوں کے نزدیک ان کی زندگی بھر نہیں بنی تھی۔ ان کے بعد نانی بھرے دیار میں تنہا رہ گئی تھیں۔ ان کے ظاہری غم سے کہیں بڑا ان کے اندر کا غم تھا۔

وہ اپنے محبوب، اپنے ہم سفر، اپنی زندگی کے سب سے قیمتی اثاثے کو کھو دینے کے بعد دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی تھیں۔ دیکھنے والے کہاں سمجھ پاتے کہ ان کا غم کیا تھا وہ کس گوہر یکتا کو گنوا چکی ہیں۔

نانی کی طویل حکمرانی کو زوال آچکا ہے۔ ان کی سلطنت دیکھتے دیکھتے بارہ بارہ ہوگئی تھی۔ انسان کا ہم سفر جب، بیچ راہ میں دھوکا دے جاتا ہے تو بچ رہنے والا نفس، آخری سانس تک کس کرب سے گزرتا ہے، اس کا اندازہ دوسرے کبھی کر ہی نہیں سکتے۔ نانا، نانی کی تو تو میں میں، ان کا ہر وقت ایک دوسرے سے الجھنا، اصل میں ان کا فکری اختلاف نہیں تھا بلکہ آخر عمر میں محبت کا وہ انداز تھا، جس کو سمجھنے کے لیے انسان کو اس عمر تک جانا پڑتا ہے۔ ان کی آپس کی نوک جھونک، جھگڑے ان کی زندگی، ان کی تازگی ان کی چلتی سانس کی علامت تھے وہ بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

بھری دنیا میں نانی کا سب سے اپنا، سب سے پیارا کیا گیا تو نانی کو بھی جاتے جاتے زندہ لاش بنا گیا۔ اب نانی بس ایک خاموش بت تھیں، جن کے پاس سوچوں کا سمندر تھا پر سننے والا تو سب کا دور جا چکا تھا۔ رشتے کھونا کیسا اذیت ناک ہوتا ہے، یہ نانی کے ساتھ گھر کے در و دیوار پر جمی گرد بھی بتا دیا کرتی ہے۔

''باجی اب آپ کو ہم۔ اکیلا نہیں چھوڑیں گے، پہلے کی بات اور تھی، اب ابا میاں نہیں رہے......''

نانی کے بچے ان کو باجی بلاتے تھے، نانی کیا کہتیں سر جھکا کر رہ گئیں۔ اب تو خدا کے بعد بچوں کا ہی آسرا تھا......

پھر اسی برس کی عمر میں نانی نے ایک اور ٹھکانہ بدلا۔ اب کی بار دل لگانا بہت مشکل ہو رہا تھا...... بہو ہر طرح سے خیال کرتی...... پاس بیٹھتی، بات چیت سے دل بہلاتی...... دنیا کے اخبار، کتابیں نانی کو میسر تھیں......

مگر نانی کو اپنے آشیانے کی یاد ہر پل ستاتی، وہی آشیانہ جس میں نانی کی حکمرانی تھی، جس میں نانی کا سکہ چلتا تھا، جہاں نانا تھے جن سے نانی کی بالکل نہیں بنتی تھی...... مگر ایک دوسرے کے بغیر دونوں کتنے ادھورے تھے، یہ بات نانی اسی برس میں جان پائی تھیں۔

☆☆

تنہائیاں سنوار دو ناں

آسیہ رئیس خان



کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بے یقینی سے چاروں سمت دیکھا۔ کمرہ اسی حالت میں تھا جیسا وہ چھوڑ گیا تھا۔ اسے تو اب یاد بھی نہ تھا کہ واپسی پر آخری بار یہ ابتری کب دیکھی تھی۔ اسے اب اس منظر کی عادت نہیں رہی تھی حالانکہ پھیلاتا وہ ہی تھا۔ کرسی کی پشت پر لٹکا تولیہ، پلنگ کی بے ترتیب چادر، الماری کے کھلے پٹ، میز کے قریب رکھے جوتے اور ان پر پڑی کل کی جرابیں۔ عرصہ ہوا اس کا کمرہ کام والی ماسی کے رحم و کرم پر نہیں تھا بلکہ کسی کی نظر عنایت اور مشقت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

"صرف عنایت اور مشقت......؟" دو شکوہ بھری آنکھوں نے اس کے قریب سرگوشی کی۔ ان آنکھوں میں لکھے اسی محنت، مشقت کے ہم قافیہ چار حرفی لفظ سے تو وہ بھاگتا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے بے ترتیب سانسوں کے بیچ ہی اس پر انکشاف ہوا تھا کہ یہ چار حرفی لفظ اب اس کے لیے محض ایک لفظ نہیں رہا۔ زبردستی اس کی زندگی میں داخل ہو کر اب یہ دل کے پاتال تک پہنچ گیا ہے اور یہ انکشاف خلاف توقع اسے خوش اور دکھی دونوں کر گیا تھا۔

ایک گہری سانس خارج کر کے اس نے دروازہ بند کیا اور آگے بڑھ کر پلنگ کی بے ترتیب سی چادر پر گر گیا۔

"کیا یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا؟" اسے خیال آیا۔

"سوری یار!" اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے تصور میں اس سے معافی مانگی۔

☆☆☆

نہ جانے وہ کب سے اس کمرے میں آ رہی تھی لیکن اس نے غور اس وقت کیا جب گرد و غبار سے پاک میز، ترتیب سے سجی کتابیں، تولیہ، جوتے جرابیں، ہیئر برش، سب جگہ پر ملنے لگے۔ یہ سب کام والی ماسی کے کام نہ تھے کہ وہ جو چیز جہاں سے اسے وہاں سے ایک انچ بھی سرکانے کا گناہ کیے بنا جھاڑو لگا کر فرش پونچھ دیا کرتی تھی۔ وہ بھی جانتی تھی اوپر چھت پر آ کر اس کے جانچتا یا شکایت کرتا تھی۔ پھر اس کے استری شدہ کپڑے الماری میں ترتیب سے رکھے ملنے لگے۔ پہلے اس نے سوچا۔ دادی نے شاید اس کے کام کی ذمہ داری سدرہ کو دے رکھی ہے لیکن پھر جلد ہی دیر رات واپسی پر اسے میز پر ہاٹ پاٹ میں کبھی بریانی ملتی تو کبھی

قورمہ، چمچ، پلیٹ اور پانی کی بوتل کے۔ ورنہ گھر میں سب جانتے تھے وہ اکثر باہر سے ہی کھانا کھا کر آتا تھا۔ کسی دن نہیں کھاتا تو خود ہی کچن میں جا کر لے لیتا تھا۔

اس کی سالگرہ پر جب اسے وہاں گلاب جامن سے بھرا پیالہ ملا اس دن وہ حقیقتاً چونکا۔ یہ کوئی خاص تھا جسے اس کی پسند کا بھی علم تھا اور اس کے خاص دنوں کا بھی۔ جلد ہی ان التفات کے ساتھ مختصر سا نوٹ بھی ہوتا۔ کبھی پڑوس میں کسی کی منگنی کی خوشی میں پلاؤ ملتا تو کبھی گھر یا پڑوس میں کسی کی سالگرہ کا۔ کبھی اس کے امتحان ختم ہونے کی خوشی میں، تو کبھی امتحانوں کی تیاری کے لیے۔ نوٹ کا سلسلہ بھی یونہی شروع نہیں ہوا تھا۔

کمرے میں در آ رہی تبدیلیوں کے نتیجے میں اپنی زندگی میں محسوس ہو رہی ہلچل اور کوڑی جوڑی پر اس نے جب اپنے آس پاس غور کرنا شروع کیا اور گھر میں آنے جانے والوں پر توجہ دی تو دو معصوم شکوہ بھری آنکھیں اس سے زیادہ دن نہ چھپ سکیں، جو ہمہ وقت اس کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ مزید توجہ اور مشاہدے سے کئی اور راز بھی کھلے۔ کمرے اور زندگی میں ہونے والی تبدیلی اور مداخلت سے دل و ذہن کے تیور بھی بدل رہے تھے اور اسے یہ بات خوش کرنے کے بجائے اداس کر گئی تھی۔ وہ اس جیسے خشک اور بے زار بندے سے بہت بہتر کے قابل تھی۔ وہ جسے محبت کرنا ہی نہیں آتا تھا، وہ کیسے اس محبت سے گندھی لڑکی کے لائق ہو سکتا تھا اس بات سے بے خبر کہ وہ اس کے قابل نہیں، یہ فکر اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے، وہ رات بھر اپنے کمرے کے آگے کھلی چھت پر کرسی ڈالے بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔

اگلی رات جب وہ واپس آیا تو اس کی میز کے سامنے والی دیوار پر تنبیہی پوسٹر لگا تھا جس پر انگریزی میں لکھا تھا 'اسموکنگ کلز' ساتھ ہی سیاہ مارکر سے اضافی غصے والا ایموجی بنایا گیا تھا۔ کوئی اور بھی اس کے ہمراہ شب بیدار تھا، یہ حقیقت اسے اور بے قرار کر گئی۔ وہ اسے باز رکھنا چاہتا تھا، یہیں اسے روک دینا چاہتا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے دراز سے مارکر نکالا اور پوسٹر پر ہی لکھا:

تو کہ وادی گل رنگ کی شہزادی ہے
دیکھ بے کار سے انساں کے لیے وقف نہ ہو
تیرے خوابوں کے جزیروں میں بڑی رونق ہے
ایک انجان سے طوفان کے لیے وقف نہ ہو

اگلی شب وہ پوسٹر دیوار سے غائب تھا۔ وہ کچھ اخذ کرتا اس سے پہلے ہی میز پر رکھی چٹ نظر آ گئی۔

مجھے ڈر ہے میرے آنسو تری آنکھوں سے نہ چھلکیں
ذرا سوچ کر سمجھ کر مجھے سوگوار کرنا
مرے بدنصیب واعظ تری زندگی ہی کیا ہے
نہ کسی سے دل لگانا نہ کسی سے پیار کرنا

بیک وقت اس کا یقین اور طنز وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا لیکن اس نے اپنی روش نہ بدلی۔

اس نظر سے جھلکتے دھنک رنگ جذبوں میں سب سے نمایاں رنگ شکایتی تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ اس آنکھ مچولی کو انجوائے کرنے لگا مگر پھر بھی سب جانتے ہوئے انجان بنا رہا۔

آج اس کا فائنل پیپر تھا۔ اسے امید تھی آج بھی کچھ خاص اس کی میز پر اس کا انتظار کر رہا ہو گا، ایک مختصر سے پیغام کے ساتھ۔ اور اب خلاف توقع کمرے کا یہ حال دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس نے کسی کا صبر آخری حدوں تک آزما لیا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کے مقابل جانے کو تیار نہ تھا۔ اس کے اپنے میٹھے سے احساسات پر یہ خیال حاوی تھا کہ وہ اس جیسا روکھا پھیکا بندہ ڈیزرو نہیں کرتی ہے۔ بھوک لگی تھی لیکن وہ نیچے جانے کے بجائے پلنگ پر پڑا رہا۔ سوچتے سوچتے ہی بالآخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

تیمور والدہ کی وفات کے وقت پانچ برس کا تھا۔ دادی اور خاندان والوں نے دوسری شادی کروانا چاہی لیکن منصور احمد نے سختی سے انکار کر دیا۔

یوں دادی بیگم ان کے ساتھ رہنے لگیں۔ بیوی کی جدائی سے نبرد آزما منصور احمد نے خود کو مصروف تر کر لیا اور آفس کے بعد کسی فلاحی ادارے میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے جانے لگے۔ وہ گھر اس وقت آتے جب تیمور سو چکا ہوتا۔

ماں کی مستقل غیر موجودگی، باپ کی عدم دستیابی کے بیچ دادی کے زیرِ سایہ تیمور خاموش اور تنہا ہوتا گیا۔ اسکول میں بھی وہ خود تک محدود رہنے والا لائق بچہ تھا۔

دادی بیٹے کا گھر اور پوتا سنبھالنے میں بے حال رہتیں۔ ساری دنیا میں وہ ہی تھیں جو اسے پاس بلاتیں، قریب بٹھا کر پیار کرتیں، گلے لگاتیں، چومتیں لیکن بڑھتی عمر، بڑھتے وزن اور کمزور ہوتے قویٰ کے ساتھ بڑھتی تھکان اور کمزوری نے محبت کے یہ اظہار بھی کم سے کم کرتے ہوئے ختم کر دیے۔ اور پھر "تیمور بہت سمجھ دار بچہ ہے۔" کہہ اور مان کر بہت کچھ اس سے چھین لیا گیا تھا۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ کتنا بھی سمجھ دار ہے تو بچہ ہی۔

کچھ سال بعد زندگی کی یکسانیت اور تنہائی سے گھبرا کے منصور احمد دوسری شادی کے لیے راضی ہو گئے۔ دادی تو دن رات یہی دعا مانگتی تھیں۔ بس پھر جلد ہی تیمور کی گیارہویں سالگرہ کے چند دن بعد فرحانہ بیاہ کر اس گھر میں آ گئیں۔

وہ فطرتاً نیک اور پُرخلوص عورت تھیں۔ انھوں نے تیمور کے قریب آنے کی کوشش کی مگر وہ مزید خود میں سمٹ گیا۔ منصور احمد کی پیش قدمی پر بھی وہ جواباً کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ انھوں بھی زیادہ تردد نہیں کیا۔

اسے باپ سے فطری محبت تھی جس کے جواب میں اسے بے توجہی اور سرد مہری ملی تھی۔

اس نے اب تک جو زندگی گزاری تھی۔ اس کے بعد اب اسے جذباتی وابستگی اور اپنائیت کا اظہار کوفت میں مبتلا کرتا تھا۔ قدرت نے اسے ممتا سے محروم کیا تھا۔

باپ نے خود اسے اپنی محبت سے محروم کر دیا اور باقی ساری محرومیاں تیمور نے خود اپنی زندگی میں شامل کر لی تھیں۔ اس کے نہ دوست تھے نہ کوئی شوق۔ وہ ذہین تھا اور اس نے خود کو کتابوں میں ہی گم رکھا تھا۔

دو سال بعد گھر میں عادل اور اس کے دو سال بعد زونا کا اضافہ ہو گیا۔ اسی سال سدرہ کی اکلوتی پھوپھو اپنی بیٹی کو دادی کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہ مشترکہ خاندان کا حصہ تھیں اور ان کے یہاں اولاد صرف بیٹوں کو سمجھا جاتا تھا۔ پھوپھو کا خیال تھا اسے اپنی نانی کے پاس بہتر پرورش اور ماحول ملے گا۔

تیمور کی زندگی میں ذرا سی تبدیلی اس کے کالج میں جانے کے بعد آئی۔ وہ ذہین اور خوبصورت تھا، نہ دوست تھے نہ دیگر دلچسپیاں اس لیے جلد ہی مغرور مشہور ہو گیا اور پھر کوئی اس مغرور کے پاس نہ پھٹکا۔ واحد صفوان تھا جو مسلسل اس کے آگے پیچھے پھرتا رہا۔ ڈیڑھ سال کی جدوجہد کے بعد وہ اس کا خول توڑ پایا تھا۔ اب وہ اس کا اکلوتا، جگری یار تھا۔

کالج کے بعد زیادہ وقت وہ صفوان کے ساتھ گزارتا۔ گھر بس سونے کے لیے آتا تھا۔ چونکہ لائق فائق بچہ تھا، تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا اس لیے گھر میں بھی کسی نے اس کے طرزِ زندگی پر کوئی سوال نہیں اٹھایا۔

چھٹیوں میں وہ کوئی پارٹ ٹائم جاب کرتا یا پھر کوئی کورس جوائن کر لیتا۔ یوں گھر سے بالکل ہی بے تعلق ہوتا گیا۔ جب اس نے چھت پر بنے کمرے میں منتقل ہونے کی بات کی تو دادی نے جواب دیا تھا کہ وہ تو مہمانوں کے لیے بنایا ہے تب سدرہ نے کہا تھا۔

"نانی! یہ ہمارے گھر کے مستقل مہمان ہیں، انھیں ہی اوپر جانے دیں۔" اور اوپر آ کر وہ مزید سب سے الگ تھلگ ہو گیا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے فون اٹھا کر وقت دیکھا۔ فجر ختم ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے اٹھ کر نماز پڑھی اور پھر کمرہ ٹھیک کرنے لگا۔ کام کرتے ہوئے اسے احساس ہوا اسے شدید بھوک لگی ہے۔

کچھ دیر کمرے میں بیٹھا رہا پھر باہر نکل آیا۔ بغل والی تین منزلہ عمارت کی وجہ سے چھت کے اس حصے میں چھاؤں ہی رہتی تھی۔ وہیں دو کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر ٹک گیا۔ نیچے خاموشی تھی مگر وہ جانتا تھا، ذرا دیر میں وہاں ہنگامے جاگ جائیں گے۔

دادی کا تخت صحن میں تھا اور باورچی خانہ بھی باقی کمروں سے الگ تھلگ برآمدے میں تھا۔ دادی، فرحانہ اور سدرہ کے علاوہ سدرہ کی چار عدد سہیلیاں بھی کچھ دیر میں وہاں پہنچنے والی تھیں۔

وہ اپنے گھروں سے زیادہ یہاں پائی جاتی تھیں۔ محلے میں سب کے علم میں تھا گھر میں کوئی خطرہ نہیں۔ اکلوتا جوان لڑکا اوپر ہوتا ہے یا سرے سے گھر میں ہوتا ہی نہیں۔ پھر فرحانہ پکانے میں مشاق تھیں اور دادی سلائی کڑھائی میں، منصور احمد کے پاس کتابیں بہت تھیں۔ ان ہی سب وجوہات کی بنا پر وہ لڑکیاں اپنے گھر سے زیادہ وقت یہاں گزارتی تھیں۔ چھٹی کے دن زونا اور عادل بھی وہیں سائیکل یا کھلونے لیے موجود ہوتے۔

یہ ساری خبر اسے اس لیے تھی کہ اب وہ بھی کبھار اس کی موجودگی میں نیچے جانے لگا تھا۔ اس کی کشش اسے کھینچتی اور اپنی کم مائیگی اسے دور جانے پر مجبور کرتی۔ اس پل اینڈ پش میں اس نے اتنے دن گزار دیے تھے لیکن فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کا سامنا کرے یا یونہی انجان بنا رہے۔ خالی صحن کو دیکھتے ہوئے وہ رات والے واقعے کی وجہ سوچ رہا تھا۔

کہیں وہ بیمار تو نہیں...... نہیں کل صبح ہی تو دیکھا تھا، ہو سکتا ہے دوپہر یا شام میں طبیعت خراب ہوئی ہو...... بیمار تو وہ اس سے پہلے بھی رہی ہے لیکن تب تو کمرے کا حال ایسا نہیں تھا، وہ تب بھی آئی تھی...... پھر اب کیا وجہ ہے...... وہ ناراض ہے...... ہاں وہ غصہ ہے...... لیکن اتنا غصہ کیوں......؟

"اچھا جیسے تم جانتے نہیں......" دل کی آواز پر اس نے پہلو بدلا۔

کل تو تم نے تصور میں اس سے سوری بھی کر لی تھی۔

ہاں تو اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں۔

کیا حقیقت میں تم کچھ نہیں کر سکتے؟

اسے اسی بات کا غصہ ہے کہ تم سب جانتے ہوئے بھی خاموش ہو، وہ کہاں تک تمھارے پیچھے آئے۔ تم پلٹ کر اسے دیکھ تو لو۔

اس سے کیا فرق پڑے گا۔

"واقعی کوئی فرق نہیں پڑے گا؟" ذہن و دل کی بحث میں "دھپ" کی آواز مخل ہوئی۔

بازو والی چھت سے سدرہ کی سہیلی ہانیہ اس طرف کودی تھی۔ اس طرف آ کر اس نے ہاتھ جھاڑ کر چھتوں کے درمیان بنی قدرے اونچی مشترکہ دیوار پر رکھا ہاٹ پاٹ اٹھایا جو تیمور کئی بار اپنی میز پر دیکھ چکا تھا۔ تیمور کی غیر موجودگی کا یقین ہونے پر ہی وہ یہ شارٹ کٹ استعمال کرتی تھی لیکن آج غلطی ہو ہی گئی۔ صحن میں اترنے والی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے اس نے یونہی گردن گھمائی، تیمور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے یوں گڑبڑائی جیسے کوئی مافوق الفطرت شے دیکھ لی ہو، پھر ہوش میں آئی اور سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

جانے وہ کتنی دیر وہاں یونہی بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ نہا کر نکلا اور کمرے کا دروازہ کھولا تو نیچے سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ کچھ سوچ کر وہ بھی نیچے چلا آیا۔ باورچی خانے کے دروازے کے باہر سدرہ کی سہیلی نمبر دو اور تین صدف اور زارا بیٹھی تھیں۔ وہ کپڑے میں رنگ لگائے دادی سے نیا

یقین کر رہی تھیں۔
سبق لے کر اب بر...
"اتنی صبح صبح یہ کام؟" انھیں دیکھ کر اس نے دل میں سوچا۔
"آج تم جلدی اٹھ گئے؟" اس کے سلام کا جواب دے کر دادی نے کہا۔
"جی وہ......" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زونا اس کی آواز سن کر دوڑتی ہوئی باہر آئی۔
"بھائی! آج مجھے واٹر کلر کا نیو باکس لا دیں گے پلیز؟" اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اس کے سرد رویے کے باوجود وہ جتنی دیر ان کے سامنے رہتا عادل اور زونا اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے۔ کچھ دنوں سے وہ فون کر کے فرمائشیں بھی کرنے لگے تھے۔
"تھینک یو۔" چونکہ چھٹی کا دن ٹی وی دیکھنے پر وقت کی پابندی نہیں تھی سو وہ اپنی بات کہہ کر واپس اندر چلی گئی۔ تب ہی فرحانہ ان دونوں کو چائے دے گئیں۔
"السلام علیکم۔" دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے اس نے بڑی گرم جوشی سے لمبا سا سلام کیا لیکن دادی کے قریب تیمور کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ یہ سدرہ کی سہیلی نمبر چار نویرا عرف ویرا تھی۔ دادی نے جواب دیا تب ہی سدرہ باورچی خانے سے باہر آئی۔
"کتاب لائی ہو یا پھر بھول گئیں؟"
"لائی ہوں۔" اس نے قریب جا کر قتیل شفائی کا مجموعہ کلام اسے تھمایا۔
"ماموں دو بار پوچھ چکے ہیں مجھ سے۔" سدرہ کتاب لے کر اندر چلی گئی اور وہ زارا، صدف کے قریب بیٹھ گئی۔
"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" تیمور نے چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا۔
جواب دادی نے اپنے گھٹنوں کے درد سے شروع کیا اور پھر فرحانہ کے چھوٹے بھائی کی شادی، عادل کی کھانسی، منصور احمد کا بلڈ پریشر اور زونا کی شرارتوں سے ہوتا آخر میں سدرہ کے پھر ایک پیپر میں فیل ہوجانے پر ختم ہوا۔
"آج تم جلدی اٹھ گئے؟" خالی کپ لینے آئی فرحانہ نے بھی وہی سوال کیا۔
"اصل میں مجھے بھوک لگی ہے، رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔" اسے کہنا ہی پڑا۔
"ارے بیٹا! تو پہلے بتانا تھا نا۔ سدرہ......!" دادی نے آواز لگائی۔
"مجھے کہیں، دادی کیا کام ہے۔" باورچی خانے سے ہانیہ برآمد ہوئی۔
"نہیں، میں بتاتی ہوں۔" فرحانہ نے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔ تب ہی عادل نے دروازے سے آواز لگائی۔
"امی! آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔" تیمور کو دیکھ کر وہ بھی صحن میں چلا آیا۔
"تم منصور کو دیکھو، یہ بچیاں بنا دیں گی، سدرہ کو بھیج دو اندر سے۔ کہاں رہ گئی۔" دادی نے کہا۔ فرحانہ نے ٹرے ہانیہ کو تھماتے ہوئے کچھ ہدایت دی اور اندر چلی گئیں۔
ہانیہ کے ساتھ ہی زارا، صدف اور ویرا بھی باورچی میں چلی گئیں۔ ذرا دیر بعد سدرہ بھی ان میں شامل ہوگئی۔ اس نے دادی کے قریب رکھا اردو اخبار اٹھا لیا۔ بظاہر وہ اخبار میں گم تھا لیکن اس کا سارا دھیان باورچی خانے میں مصروف ناراض سی آنکھوں والی لڑکی کی طرف تھا۔
"تیری دادی واپس آئی زارا؟" اسے مشغول پا کر دادی نے اونچی آواز میں پوچھا۔
"ابھی نہیں نانی، اگلے ہفتے آئیں گی۔" اس نے دروازے میں آکر جواب دیا۔ سدرہ کی سہیلیاں اسی کی طرح نانی، ماموں اور ممانی بلاتی تھیں۔
"اچھا، یعنی ویرا کی منگنی میں نہیں رہے گی۔"
"ابھی کہاں ہو رہی ہے ویرا کی منگنی؟"
"کل ہی تو اس کی ماں آئی تھی تو کہہ رہی تھی انھوں نے ساری جانچ پڑتال کر لی ہے، اچھا خاندان ہے... گے، اسی ہفتے کا کہہ رہی تھی۔"
"ویرا نے انکار کر دیا ہے تائی۔" ہانیہ نے دروازے سے جھانک کر اطلاع دی اور غائب ہوگئی۔
"ہیں...... کیوں؟ یہ آج کل کی لڑکیاں بھی......" دادی نے تاسف سے سر ہلایا۔
اندر سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ وقت بعد سدرہ نے ٹرے لا کر اس کے سامنے رکھی۔ اس کے پیچھے وہ سب بھی باہر آگئی تھیں۔
"ہانیہ کے آلو کے پراٹھے بھی رکھ دینا تھے۔" دادی نے کہا۔
"جی رکھے ہیں نانی۔"
تیمور نے ٹرے میں دیکھا۔ رات کا قیمہ، روٹی، آلو کا پراٹھا، آملیٹ، چھوٹے سے تھرماس میں چائے، خالی کپ اور پانی کی بوتل۔
"تھینکس۔" وہ ٹرے اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ سدرہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تیمور نے اس ناراض چہرے کو دیکھا تھا۔
پہلے نوالے کے لیے روٹی توڑتے ہوئے اسے روٹی کے نیچے رکھی کے ساتھ دو چھوٹی کینڈیز نظر آئیں۔ بھوک اتنی لگی تھی کہ اس نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ لیکن آملیٹ کا پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی اسے وہاں ان کی موجودگی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اس نے پانی کی آدھی بوتل خالی کر دی پھر بھی مرچوں نے جو آگ لگائی تھی وہ کم نہ ہوئی تو اس نے کینڈی منہ میں ڈال کر چبا ڈالی۔
"مرچوں جیسا ہی تیز غصہ ہے۔" اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کر سوچا۔
ڈرتے ڈرتے قیمہ اور آلو کا پراٹھا چکھا، وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ آملیٹ ایک طرف رکھ کر اس نے قیمہ اور پراٹھا کھایا۔
جب اس نے صفوان کو سارا ماجرا سنایا تو پہلے اس نے اتنے دنوں تک یہ سب چھپائے رکھنے پر اس کی سرزنش کی پھر اسے شانوں سے تھام کر بڑے پیار سے دیکھا۔
"بھائی میرے! اس سے خدمتیں کروا رہے ہو، ناز اٹھوا رہے ہو اور زبان پر قفل لگا رکھا ہے، پلٹ کر شکریہ تک نہیں کہا پھر بھی اس نے صرف 'کان' سے ہاتھ کھینچا اور مرچیں کھلائی ہیں، میں ہوتا تو......"
"تم کیوں ہونے لگے......" تیمور نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے دور کیا۔
"مثال ہے مثال...... پوری سن لو...... میں ہوتا تو کھینچ کے دور کہیں بھی دیتا۔"
"وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی، بہت نرم دل ہے۔"
"ہاں۔ وہ تو ظاہر ہے، تمھارے جیسے پتھر سے سر جو ٹکرا رہی ہے۔"
تیمور خاموش رہا۔
"اظہار محبت نہ کرو لیکن شکریہ تو کہو اسے۔" صفوان کی بات پر اس نے فوراً کہا۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ......"
"مجھ سے چاہے جتنے جھوٹ کہہ لو، بہانے گھڑ لو لیکن خود سے اقرار کر لو تب ہی اس سے کہہ سکو گے۔" وہ پھر انکار کرنا چاہتا تھا لیکن لب بھینچ لیے۔

☆☆☆

رات گھر پہنچا تو کمرہ پھر ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ گیا تھا۔ اس کا دل اداس ہوگیا کہ وہ آج بھی اس کے کمرے میں نہیں آئی۔ یہ معمولی بات نہ تھی۔ پچھلے کئی مہینوں سے کمرے کی سجی سنوری شکل کے ساتھ یہ نیا احساس اسے اچھا لگتا تھا کہ کوئی اس کمرے میں موجود ہوتا ہے اور یہ احساس اس کی تنہائی زائل کر دیتا تھا۔ دو دن سے وہ کمرے میں نہیں آئی تو کمرے کی فضا میں اس کی سانسوں کی حدت معدوم تھی۔ ہوا میں تیرتا اپنائیت کا لمس کہیں گم تھا۔ اس کمی کے ساتھ ہی تنہائی کے کیلے پن کا ناگ پھر پھن پھیلاتا محسوس ہوا اور اس کے اندر اترتی اداسی نے اس سے پل بھر میں وہ فیصلہ کروا لیا جو صفوان نہیں کروا پایا تھا۔

اگلے دن وہ سہ پہر میں ہی گھر آ گیا۔ صحن خالی تھا۔ دادی سے ملنے ان کے کمرے میں جانا ضروری تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے ہال میں داخل ہوا اور دوسری طرف سے آتی سدرہ سے ٹکرا گیا۔

"سوری۔"

"آپ تو ہیں ہی آنکھوں والے اندھے۔" وہ اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے بڑبڑائی۔

اس نے بھی دل میں تائید کی۔

"دادی کہاں ہیں؟" وہ جانے لگی تو تیمور نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔" اس نے ان کے کمرے کی سمت اشارہ کیا۔

دادی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے صحن میں ہانیہ کے سلام کی آواز سنی تھی۔

دادی کے کمرے میں حسب امید زارا اور نویرا موجود تھیں۔ دادی فون پر بات کر رہی تھیں۔ وہ ان کی بات ختم ہونے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ ان کی بات جلد ختم ہونے کے آثار نہ تھے۔ اور وہ بے آرام ہو رہا تھا۔ زارا فرش پر کپڑا پھیلائے کوئی ڈیزائن ٹریس کر رہی تھی اور نویرا بڑے غور سے دادی کی بات سن رہی تھی۔

دادی نے فون کان سے ہٹا کر نویرا کو تھمایا۔

"سدرہ کو دے دو، اس کی ماں کو بات کرنی ہے۔" نویرا فون لے کر دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

"دادی! صفوان اور میں دس دن کے لیے ہل اسٹیشن جا رہے ہیں۔" اس نے بنا کسی تمہید کے اپنا منصوبہ بیان کیا۔ باہر کچھ گرنے کی آواز آئی۔

"کیا ہوا ویرا؟" دادی نے آواز لگائی۔

"کچھ نہیں نانی! فون گرا تھا، سب ٹھیک ہے۔" وہیں سے جواب دے کر وہ چلی گئی۔

"کب جا رہے ہو؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ابھی کچھ دیر میں نکلوں گا۔"

"کل تک جاتے، کچھ مہمان آ رہے ہیں۔"

"رات کی ٹکٹس ہیں دادی۔"

"ٹھیک ہے۔ خیال رکھنا اپنا۔"

دادی کے پاس ذرا دیر رک کر وہ کمرے میں آیا اور اپنا بیگ لے کر چلا گیا۔

☆☆☆

تیمور نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا۔ حسب توقع دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ آواز سن کر قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور وہ کرسی کھسکا کر کھڑی ہوئی لیکن رخ نہیں موڑا۔ تیمور نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے سلام کیا اور آگے آیا۔ وہ اس کے پیچھے پہنچ کر رکا تب اس نے آہستہ سے سلام کا جواب دیا۔ تیمور قدم بڑھا کر اس طرح اس کے قریب ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ سر جھکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"تم کچھ لکھ رہی تھیں، رک کیوں گئیں؟"

"اب اس کی ضرورت نہیں۔"

"ہمم......" اس نے ہمم کو لمبا کھینچا۔

"ڈائریکٹ مجھ سے کہہ سکتی ہو۔"

اس نے سر اٹھا کر ان ہی شاکی نظروں سے دیکھا جنھوں نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

"تمھیں کچھ اندازہ ہے، ان آنکھوں نے مجھے کس قدر تنگ کیا ہے؟"

"آپ سے زیادہ نہیں کیا ہوگا۔"

"تو چلو، تنگ کرنے کا سلسلہ بند کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے وہ سب کہہ دیتے ہیں جو......"

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔" وہ ہی روٹھا انداز جو اس کے چہرے اور آنکھوں میں ٹھہرا رہتا تھا۔

"ہاں، تمھارا دل اس وقت مجھ سے لڑنے کا ہے بلکہ تم اس وقت مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے کا سوچ رہی ہو۔" وہ خلاف طبع شوخ ہوا مگر وہ چپ رہی۔

"مجھے نہیں اندازہ تھا تمھیں اتنا غصہ آتا ہے کہ بھوکا سلانے کے بعد مرچوں والا ناشتہ بھی دو گی۔"

"اور مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ......" جو لفظ زبان پر مچل رہا تھا وہ وہ کہنا نہیں چاہتی تھی اور دوسرا اتنا دل سوجھ نہیں رہا تھا۔

"بے حس ہوں، سنگ دل ہوں۔" تیمور نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

"نہیں...... بے وقوف ہیں۔"

"بے وقوف......؟" تیمور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"پورے پانچ ماہ دس دن ہو گئے ہیں جب میں نے پہلی بار اس کمرے میں قدم رکھا تھا اور میرے خیال سے کچھ دن بعد ہی آپ جان گئے تھے کہ یہ میں ہوں، سب جانتے ہوئے بھی چپ رہنا بے وقوفی نہیں تو کیا ہے؟" وہ تیمور کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہی تھی اور وہ اس سے صدفی صد متفق تھا۔

"تو یہ بے وقوف بندہ آج اعتراف کرتا ہے۔" "اتنے سارے بہادرانہ اقدام کے جواب یہ" سن کر اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

"میرا دل تمہاری محبت کے آگے کب کا گھٹنے ٹیک چکا، اب یہ سر جھکائے کھڑا ہے کہ سدرہ یوں تنگ کیے جانے کی کیا سزا سناتی ہے۔"

اس کی زبان سے 'تمہاری محبت' سنتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اس نے خود کو رونے سے باز رکھنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھا لیکن پھر بھی گال نم ہونے لگے تھے۔

"میں نے کئی ممکنہ رد عمل سوچے تھے لیکن یہ نہیں سوچا تھا۔" تیمور اس دل فریب منظر کو دیکھ کر گویا ہوا۔ اس نے سنبھل کر گال خشک کیے اور مسکرائی۔

"اور میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آپ اس طرح کہہ سکتے ہیں۔" اس کی شاکی آنکھیں اس وقت چمک رہی تھیں۔

"سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔" وہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے منمنایا اور سدرہ ہنسنے لگی۔

"ویسے تم کیا لکھ رہی تھیں؟" تیمور نے میز پر رکھے رائٹنگ پیڈ کو دیکھا جو خالی تھا۔

سدرہ نے اس کی کتابوں کے ساتھ رکھی پرانی ڈائری اٹھائی۔

"میں آج یہ آخری کوشش کرنے آئی تھی۔" تیمور کو کچھ یاد آیا۔

"اور شفٹ ہوتے وقت آپ یہ نیچے کمرے میں بھول گئے تھے۔" "اسکول کے زمانے میں وہ کبھی کبھی اس میں لکھتا تھا لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دن نہ چل سکا تھا۔

"ہمارے حالات ایک سے تھے کہ ہمیں اپنوں نے خود سے دور کر دیا تھا۔ رشتوں کے ہوتے ہوئے ہم تعلق کی مہربانی اور چھاؤں سے محروم تھے۔ سگے رشتوں کی بے گانگی اور بے رخی ہم دونوں کے حصے میں آئی تھی۔ آپ نے اپنے گرد فصیلیں کھڑی کر لیں، بالکل تنہا ہو گئے۔ آپ کو محبت نہیں ملی تو آپ نے خود کو محبت دینے سے بھی بری الذمہ کر لیا۔ اور مجھے اپنوں کی بے رخی، بے گانگی اور خود غرضی نے محبت اور رشتوں کا قدر داں بنا دیا، ذرا سے خلوص اور اپنائیت کو بھی میرے لیے اہم بنا دیا۔ تھوڑی سی بھی توجہ اور محبت ملی تو میں نے بہت جتن کیے کہ وہ مجھ سے چھن نہ جائے۔ نانی اور ممانی کی شفقت میں ممتا ڈھونڈ لی، ماموں کی اپنائیت کو بہت جانا، زونا اور عادل کو بالکل بڑی بہنوں والا پیار دیا۔"

وہ سانس لینے رکی اور وہ دم سادھے سن رہا تھا۔

"مجھے محبت نہ ملی تو مجھے دوسروں میں محبت بانٹنے کی اہمیت سمجھ میں آئی، میں نے اسے عادت بنا لیا اور اسی عادت نے آہستہ آہستہ میرے چاروں طرف محبتیں پھیلا دیں۔ اس ڈائری میں چند صفحے ہی لکھے تھے وہ بھی برسوں پہلے لیکن یہ پڑھ کر مجھے اس بچے کی محرومی اور تنہائی نے بڑا بے چین کیا، اس کا درد مجھے مانوس لگا اور اس بچے سے ہمدردی جانے کب تیمور احمد سے محبت میں ڈھل گئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

وہ ڈائری پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ کہنا مشکل تھا کہ تیمور اپنی نم ہوتی پلکوں پر زیادہ حیران تھا یا سدرہ کی بات پر۔

"اور میں نے آپ کی خود ساختہ فصلیں گرانے کی کوشش شروع کی۔" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تھینک یو، تمھاری یہ کوشش مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔" اس کی آواز بھیگی سی تھی۔

"ممانی بہت اچھی ہیں، ماموں بھی آپ سے بہت پیار کرتے ہیں، اس عمر میں ماموں اور دادی دونوں کو آپ کی ضرورت ہے، آپ کو فوراً سب کے ساتھ یہ فاصلے ختم کر دینے چاہئیں۔"

"شروعات تمھارے ساتھ کی تو ہے۔" اس کا انداز بدلا۔

"کل سے سب کے ساتھ نیچے کھانا کھائیں اور وقت بھی دیں۔" سدرہ نے قصداً اس کا بدلا انداز نظر انداز کر کے سنجیدگی سے کہا۔

"جو حکم!" سدرہ نے ڈائری واپس میز پر رکھ دی۔ کئی لمحے دم سادھے ان کی آواز کے منتظر مایوس سے آگے بڑھ گئے۔

"کل دادی سے ... لینے کے بعد بھی آپ کے جانے کے فیصلے پر مجھے اتنا غصہ آیا تھا کہ سوچا انھیں یہاں آنے کی زحمت نہ دوں اور ہاں کر دوں۔"

"اب اتنا بھی نہ ڈراؤ، ساری عمر تمھارے غصے سے ڈرنے کے لیے وہ مرچوں والا آملیٹ کافی ہے۔"

"کینڈی بھی دی تھی میں نے۔" اس نے جتایا۔ تیمور دھیرے سے ہنس پڑا۔

"میں صبح دادی کے اٹھتے ہی ان سے کہہ دوں گا کہ مہمانوں کو باہر کا راستہ دکھائیں اور سدرہ کے ہمیشہ یہاں رہنے کا انتظام کر دیں۔" ذرا دیر رک کر اس نے جیسے سرگوشی میں کہا۔ "بلکہ جلد اس کمرے میں پہنچانے کا انتظام کر دیں۔"

سدرہ کے چہرے پر پھیلتی سرخی بڑی دلچسپ تھی۔

ہم! میں جاؤں؟ اس نے پیروں کی انگلیاں بھینچ کر کہا۔

"تمہارا یہ روپ......" تیمور نے اس کے چہرے کے سامنے انگشت شہادت دائرے میں گھماتے ہوئے کہا۔ "پہلی بار دیکھا ہے اور۔"

"اگر میں مزید رکی رہی تو چہرے کا وہ حال ہو گا کہ صبح سب جان جائیں گے۔" اس نے اپنے گال پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا جان جائیں گے؟" یہ مغلوب اور شرمیلی سدرہ اس کے اندر نئے جذبے جگا رہی تھی۔ اس نے پھر وہی شاکی نظریں اس پر مرکوز کیں۔

"ممانی سب جانتی ہیں، وہ سمجھ جائیں گی کہ آپ کو عقل آ گئی ہے، دادی کے لیے میرا چہرہ پڑھنا مشکل نہیں۔ کہیں وہ اسے آنے والے رشتے کی خوشی نہ سمجھ لیں، اور میری دو سہیلیاں جو آپ کے فراق میں ہی گھر آئی ہیں، وہ اڑتی چڑیا کے پر گن سکتی ہیں۔" انکشاف ہی انکشاف تھے۔

"تو سہیلیاں دراصل رقیب ہیں اور ممانی سہیلی؟"

"جی۔" سدرہ کرسی ایک طرف کھسکا کر باہر جانے کے لیے بڑھی تھی۔

"پہلی ساس بہو ہوں گی جو سہیلیاں ہیں۔"

اس کے بے اختیار کہے جملے پر سدرہ نے خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کا تاثر دیکھ کر تیمور کو تھوڑا وقت لگا سمجھنے میں۔ اس نے پہلی بار اپنے اور فرحانہ کے تعلق کو تسلیم کیا تھا۔ وہ آکورڈ محسوس کرتے ہوئے مسکرا دیا۔ سچ ہے اکثر ہمارے اور خوشیوں کے بیچ کی سب سے بڑی دیوار ہم خود ہی ہوتے ہیں۔

"شب بخیر۔" دروازے کی طرف جاتے ہوئے سدرہ نے کہا۔

"کل ناشتے میں مرچیں تو نہیں ہوں گی نا؟" اس نے پوچھا۔

"صرف میٹھا!" باہر نکلنے سے پہلے سدرہ نے پلٹ کر کہا اور باہر نکل کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

☆☆

حمیرا عروش

[illegible]



ساجدہ نے بیرونی دروازے سے جھانکتے ہوئے، دکھ بھری نظروں سے سامنے والے دروازے پر موجود عمیمہ کو غضب برساتے دیکھا تھا۔ مقابل کھڑی مہربانو زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ چہرے سے ندامت صاف ظاہر تھی۔

عمیمہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں خاص چمک تھی۔

ساجدہ کو پکا یقین تھا کہ یہ سب اسے دکھانے اور جلانے کے لیے کیا گیا ہے۔ سچ بھی یہی تھا کہ مہربانو کی تذلیل پر اس کا دل دکھا تھا۔ وہ رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھی تو ساتھ ہی مہربانو کو بھی بھیجا گیا تھا۔ مہربانو جو بچپن سے اس کے ساتھ پل کر جوان ہوئی تھی، ملازمہ سے زیادہ اس کی سہیلی تھی۔

عمیمہ نے، دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مہربانو کو اندر بلا لیا۔ وہ نا بھی بلاتی تو اسے تو آنا ہی تھا۔

"پیسوں کی کمی تھی تو مجھے بتایا ہوتا۔ چند پیسوں کے عوض اپنی تذلیل کرانے کا بھوت کیسے سوار ہو گیا تم پر؟" ساجدہ خفگی بھرے انداز میں بولیں۔

"بس جی، مہنگائی نے کمر توڑ رکھی ہے۔ اطہر بھائی نے کام کرنے کا کہا تو میں انکار نہ کر پائی۔ انکار کرتی بھی تو الزام آپ پر آتا کہ آپ نے منع کر دیا ہو گا۔ ویسے بھی وہ صرف آپ کو چڑانے کے لیے مجھے باتیں سنا رہی تھیں کہ دیر سے کیوں آئی ہو؟ ان کا

مقصد تو صرف آپ کو تکلیف پہنچانا تھا ورنہ کل تو میں اس سے بھی زیادہ دیر سے ہی گئی ہوں گی، مگر ایک لفظ نہ بولی تھیں۔" بانو نے حقیقت پر مبنی تجزیہ پیش کیا تو ساجدہ خاموش سی ہوگئی۔

☆☆☆

پہلے بیٹے کی شادی پر دل میں جہاں سو ارمان تھے، وہیں ایک خدشہ بھی پھن پھیلائے ناگ کی مانند موجود تھا۔ سالوں لگا کر جو ایک ایک خوشی دامن میں سمیٹی تھی۔ وقت کی کسی تند و تیز آندھی کی نذر نہ ہوجائے۔

خوف، ڈر، وہم اور اندیشے ہمیشہ یوں ہی نہیں دل میں پنپ جاتے۔ اکثر کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

وہ ایک اصول پسند عورت تھیں۔ پانچ برس قبل شوہر کے انتقال کے بعد جوڑ توڑ کرنے کی جو عادت پڑی تو آٹا، گھی، تیل، نمک سب ناپ تول سے استعمال کرنے لگیں۔ ضرورت سے کچھ زیادہ حساس ہوگئیں جب کہ عمیمہ کے سر پر زیادہ تر سسرال والوں کو، اپنے ہاتھ کے ذائقوں کا اسیر کرنے کا بھوت سوار رہتا۔ ہمہ وقت یوٹیوب کے ریسپی شوز چلتے رہتے اور ساجدہ کا بنا بنایا ڈسپلن خاک میں مل جاتا۔

پہلے سوچا کہ شروع میں نئی نویلی بہو کو ٹوکنا مناسب بات نہیں۔ چند روز کا شوق چڑھا ہے۔ اتر جائے گا۔ مگر وہ تو کچن میں صبح، شام، دوپہر ڈیرا ہی جمائے رکھتی تھی۔ تنگ آکر ساجدہ کو شکایت لگاتے ہی بنی۔

اطہر کے سمجھانے پر وہ منہ پھلا کر رہ گئی۔ کام سے مکمل طور پر ہاتھ کھینچ لیا۔ ساجدہ نے کلمہ شکر ادا کرتے ہوئے اسی پر اکتفا کیا۔ اسے بلاوجہ الجھنے کی عادت تھی اور نہ ہی اپنی مرضی، دوسروں پر مسلط کرنے کا کوئی شوق تھا سو صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

عمیمہ امید سے ہوئی تو جیسے ساجدہ کی امید بر آئی۔ اس گھر میں کسی بچے کی قلقاریاں گونجے کئی برس گزر چکے تھے۔ قدرت نے بیٹی کی رحمت سے تو نوازا نہیں تھا، سو پہلی بہو کے ہاں بیٹی کی پیدائش کی دعائیں مانگنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دعائیں وظائف میں ڈھل گئیں۔

عمیمہ ان دنوں ہتھیلی کا چھالا بنی ہوئی تھی۔ ساجدہ کو یوں بھی بیٹی نصیب نہیں ہوئی تھی تو دل و جان سے اس کے نخرے اٹھا کر خوشی محسوس کرتی۔

☆☆☆

آخری مہینے میں ساجدہ کے ہاتھ میں ہمہ وقت تسبیح اور پیشانی پر تفکر کی لکیریں رہنے لگی تھیں۔ بہو کی ذمہ داری سے خیر خیریت سے سبک دوش ہونا چاہتی تھیں۔ بالآخر وہ وقت بھی آن پہنچا۔ عمیمہ صبح سے آہستگی سے اٹھتے دردوں سے آگاہ کر رہی تھی۔

ساجدہ خود کو اماں بی (اپنی ساس) محسوس کر رہی تھیں۔ وقت جیسے سالوں کا سفر طے کر گیا تھا۔ وہ ماں کی طرح گرم دودھ میں دیسی انڈا پھینٹ کر عمیمہ کو پلا کر کچن میں آگئیں۔

"اماں! اسپتال چلتے ہیں۔" کچھ دیر بعد اطہر ان کے پیچھے آیا۔

انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ اماں بی ایسے دودھ کے بعد کیا دیا کرتی تھیں سو مطمئن انداز میں گویا ہوئیں۔

"ابھی کہاں؟ ابھی تو وقت ہے۔ بیٹا! ذرا وقت گزر جائے تو لے جائیں گے۔ ڈاکٹرز کو زیادہ وقت مل جائے تو آپریشن کر دیتے ہیں۔ چیر پھاڑ کرنے کا بہانا چاہیے ہوتا ہے انہیں۔" وہ ابلتے قہوے کو کپ میں انڈیلتے ہوئے بڑے جہاں دیدہ انداز میں بولیں۔ اطہر آپریشن کا نام سنتے ہی مزید سہم گیا۔

خیر قہوہ پینے کے بعد عمیمہ کی حالت ایک دم بگڑنا شروع ہوگئی۔ بھاگم بھاگ اسپتال پہنچے مگر چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اطہر کے دستخط لے کر عمیمہ کو آپریشن تھیٹر بھیج دیا۔

مگر وہ آپریشن کے بعد بھی صاحب اولاد نہ ہوسکے۔ مردہ بچی کو جنم دینے اور یہ تلخ حقیقت جان لینے کے بعد ان پر مردنی چھا گئی۔ آنکھوں سے سیل رواں تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ ڈاکٹر نے تاخیر سے اسپتال پہنچنے کو بچی کی موت کی وجہ قرار دے دیا۔ اطہر کو اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دینے پر اچھی خاصی کلاس لی۔

وہ خود صدمے کی کیفیت میں تھا اور خود کو ایک مجرم تصور کر رہا تھا۔

بجلی تو ساجدہ پر بھی گری تھی۔ عمیمہ کا "حد" سے زیادہ خیال رکھنے کا انعام یہ ملا تھا۔ لمحوں میں ساجدہ کو دنیا گھومتی ہوئی لگی تھی۔

☆☆☆

"قاتل! تم قاتل ہو...... میری بچی کی قاتل!"

اسپتال سے آنے کے بعد عمیمہ نے ان سے پہلی بات یہ کی تھی۔ وہ لرز کر رہ گئیں۔ لب کپکپا گئے۔ الفاظ ندارد تھے۔ بانو ان کا ہاتھ پکڑ کر عمیمہ کے کمرے سے باہر لے گئی۔

عمیمہ نے ماں کو فون کر کے بلایا اور میکے چلی گئی۔ اطہر نے روکنے کی کوئی سعی نہ کی۔ وہ اب ماں سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔

عمیمہ نے واپس آنے کے لیے الگ گھر کی شرط رکھ دی۔ اطہر تو ویسے بھی ازالہ کرنے کی راہ سوچ رہا تھا۔ فی الفور سامنے والا مکان (جو ساجدہ نے شوہر کی زندگی میں کمیٹیاں ڈال کر خرید لیا تھا اور خرید کر کرایہ پر چڑھا رکھا تھا) کو خالی کرا کر وہاں اپنا سامان سیٹ کرلیا۔ ماں سے پوچھنا تو درکنار آگاہ کرنا تک گوارا نہ کیا۔ مہر بانو، ساجدہ کو سکتے کی سی حالت میں دیکھتی اور تسلی دیتی۔

"اچھا ہے نا، ذرا دور رہیں گے تو آپ کو ہر وقت کے اس احساس جرم سے نجات ملے گی۔ کبھی کبھار کا سامنا ہو مگر اچھا ہو۔"

☆☆☆

عمیمہ اور اطہر کے جانے کے بعد دن اسی ڈگر پر چلے آئے۔ گھر یا کچن کے کاموں میں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا۔ کام برسوں پرانے طریقے سے ہی کرتیں مگر ہاتھوں میں پہلے والی جان نہیں رہی تھی۔ بازوؤں میں وہ ولولہ اور جوش سب ندارد تھا، جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ حالت خراب رہنے لگی تھی۔

"امی! میں نے ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لی ہے۔ آج شام آپ تیار رہیے گا۔ ہم آپ کے چیک اپ کے لیے جائیں گے۔" دوسرے نمبر کا بیٹا اظہر جو اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتا تھا۔ وہ اس بات کا معترف تھا کہ کس طرح باپ کے انتقال کے بعد ماں نے اس گھر کو سنوارنے میں اپنی تمام تر قوتیں صرف کی تھیں۔

☆☆☆

ساجدہ کے مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔ ساتھ ہی اظہر کی پیشانی پر شکنوں کا جال گرفت پکڑتا رہا۔ ڈاکٹر کا اندیشہ، حقیقت کا بھیانک روپ دھار کر سامنے آموجود ہوا۔ اس نے ان دو سالوں میں پہلی بار بھائی کے در پر دستک دی تھی۔ دروازہ کھولنے کے بعد اطہر اسے سامنے موجود پا کر ششدر رہ گیا تھا۔ دل میں کچھ انہونی کا خیال خوف کی لپیٹ میں پھیلا تھا۔ وہ اندر آنے کا بھی نہ کہہ سکا۔

"بھائی! امی کو کینسر ہوگیا ہے۔"

وہ بھول گیا تھا کہ یہ وہی بھائی ہے۔ جس کی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے اور رکنے کی آواز سن کر ماں صبح شام آنسو حلق سے نیچے اتارتی ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ ایک بار گھر کی دہلیز پار کرنے کے بعد اس بھائی نے دوبارہ وہاں قدم نہ رکھا تھا۔ وہ بس گلے لگ کر اس کندھے پر آنسو بہا رہا تھا۔ جس میں سے باپ کی سی مہک اٹھ رہی تھی۔

☆☆☆

عمیمہ کو اس بات کا علم ہوا تو خوشی سے جھوم اٹھی۔

"اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔ میری بچی ماری تھی تو خود بھی کینسر کا شکار ہوگئی۔ سچ ہے کہ اپنے

کیے کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔"
اطہر خاموش رہا۔ دل اس کی تردید کرنا چاہ رہا تھا مگر لبوں پر قفل پڑ گیا، ذہن الفاظ سے خالی ہو گیا۔

☆☆☆

کبھی کبھار وہ مہر بانو سے بڑے غم زدہ انداز میں کہتیں۔ "ذرا با اختیار ہونے کے بعد، ہم کیوں اپنی زندگی کے تجربات سے دوسروں کی زندگیاں ناپنے لگتے ہیں۔ بانو! یہ ناپ تول تو اوپر والے کے کام ہیں۔ کبھی بھی ہم اپنے بڑے ہونے کا اچھا ثبوت پیش نہیں کرتے۔" دل کی خلش تھی کہ کسی طور مٹنے کا نام ہی نہ لیتی۔

عمیمہ کے ہاتھ گویا مشغلہ آ گیا تھا۔ اس کے نزدیک قدرت کی جانب سے ساجدہ کا گناہ ثابت ہو گیا تھا۔ وہ اسے ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ انہیں تکلیف پہنچا کر دلی سکون حاصل کرتی۔

ساجدہ خاموش رہتیں۔ یہ خاموشی مجرم کی تھی کہ صابر کی۔ مہر بانو دل ہی دل میں اندازے ہی لگاتی رہتی۔

☆☆☆

ساجدہ نے جھٹ پٹ اطہر کا سادگی سے نکاح اور چھوٹے بیٹے کی منگنی کر دی تھی۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہ تھا۔ جاتے جاتے جو فرائض بچے تھے۔ ان سے سبک دوش ہونا چاہتی تھیں۔

عمیمہ ایک روز مٹھائی کا ڈبہ لیے چلی آئی۔ چہرے پر طنزیہ اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ جاتے ہوئے زبان کا زہر بھی مٹھائی کے ساتھ شامل کر دیا۔

"مبارک ہو۔ دادی بننے والی ہو۔ اب میرے بچے کو مار کر دکھانا!" ساجدہ ایک بار پھر زمین میں گڑ سی گئیں۔

نیکی یوں بھی گلے پڑتی ہے اور بہت برا پڑتی ہے۔

☆☆☆

اس بار وہ سچ مچ زمین میں گڑھ گئیں، مٹی اوڑھ لی اور دنیا سے کنارہ کر لیا۔

ایک لمحے کے لیے عمیمہ کا دل لرزا تھا اور پھر وہ اپنے دل پر تعجب کرتی بڑبڑا اٹھی تھی۔

"اچھا ہے۔ خس کم، جہاں پاک!"

☆☆☆

جب قسمت کا لکھا، قدرت کے اٹل فیصلے کا روپ دھار لے تو زمین والوں کی، مثبت کوششیں منفیت کا روپ دھار لیتی ہیں۔

"بہت زیادہ بی پی ہائی ہونے کی وجہ سے بچہ جانبر نہ ہو سکا"۔ ڈاکٹر نے دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے نومولود کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اطہر کو تھماتے ہوئے آگاہ کیا۔

☆☆☆

ایک ہفتہ آئی سی یو میں زندگی کی جنگ لڑ کر، وہ اب اپنے کمرے میں لیٹی خالی نظروں سے، چھت کو اور کبھی اپنے ویران پہلو کو تک رہی تھی۔ جسے آباد کرنے کے خواب کتنی ہی راتیں وہ جاگ کر گزار چکی تھی۔

اسے لگا تھا کہ ابھی، خالہ ساجدہ کمرے میں داخل ہوں گی تو وہ سب سے پہلے اپنے برے رویے کی معافی مانگے گی۔ وہ انھیں صاف بتا دے گی کہ اسے بخوبی سمجھ آ گیا ہے کہ سزا کا اختیار، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بعض معاملات صرف اللہ کے سپرد کرنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ جنہیں انسان اپنے اختیار میں لیتا ہے تو دل میں، سدا باقی رہ جانے والی خلش اور ہاتھ میں خساروں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- عالیہ خان
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

اک ذرا سا احساس

غزالہ عزیز

تھکن تو جیسے ان کے روم روم میں اتر گئی تھی۔
اتنے دنوں کی بھاگ دوڑ، بازاروں کے چکرا اور شادی کی تیاریوں نے جیسے ان کے وجود کی ساری توانائی نچوڑ دی تھی۔ ایک بھی نہیں دو شادیاں، انہیں بیٹے اور بیٹی کے فرض سے بیک وقت سبک دوش ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ زندگی کا ایک بہت بڑا فریضہ اللہ کے کرم سے بخیر و عافیت سرانجام پایا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ دونوں کی سسرال بھی قسمت